ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مُرتّب

سعید احمد اکبرآبادی

ندوۃ المصنفین دہلی کی مذہبی اور تاریخی مطبوعات

ذیل میں ندوۃ المصنفین دہلی کی چند اہم دینی، اصلاحی اور تاریخی کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے۔ مفصل فہرست جس میں آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل بھی معلوم ہوگی دفتر سے طلب فرمائیے۔

اسلام میں غلامی کی حقیقت جدید ایڈیشن جس میں نظر ثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں قیمت ہے، مجلد للعہ

سلسلہ تاریخ ملت مختصر وقت میں تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والوں کیلئے یہ سلسلہ نہایت مفید ہے۔ اسلامی تاریخ کے یہ حصے مستند و معتبر بھی ہیں اور جامع بھی۔ انداز بیان نکھرا ہوا اور شگفتہ

نبی عربی صلعم (تاریخ ملت کا حصہ اول) جس میں سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے نہایت آسان اور دل نشین انداز میں یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت ۸ر مجلد ۱۲ر

خلافت راشدہ (تاریخ ملت کا دوسرا حصہ) عہد خلفائے راشدین کے حالات و واقعات کا دل پذیر بیان۔ قیمت ہے مجلد ۱۲ر

خلافت بنی امیہ (تاریخ ملت کا تیسرا حصہ) قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ مجلد تین روپے بارہ آنے

خلافت ہسپانیہ (تاریخ ملت کا چوتھا حصہ) قیمت دو روپے۔ مجلد دو روپے چار آنے

خلافت عباسیہ (جلد اول) (تاریخ ملت کا پانچواں حصہ)، قیمت ہے مجلد للعہ

خلافت عباسیہ (جلد دوم) (تاریخ ملت کا چھٹا حصہ)۔ قیمت للعہ، مجلد صہ

تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ (تاریخ ملت کا ساتواں حصہ) مصر اور سلاطین مصر کی مکمل تاریخ صفحات ۳۰۰ قیمت تین روپے چار آنے۔ مجلد تین روپے آٹھ آنے

خلافت عثمانیہ تاریخ ملت کا آٹھواں حصہ مجلد ہے

فہم قرآن جدید ایڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے۔ قیمت عہ مجلد ہے

غلامان اسلام اسّی سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان۔ جدید ایڈیشن قیمت صہ مجلد ہے

اخلاق و فلسفہ اخلاق علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب۔ جدید ایڈیشن جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے ہیں۔ اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دل نشین اور سہل کیا گیا ہے۔ قیمت ہے، مجلد معہ

قصص القرآن جلد اول تیسرا ایڈیشن۔ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت موسیٰ و ہارون کے حالات و واقعات تک۔ قیمت ہے، مجلد سعہ

قصص القرآن جلد دوم حضرت یوشع علیہ السلام سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے حالات تک تیسرا ایڈیشن قیمت ہے مجلد للعہ

قصص القرآن جلد سوم انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصصِ قرآنی کا بیان قیمت ہے مجلد ہے

برہان

جلد بست ونہم　　　شمارہ نمبر ۱

جولائی ۱۹۵۲ء مطابق شوال المکرم ۱۳۷۱ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

آپ نے سنا ہوگا جنگ کی نئی قسموں میں حال ہی کی ایک قسم ہے جراثیمی جنگ۔ اس میں ایک فریق سائنس کے جدید آلات کے ذریعہ مہلک وباؤں کے جراثیم مخالف ملک کی فضا میں اس طرح منتشر کر دیتا ہے کہ سارا ملک وبائی جراثیم کی لپیٹ میں آجاتا ہے اور لوگ مرنے شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس نوع کی جنگ کے متعلق آج دنیا کے تمام مہذب انسانوں کی خواہ کسی ملک کسی رنگ و نسل اور کسی مذہب و ملت کے ہوں کیا رائے ہے؟ یہی کہ یہ انتہائی درندگی اور غیر انسانی حرکت ہے اور اس کو بین الاقوامی قانونِ جنگ کے ذریعہ ممنوع قرار دینا چاہیے۔ بس اگر مہلک جراثیم کو فضا میں منتشر کر کے کسی دشمن ملک کے باشندوں کا ہلاک کر دینا جرم اور نہایت سنگین جرم ہے تو پھر آپ کیا فرمائیں گے ان مخربِ اخلاق اور فحش رسالوں، میگزینوں اور عریاں کتابوں کی نسبت جو کسی دشمن ملک کے نہیں بلکہ خود اپنے ہی ملک کے لڑکوں اور لڑکیوں کی پوری نسل کو جسمانی طور پر نہیں بلکہ معنوی اور اخلاقی حیثیت سے قتل کر دینے کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں اور جو فواحش و عریانیات کی اشاعت عام کر کے نئی نسلوں کو اس بری طرح تباہ و برباد کر رہے ہیں کہ اخلاقی ضبط و انضباط، شرم و حیا اچھائی اور نیکی کی طرف رغبت و میلان اور بدی سے نفرت و فرار یہ تمام اوصاف جو ایک سوسائٹی کو تندرست و توانا اور مہذب و شائستہ بناتے ہیں فنا ہوتے جا رہے ہیں کوئی بتائے کہ یہ سب کچھ ادب فن اور زبان کی خدمت ہے یا ایک نہایت خطرناک قسم کی نسل کشی اور انسانیت سوزی؟ اگر یہ نسل کشی ہے اور یقیناً ہے تو پھر سب سے زیادہ لائقِ ماتم کس کی بدنصیبی ہے؟ اس کی جو ان جراثیم کو پیدا کر رہا ہے یا اس کی جو ان جراثیم کا گاہک اور خریدار بن کر انھیں اپنی اولاد اور بہو بیٹیوں میں تقسیم کر رہا ہے اور اس طرح زہر خود بھی پی رہا ہے اور اپنے متعلقین کو بھی اس کا جام پیش کر رہا ہے۔

خدا بخشے غالب نے کس قدر کھری اور سچی بات کہی تھی۔

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں ‏ ‏ ‏ پابستگیٔ رسمِ رہِ عام بہت ہے

ہماری سوسائٹی اور ہمارے سماج کا تقریباً یہی حال ہے، ایک چوری کرنے والا۔ ڈاکہ مارنے والا کسی کو فریب دے کر اس کا روپیہ ہضم کرنے والا مجرم اور سزا کا مستحق، ایک قاتل دار کا سزاوار، حکومت کا باغی گردن زدنی اور موت کی سزا کا حقدار لیکن ایک وہ شخص جو چند سکہ ہائے زر وسیم کی خاطر عیش و آرام کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرنے کی غرض سے سینکڑوں، ہزاروں نوجوانوں کی زندگی برباد کر رہا ہے خاندانوں کو اجاڑ رہا ہے اور فتنہ و فساد کی تخم ریزی کر کے آئندہ نسلوں کو ناکارہ و فاسد بنا رہا ہے اس سے نہ صرف یہ کہ کوئی تعرض نہیں کیا جاتا بلکہ اور الٹا اس کے سامان و متاعِ فاسد کا خریدار بن کر اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ ذرا تغافل و بے حسی کا پردہ ہٹا کر کبھی سوچئے کہ آج آپ کے کتنے بچوں اور بچیوں کو کلمہ یاد ہے، قرآن مجید کی کتنی آیتیں اور سورتیں انھیں محفوظ ہیں اقبالؔ اور حالیؔ کے کتنے اشعار وہ گنگناتے ہیں مختلف اوقات کی کتنی دعائیں انھیں معلوم ہیں، اسلام کے کتنے اولیاء اور بزرگوں کے نام سے وہ واقف ہیں اس کے برعکس کتنے فلمی گانے ہیں جنہیں وہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے گنگناتے رہتے ہیں! کتنے فلم ایکٹر اور ایکٹریسیں ہیں جن کے نام اور کام کے علاوہ وہ انکے حالاتِ زندگی سے باخبر ہیں اور آپس میں ان کا تذکرہ دلچسپی اور شوق کے ساتھ کرتے ہیں فلموں کے کتنے ایکٹ ہیں جن کی نقل وہ خود اپنے گھروں کے صحن میں کرتے ہیں؟

کچھ زیادہ دنوں کی بات نہیں ابھی چند سال پہلے تک کی بات ہے کہ ایک طالب علم کی نشانی یہ تھی کہ اس کی بغل میں کتاب ہو یا کوئی کاپی اور نوٹ بک ہو لیکن آج اسکول کے لڑکوں اور کالج کے طالب علموں کی پہچان یہ ہے کہ اس کے پاس ایک کیمرہ اور تصویروں کا ایک البم ہو۔ اس البم میں کیا ہوتا ہے؟ خود اس کی مختلف وضع و شکل اور مختلف حالتوں کی تصویریں اس کے دوستوں کی تصویریں خود اس کی ماں بہنوں بھابیوں۔ چچیوں اور ممانیوں کی تصویریں، دوستوں کی بہنوں اور دوسری رشتہ دار لڑکیوں کی تصویریں فلم ایکٹروں اور فلم ایکٹرسوں کی عریاں اور نیم برہنہ تصویریں پھر اسی پر بس نہیں! کیمرہ کے ذریعہ وہ اپنی حقیقی اور پھوپی زاد اور چچا زاد اور ماموں زاد بہنوں کا فوٹو لیتا ہے تو ان لڑکیوں کے دل میں خود بھی جذبہ

پیدا ہوتا ہے اور ان کا مصور بھائی خود بھی انھیں ہدایت دیتا ہے کہ فلاں رسالہ میں جس طرح فلاں فلم ایکٹرس بیٹھی مسکرا رہی ہے۔ اس کے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں آنکھوں میں شوخی اور چہرہ پر دلکشی جھلک رہی ہے بازو اور سینہ کا افقی حصہ کھلا ہوا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اور اسی پوز میں یہ بھی بیٹھیں اب یہ فوٹو البم کی زینت بنتے ہیں اور پھر جب سب دوست ایک ساتھ بیٹھتے ہیں تو ایک دوسرے کا البم دیکھتا ہے اور اس طرح ایک کی ماں اور بہنیں دوسرے کے سامنے بے نقاب و بے حجاب ہو کر سامنے آجاتی ہیں یہ بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی بلکہ اس کے دور رس اثرات کہاں تک پہنچتے ہیں آپ خود ان کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

یہ سب کچھ کہاں ہو رہا ہے؟ آپ کے سامنے اور آپ کے گھروں میں جہاں پردہ کا اہتمام ہے۔ اور جہاں تھوڑا بہت دین کا بھی چرچا ہے، جہاں اسلامی تہذیب اور مشرقی شرافت و اخلاق کے کچھ کچھ نشانات اب بھی باقی ہیں جہاں رمضان کے روزے بھی رکھے جاتے ہیں اور نمازیں بھی پڑھی جاتی ہیں، اب سوال یہ ہے کہ کیا آپ نے ان سب باتوں کو اپنی خوشی سے قبول کیا ہے؟ اگر واقعی ایسا ہے تو یہ زمانہ آزادی کا ہے ہر شخص کو اختیار ہے جو چاہے کرے لیکن کل جب آپ کا لڑکا امتحان میں فیل ہوجاتا ہے اور پڑھنے میں جی نہیں لگاتا اور آپ کی لڑکی جوان ہوجاتی ہے اور اسے کوئی بر نہیں ملتا تو پھر آپ زمانہ کی یا قدرت کی شکایت کیوں کرتے ہیں اور ستم روزگار کا گلہ آپ کو کیوں ہوتا ہے، قرآن مجید نے تو پہلے ہی اعلان کردیا تھا، کہ

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا!

"مسئلہ امامت اور علّامہ شہرستانی"

از

مولانا حکیم عبدالباقی شطاری مولوی فاضل، منشی فاضل

لکچرر شعبۂ طب نظامیہ کالج حیدرآباد دکن

علم کلام کی تعریف علامہ عضدالدین نے المواقف میں علم کلام کی تعریف یہ بیان کی ہے کہ "الکلام علم یقتدر معہ اثبات عقائد الدینیۃ بایراد الحجج ودفع الشبہۃ" یعنی علم کلام اس علم کو کہتے ہیں جس کی بدولت دینی عقائد کو دلائل سے ثابت کرنے اور شبہات کو رفع کرنے کی قدرت حاصل ہوتی ہے۔ [عہ]

علامہ تفتازانی نے علم کلام کی یہ تعریف کی ہے کہ "الکلام ھو العلم بالعقائد الدینیۃ عن الادلۃ الیقینیۃ" یعنی دینی عقائد کو یقینی دلائل سے جاننے کا نام علم کلام ہے۔ [عہ]

علم کلام کی تدوین

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابۂ کرامؓ کے دور میں علم کلام کی تدوین نہیں ہوئی جس کے متعلق علامہ تفتازانی نے حسب ذیل وجوہ بیان کئے ہیں۔

(۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت۔

(۲) آپ کے زمانہ کا قرب۔

(۳) آپ سے خبروں کا سننا اور آثار کا مشاہدہ

(۴) وقائع اور اختلافات کی کمی۔

(۵) آسانی سے ثقات کی طرف رجوع کرنا۔

عہ شرح المواقف صہ ۳۲ عہ شرح مقاصد جلد اول صہ ۵

علامہ تفتازانی کہتے ہیں کہ ان وجوہ سے وہ لوگ احکام کی تدوین، ابواب و فصول کی ترتیب اور اصولی و فروعی مسائل کی تکثیر سے بے نیاز تھے۔ مگر جب مختلف وجوہ سے جن کی تفصیل یہاں بے محل ہے۔ اختلاف آراء کا ظہور ہوا اور بدعات واہواء (یعنی بد اعتقادی) کی طرف میل ہوا۔ فتاوی اور واقعات کی کثرت ہو گئی۔ زیادہ غور و فکر اور اس طرف توجہ کی ضرورت پڑی تو ارباب نظر و استدلال نے استنباط احکام کی طرف توجہ کی اور عقائد اسلام کی تحقیق میں اپنی کوششیں صرف کیں اور اس کے اصول و قوانین کی تمہید کی طرف متوجہ ہوتے اور اس (یعنی علم کلام) کے دلائل اور حجتوں کی تلخیص کی اور (اعتقادی) مسائل کو ان کے دلائل کے ساتھ مدون کیا اور شبہات کو جوابات کے ساتھ لکھا ان کے علم کا نام فقہ رکھا اور اعتقادات کا نام خاص طور سے فقہ اکبر رکھا گیا اکثر لوگوں نے عبادات کے علم کو فقہ اور اعتقادیات کے علم کو علم توحید و صفات لکھا ہے (شرح مقاصد)

الحاصل یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے لوگوں کے دلوں میں ایمان اتنا راسخ ہو جاتا تھا کہ اعتقادی مسائل میں عموماً کوئی شک و شبہ پیدا ہی نہ ہوتا تھا مگر بعد والے تو اس نعمت عظمیٰ سے محروم تھے۔ نیز اشاعت اسلام کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ان عجمی نو مسلم دماغوں سے ان کے سابقہ روایات اور عقائد کا نقش ابھی پوری طرح مٹنے نہ پایا تھا پھر دنیائے اسلام کے جلد جلد ہونے والے سیاسی انقلابات کا بھی ان ذہنیتوں پر خاص اثر پڑا اور ارباب نظر و فکر کے لئے نئے نئے مسائل پیدا ہو گئے جس کا لازمی نتیجہ افتراق امت ہوا۔ اور اسلام میں نئے نئے فرقے پیدا ہونے لگے۔ مگر یہ سب کلمہ گو اور اہل قبلہ تھے یعنی باوجود اختلاف عقائد حسب ذیل امور ان سب میں متفقہ طور پر مسلمہ تھے۔

(۱) اللہ ایک اور وہی مستحق عبادت ہے۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں۔

(۳) قرآن مجید خدا کی کتاب ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔

(۴) کعبہ مسلمانوں کا قبلہ ہے۔

(۵) نماز۔ زکوٰۃ۔ روزہ۔ حج یہ سب فرض ہیں۔

اس لئے ہر فرقہ اپنے عقائد کو قرآن و حدیث سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا اور اپنی تاویل و تفسیر کی تائید میں ایسے دلائل بھی پیش کرتا جن کو عقلی دلائل کی بجائے عقل عام (common sense) کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ بس یہی قدیم علم کلام ہے۔

(۱) کیا درحقیقت قرآن حکیم کے الفاظ اس قدر مجمل و مبہم ہیں کہ ان سے ہر ہر فرقہ بغیر کسی تکلف اور تحریف معنوی کے یکساں فائدہ اٹھاتا اور اپنی تائید و توثیق کے ساتھ ساتھ انھیں الفاظ سے اپنے مخالفین کی تکفیر و تفسیق بھی کرتا ہے۔

(۲) پھر اسی کتاب کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا یعنی اس کی بدولت باہمی اختلافات دور ہو گئے اور سب مسلمان دینی بھائی بن گئے اور اس نے ساری دنیا کی اصلاح معاش و معاد کے لئے صالحین کی ایک جماعت تیار کی۔

(۳) کیا خیر امت سے مراد انھیں فرقوں کا مجموعہ ہے جو ایک دوسرے سے دست و گریباں اور ایک دوسرے کے خلاف نہ صرف قلم و زبان سے نبرد آزما بلکہ موقع مل جائے تو جدال و قتال سے بھی نہیں چوکتے۔؟

(۴) کیا یہی وہ بہترین جماعت ہے جو ساری دنیا میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے پیدا کی گئی ہے؟

(۵) نیز جب سب کے استدلال کا دار و مدار ایک ہی کتاب پر ہو تو صداقت کا معیار کیا ہے اور حق و باطل کی تمیز کس کسوٹی پر ہوگی؟

یہ اور اسی قسم کے دوسرے سوالات کے جواب میں ان میں سے ایک اور صرف ایک ہی فرقہ آگے بڑھتا اور نہایت متانت و سنجیدگی سے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ کتاب کا قصور نہیں بلکہ ذہنیتوں کا قصور اور دلوں کا کھوٹ ہے۔ اس لئے حق و باطل کے معیار کو ان ذہنیتوں کے عجائب خانہ میں تلاش کرنے کی بجائے واقعات پر نظر ڈالیں تو صاف ظاہر ہے کہ حق وہی ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

اور صحابہ کرام قایم تھے۔ کیونکہ یہی قرآن کے اولین مخاطب ہیں۔ یہ فرقہ اپنی تائید میں ایک حدیث بھی پیش کرتا ہے جس کا مطالب یہ ہے کہ "میرے بعد میری امت بہتر فرقوں میں منقسم ہو جائے گی جن میں سے ایک ناجی اور باقی سب ناری ہیں ــ" ناجی وہی فرقہ ہے جو میری اور میرے اصحاب کی پیروی کرے گا اس لئے یہ فرقہ اپنے آپ کو سنت جماعت اور دوسرے فرقوں کو اہل اہوا اور مبتدعین کہتا ہے۔

یہ اپنے علم کلام کو کلام محمود اور دوسرے فرقوں کے علم کلام کو کلام مذموم کہتا ہے۔

اس فرقہ کے بھی دو مکتبہ خیال ہیں۔ اشاعرہ اور ماتریدیہ ان دونوں میں باہم کچھ جزی اختلافات ہیں مگر ان کی بنا پر یہ ایک دوسرے کی تکفیر یا تفسیق نہیں کرتے امام ابوالحسن اشعریؒ کے پیرو اشاعرہ اور امام ابومنصور ماتریدیؒ کے پیرو ماتریدیہ کہلاتے ہیں۔

امام ابوالحسنؒ مسائل فقہیہ میں امام شافعیؒ کے مقلد اور امام ابومنصورؒ امام ابوحنیفہؒ کے مقلد تھے جب سنت جماعت کہتے ہیں تو اس سے مراد یہی دونوں اشاعرہ اور ماتریدیہ ہوتے ہیں۔ مطلق علم کلام سے عموماً اہل سنت ہی کا علم کلام مراد لیا جاتا ہے۔

اہل سنت نے اپنے عقاید کے اثبات اور مخالفین کی تردید کے لئے جس علم کلام کی تدوین کی اس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ علم کلام ہے جس میں اہل اہوا اور مبتدعین کی تردید کی جاتی ہے دوسرا وہ علم کلام ہے جس کی تجدید فلسفہ یونان کے مقابلہ میں ہوئی یہ گویا جدید علم کلام ہے جس کی ابتدا امام غزالیؒ نے کی اور جس کو امام رازیؒ نے معراج کمال پر پہنچا دیا۔ یہ علم کلام گویا اسلامی فلسفہ مشائیہ ہے جس میں حسب ذیل چھ اصولی عنوانات سے بحث ہوتی ہے۔

(۱) مبادیات

(۲) امور عامہ

(۳) اعراض

(۴) جواہر

(۵) الٰہیات

(۹) سمعیات یعنی وہ مسائل جن کے دلائل صرف سمعی ہوتے ہیں کلام کا یہ حصہ عقلیات کا مسد مقابل ہے۔

پھر سمعیات کے تحت حسب ذیل چار اصولی مباحث ہیں۔

(۱) مباحث النبوۃ

(۲) مباحث المعاد

(۳) مباحث الاسماء والاحکام اور ان کے متعلقات

(۴) مباحث امامت

امامت کی تعریف علامہ تفتازانی نے یہ کی ہے کہ الامامۃ ریاسۃ عامۃ فی امر الدین والدنیا خلافۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی امامت دنیوی اور دینی امور کی عام ریاست کا نام ہے اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت ہے۔

علم کلام سے امامت کی بحث کے تعلق کی نسبت لکھتے ہیں اگرچہ یہ ایک فرعی مسئلہ اور ایسا امر ہے جو فرعی احکام میں داخل ہے مگر اس کے متعلق اہل بدعت میں چونکہ ایسے فاسد عقیدے پھیل گئے ہیں جو بہت سے دینی قواعد کے مخل ہیں اس لئے امامت کے مباحث کو بھی علم کلام میں شریک کر لیا گیا[1]۔

امامت سے متعلق اہل سنت کے علم کلام میں حسب ذیل مباحث ہیں۔

(۱) نصب الامام

(۲) تکلیف۔ حریت۔ ذکوٰۃ / مرد ہونا (یعنی اوصاف امام)

(۳) طریق ثبوت

(۴) جمہور اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کی صراحت نہیں فرمائی۔

---

[1] شرح مقاصد جلد دوم صا۲۷

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ امام ہوئے۔

(۶) اہل سنت کے یہاں مدارجِ فضیلت بھی بہ لحاظِ ترتیب خلافت ہیں۔

ان میں سے پہلی بحث نصب الامام کے متعلق علامہ تفتازانی کہتے ہیں کہ خاص صفات کے امام کا نصب فرض کفایہ ہے اور کتب فقہ میں بھی مذکور ہے کہ امت کے لئے ایسا امام ضروری ہے جو دین کا احیاء اور سنت کو قایم کرے۔ مظلوموں کے انصاف اور مستحقین کے حقوق کی حفاظت کرے

دوسری شرط یعنی اوصاف امام کے متعلق کہتے ہیں کہ امام کے لئے حسب ذیل صفات ضروری ہیں

(۱) وہ مکلف ہو (یعنی عاقل و بالغ ہو)

(۲) مسلمان ہو

(۳) عادل ہو

(۴) آزاد ہو

(۵) مرد ہو

(۶) مجتہد ہو

(۷) بہادر ہو

(۸) صاحب رائے و کفایت ہو۔

(۹) سمیع ہو۔ (یعنی بہرا نہ ہو)

(۱۰) بینا ہو۔ (یعنی اندھا نہ ہو)

(۱۱) گویا ہو (یعنی گونگا نہ ہو)

(۱۲) قریشی ہو۔ اگر ایسا قریشی نہ مل سکے جس میں یہ سب صفتیں جمع ہوں تو کسی کنانی کو (جو ان صفات کا جامع ہو) والی بنا دیا جائے اگر ایسا کنانی بھی نہ مل سکے تو اولادِ اسمٰعیل میں سے کسی ایسے شخص کو والی بنایا جائے جو ان صفات کا جامع ہو۔ اگر بنی اسمٰعیل سے بھی کوئی ایسا شخص نہ مل سکے تو کسی عجمی شخص کو (جو ان صفات کا جامع ہو) والی بنایا جائے۔ امام کا ہاشمی یا معصوم ہونا یا اس کا ان لوگوں سے جن کا وہ والی بنایا

جا رہا ہے افضل ہونا اہل سنت کے پاس، مشروط نہیں ہے۔

مسئلہ امامت ان اختلافی مسائل میں سے ہے جس پر تلوار اور قلم دونوں نے اپنی پوری قوت صرف کی۔ علامہ شہرستانی لکھتے ہیں کہ

"واعظم الخلاف بین الامة خلاف الامامة اذ ما سل سیف فی الاسلام علی قاعدة دینیة مثل ما سل علی الامامة" یعنی اس امت کے اختلافی مسائل میں امامت کا مسئلہ بہت بڑا مسئلہ ہے کیونکہ کسی دینی قاعدہ پر اتنا کشت وخون نہیں ہوا۔ جتنا کشت وخون ہر دور میں امامت کے لئے ہوا۔

تلوار کے جوہر اور کارنامے مٹ گئے صرف ان کا تذکرہ تاریخ کے صفحات پر رہ گیا۔ مگر قلم کے جوہر آج تک کاغذ کے صفحات پر اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں۔ اور اس مسئلہ سے متعلق علم کلام قدیم اور جدید دونوں دوروں میں جو کچھ ہے ان کا ملخص اور اس مسئلہ کے متعلق اہل سنت اور ان کے مخالفین دونوں کے خیالات اور مباحث کو جس متانت اور سنجیدگی کے ساتھ نہایت جامع اور مختصر الفاظ میں علامہ شہرستانی المتوفی ۵۴۸ھ نے اپنی کتاب "نہایة الاقدام فی العلم الکلام" میں لکھا ہے وہ میری محدود نظر میں اپنی آپ نظیر ہے اصل کتاب یورپ میں انگریزی ترجمہ کے ساتھ چھپی ہے۔

اسی بحث کا یہ اردو ترجمہ ایک مختصر سے مقدمہ کے ساتھ پیش ہے کیونکہ اس زمانہ میں "مملکت اسلامی" کا مسئلہ ارباب غور وفکر کا موضوع بحث ہے اور قدرتاً یہ سوالات پیدا ہو رہے ہیں کہ

(۱) اسلامی مملکت کس کو کہتے ہیں آیا وہ جمہوری حکومت ہے یا آمری یا عمومی؟

(۲) اس مسئلہ کا شریعت سے کیا تعلق ہے؟

(۳) صدر حکومت یا امام کن اوصاف سے موصوف ہونا چاہیے؟

(۴) صدر حکومت یا خلیفہ اور امام کے اختیارات وفرائض کیا ہیں؟

(۵) حق رائے دہی اور انتخاب کس کس کو حاصل ہے وغیرہ وغیرہ؟

عہ شرح المقاصد جلد دوم ص ۲۷۱ عہ الملل والنحل للشہرستانی جلد اول ص ۲۵ برحاشیہ الملل والنحل لابن الحزم

یہی وہی قدیم بحث پھر تازہ ہوگئی ہے ایسی حالت میں جو لوگ اردو زبان میں قدیم مباحث کو ملخصاً جاننا اور اس کے متعلقہ موجودہ سوالات کی حل میں افکار قدیمہ کے نتائج سے مدد لینا چاہیں محض ان کی سہولت اور آسانی کے لئے یہ ترجمہ پیش ہے۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت و الیہ

اِمامت کا بیان

امامت ان اصول اعتقاد میں نہیں ہے کہ جس میں فکر کسی قطعی اور یقینی امر کا تعین کرسکے لیکن جو شخص اس میں خطا کرتا ہے وہ بہ نسبت اس شخص کے جو امامت کی اصل سے ناواقف ہے زیادہ خطرہ میں ہے اور گمراہ کن خواہشات نے اس کو غلط راستہ پر ڈال دیا ہے جس کی وجہ سے اس میں انصاف نہیں ہو سکتا۔

تمام محدثین و فقہاء اشعری اور شیعہ و معتزلہ کی ایک جماعت اور اکثر خوارج امامت کے وجوب اور خدا کی طرف سے فرض ہونے کے قائل ہیں۔ اہل سنت کی ایک جماعت کا قول ہے کہ امام کا مقرر کرنا اور جو امام مقرر ہو اس کی اطاعت مسلمانوں پر فرض و واجب ہے۔ کیونکہ سب کے لئے ایک امام ضروری ہے جو ان پر احکام نافذ اور حدود قائم کرے ان کے ملک کی حفاظت اور اطراف و جوانب کی نگرانی کرے، افواج کو ترتیب دے غنیمتوں اور صدقات کو تقسیم کرے تاکہ فصلِ خصومات میں وہ اس کی طرف رجوع کریں اور وہ ان کے امور اجتماعی اور عیدوں کی رعایت کرے مظلوم کی دادرسی کرے اور ظالم کو سزا دے ہر جگہ قاضیوں اور داعیوں کو مقرر کرے اور معلمین و مبلغین کو چوطرف بھیجے۔ علم معرفت و ہدایت عقلمندوں کو تو اپنی روشن و صائب فکر سے حاصل ہے مگر جو حق و راہ راست سے ہٹ جائے تو امام کا فرض ہے کہ بہ لحاظ خطا اس کی تنبیہ کرے اور اس کو راہ راست پر لائے اگر وہ باز آجائے تو بہتر ورنہ اس سے جنگ کرے اور زمین کو بدعت و گمراہی سے بہ زور شمشیر پاک کردے جو (یعنی تلوار) خدا کے جلال کا مظہر اور اس کے سزا کی آگ کا شعلہ اس کے عتاب کی گھاٹی۔ اور اس کے عذاب کا کوڑا ہے۔ امامت

کے شرعی طور پر سمعاً واجب ہونے پر روشن دلیل پوری امت کا صدر اول سے ہمارے زمانہ تک اس امر پر اتفاق ہے کہ زمین کا امام سے خالی رہنا ناجائز ہے۔

صدر اول میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیعت سے پہلے اپنے خطبہ میں فرمایا تھا کہ لوگو جو محمدؐ کی بندگی کرتا تھا (اس کو معلوم ہو جائے کہ) بے شک محمدؐ کا انتقال ہو گیا ہے اور جو خدا کی بندگی کرتا تھا (وہ یقین رکھے کہ) خدا زندہ ہے اور وہ کبھی نہیں مرے گا۔ اور آپ نے یہ آیت پڑھی وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ الایہ۔ اور نہیں ہیں محمدؐ مگر رسول گذر چکے پھر آپ نے فرمایا کہ محمدؐ نے تو اپنی راہ اختیار کی مگر اس امر (امامت) کے لئے آپ کے قائم مقام کی ضرورت ہے لہذا تم لوگ غور و خوض کے بعد اپنی آرا پیش کرو خدا تم پر رحم کرے اس پر ہر طرف سے لوگوں نے آپ کو پکار کر یہی کہا کہ اے ابو بکرؓ آپ نے بجا ارشاد فرمایا مگر ہم اس امر میں غور کر کے اپنا انتخاب پیش کرتے ہیں اور کسی نے یہ نہ کہا کہ یہ کام بغیر کسی امام کے چل سکتا ہے پھر انصار نے سعدؓ بن عبادہ کا انتخاب کیا اور کہا کہ ہم میں سے ایک امیر اور تم (یعنی مہاجرین) میں سے ایک امیر۔

حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما مہاجرین کی ایک جماعت کے ساتھ ثقیفہ بنی ساعدہؓ کی طرف تشریف لے گئے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں راستہ بھر ایک تقریر سوچتا رہا یہاں تک کہ ہم ثقیفہ بنی ساعدہ پہنچ گئے میرا خیال ہوا کہ میں وہ تقریر کر دوں مگر حضرت ابو بکرؓ نے مجھے منع فرمایا اور خود کھڑے ہوئے اور آپ نے وہ سب کچھ بیان کیا جو میں نے سوچ رکھا تھا مگر آپ کے بیان میں نرمی تھی اور میرا بیان تلخ ہوتا۔ میں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور دوسرے لوگوں نے بھی آپ سے بیعت کی جس کا قصہ مشہور ہے جب حضرت ابو بکرؓ کی وفات قریب ہوئی تو آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ اس امر میں مشورہ کرو پھر آپ نے حضرت عمرؓ کے اوصاف بیان فرما کر ان کو اپنا ولی عہد بنایا۔ اور انھیں خلافت ملی مگر حضرت عمرؓ یا کسی اور کے دل میں بھی یہ خطرہ نہیں گذرا کہ زمین کا امام سے خالی رہنا جائز ہے اور جب حضرت عمرؓ کی وفات کا وقت آیا تو آپ نے خلافت کے لئے چھ ارکان کی مجلس شوریٰ مقرر فرمائی اور حضرت عثمانؓ کی خلافت پر سب کا اتفاق ہوا پھر اس کے بعد حضرت علیؓ کی خلافت پر اتفاق ہوا

یہ سب چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ صحابہ یعنی صدر اول کو ضرورت امام پر اتفاق تھا اور ان میں سے کسی ایک شخص کو بھی اختلاف نہ تھا۔

ایک امام کی موت کے بعد دوسرے امام کے قایم ہونے تک صحابہ کا بالاجماع احکام میں توقف کرنا بھی اسی پر دلالت کرتا ہے اور اس زمانہ سے ہمارے زمانہ تک ہر زمانہ میں امامت پہلے طریقہ پر یا تو اجماع امت سے یا عہد و وصیت سے یا دونوں طریقوں پر چلی آرہی ہے۔ لہذا اس طرح کا اجماع امامت کے واجب ہونے پر دلیل قطعی ہے ہمارا یہ کلام مطلقاً وجوب امامت کے متعلق ہے۔

مگر تقرر و تعین امامت کی نسبت کہ آیا وہ نص سے ثابت ہے یا اجماع سے؟ اس کے قائلین میں اختلاف ہے کہ نص کسی خاص شخص کی ذات کے بارے میں وارد ہوئی ہے یا اس کی صفات مذکور ہیں جو لوگ اجماع کے قائل ہیں ان میں یہ اختلاف ہے کہ اجماع امت بلا اختلاف احدے ثبوت امامت کے لئے شرط ہے یا ارباب حل وعقد کی ایک جماعت کا متفق ہو جانا ہی کافی ہے ان کے مذاہب کو میں نے اپنی دوسری کتابوں میں بیان کیا ہے۔

اہل سنت جو اجماع کے قائل ہیں کسی خاص امام کے لئے نص نہ ہونے کی یہ دلیل بیان کرتے ہیں کہ اگر کسی خاص امام کے لئے نص وارد ہوتی تو ساری امت اس کی اطاعت پر مکلف ہوتی اور اس امام کی شخصیت معلوم کرنے کے لئے دلائل عقلی کارآمد نہ ہو سکتے بلکہ خبر کی ضرورت پڑتی اور یہ خبر اگر متواتر ہوتی تو ہر مکلف اس امام کی اطاعت کا واجب ہونا اپنے آپ معلوم کر لیتا ورنہ اس کی ذمہ داری اس پر اسی طرح عائد ہوتی جیسے پنج وقتہ نمازوں کی ذمہ داری عائد ہے پھر تو سلف اس امام کو چھوڑ کر کسی دوسرے سے نہ تو بیعت کرتے اور نہ کسی غیر کے لئے ان کا اجماع ہوتا۔

اور یہ تو عادتاً محال ہے کہ ایک جم غفیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی بات کو سنے اور پھر اس کو عین ضرورت کے وقت روایت نہ کرے حالانکہ امت کی اس سے مخالفت، نافرمانی اور ضرورت خاص طور پر اس روایت کے نقل کی مقتضی تھی حالانکہ وہ اسلام کے اولین اور تازہ دور میں تھے ان کی صاف باطنی ان کے عقاید کا بغض و کینہ سے پاک ہونا اور ان کی وہ باہمی الفت جو کتاب عزیز میں اس

طرح مذکور ہے کہ "وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا" ایسے دواعی نقل کے موجود اور موانع ناپید تھے پھر بھی ایسی کوئی روایت نہیں بیان کی گئی تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس بارے میں سرے سے کوئی نص وارد ہی نہیں ہے۔ نیز اگر کوئی شخص امامت کے لئے متعین کر دیا گیا ہوتا تو اس شخص معین کا بھی تو فرض تھا کہ وہ امامت کا دعویٰ کرتا اور امامت کے لئے پوری جد و جہد اور اپنے حق کی حفاظت کے لئے مدافعت کرتا اور تاوقتیکہ ظالم پر اس کو غلبہ نہ ہو جائے وہ اپنے گھر میں چپ چاپ نہ بیٹھ رہتا، مگر کوئی ایسی روایت منقول نہیں کہ کسی نے امامت کے لئے جد و جہد کی یا اپنی نسبت کسی ایسی نص کا دعویٰ ہی کیا۔ خوارج میں سے نجدات اور قدریہ کی ایک جماعت جیسے ابو بکر اصم اور ہشام فوطی اس بات کے قائل ہیں کہ امامت شریعت کا ایسا واجب نہیں ہے کہ اگر امت اس سے باز رہے تو وہ عذاب یا ملامت کی مستحق ہو بلکہ وہ لوگوں کے معاملات پر موقوف ہے لہٰذا اگر وہ باہمی عدل و انصاف کریں اور تقویٰ اور نیکی میں ایک دوسرے کی امداد و اعانت کریں اور ہر مکلف اپنے فرائض کی ادائیگی میں مشغول ہو جائے تو انھیں کسی امام اور اس کی اتباع کی ضرورت نہیں کیونکہ تمام مجتہدین اسلام۔ علم و اجتہاد میں کنگھی کے دندانوں کی طرح ایک دوسرے کے مماثل و مساوی ہیں۔ اور عوام کی حالت اونٹوں کی سی ہے کہ سَو میں ایک بھی قابل سواری نہیں ملتا تو پھر کسی پر اپنے ہی جیسے شخص کی اطاعت کیونکر واجب ہو سکتی ہے اس پر ان کی اور ایک تقریر بھی ہے کہ امت کے کسی شخص کی اطاعت یا تو رسول کے حکم صریح سے ثابت ہو گی اور تم یہ تو مان چکے ہو کہ کسی کی نسبت بھی ایسا صریح حکم نہیں ہے یا یہ امر مجتہدین کا اختیار کردہ ہو گا اور امت کے ہر ہر فرد کا بالاجماع اس طرح اختیار کرنا کہ اس میں اختلاف کی گنجائش نہ ہو یہ ایسی بات ہے جو عقل و واقعہ دونوں کے خلاف ہے عقلاً تو یہ اس لئے نادرست ہے کہ انتخاب کا دار و مدار اجتہاد پر ہے اور اجتہاد کا دار و مدار اس نتیجہ پر ہے جس پر کوئی عقلمند وجوہ عقلی اور سمعی کے قضایا پر تردد کے بعد پہنچے اور چونکہ ان سب کے طبائع مختلف ہیں تو لامحالہ ان کے احکام بھی مختلف ہوں گے کیا وجود اتفاق کے احکام کی خلافت ادنیٰ زیادہ مستحق نہیں ہے اور شریعت میں سب سے بہتر زمانہ پہلا زمانہ ہے اور یہ لحاظ صدق و اخلاص صحابہ سب سے افضل ہیں اور صحابہ میں بہ لحاظ عدم تہمت و خیانت مہاجرین و انصار زیادہ امین ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے سب سے زیادہ مقرب حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں پھر دیکھو انصار ثقیفہ بنی ساعدہ میں کس طرح علیحدہ جمع ہو گئے اور انھوں نے کیسے کہا کہ ہم میں سے ایک امیر اور تم میں سے ایک امیر اور سعد بن عبادہ پر ان کا اجماع کیوں کر ہوا۔ حضرت عمرؓ نے اس کا تدارک اس طرح کیا کہ خود حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی یہاں تک کہ لوگوں میں اس کی شہرت ہو گئی پھر اس کے بعد حضرت عمرؓ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ خبردار حضرت ابو بکرؓ کی بیعت ایک اچانک واقعہ تھا خدا اس کے شر سے محفوظ رکھے پھر جو اسی طرح کرے اس کو قتل کر دو آئندہ جو شخص بھی بغیر مسلمانوں کے مشورہ کے کسی شخص کے ہاتھ پر بیعت کرے تو اس پاداش میں وہ دونوں گردن زدنی ہیں یعنی میں نے بغیر جماعت کے مشورہ کے ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور خدا اس کے شر سے بچائے اور تم پھر کبھی ایسا نہ کرنا اور بیعت کے وقت جماعت کا اتفاق نہ تھا۔ دوسرے دن جب لوگوں نے بیعت کی بنی امیہ اور بنی ہاشم علیحدہ ہو گئے یہاں تک کہ ابو سفیانؓ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ تم خلافت کو قریش کے بدترین قبیلہ میں کیوں جانے دے رہے ہو۔ حضرت علیؓ نے ان کو جواب دیا کہ تم بحالت کفر ہمارے خلاف فتنہ انگیزی کر چکے ہو اب ہم میں پھر فتنہ برپا کرنا چاہتے ہو۔ حالانکہ تم مسلمان ہو۔ حضرت عباسؓ نے بھی اسی طرح کہا اور انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کہ تم میرے اور بقیہ امت کے باپ ہو۔ جب تک شب و روز کا اختلاف ہے (یعنی ہمیشہ) خلافت تمہاری اولاد میں رہے گی اور حضرت علیؓ بیعت کے لئے نہیں نکلے یہاں تک کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی ایک بیعت خفیہ طور پر ہوئی اور ایک علانیہ ہوئی اور اسامہؓ بن زید جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر بنایا تھا اپنے لشکر کے ساتھ نکل چکے تھے ان کا قول ہے کہ جب ایسی اہم اور بڑی باتوں میں اجماع نہیں ہوا تو یہ اس امر پر دلالت ہے کہ اجماع کبھی ہوا ہی نہیں اور اجماع دلیل شرعی نہیں ہے ان کا قول ہے کہ امامت کو انتخاب سے قایم کرنے پر دو اعتراض پڑتے ہیں۔

(۱) صاحب انتخاب امام پر نصب (امام بن جانے کو) واجب کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ امام ہو جائے مگر جب وہ امام ہو جاتا ہے تو اس کی اطاعت اس شخص پر بھی واجب ہو جاتی ہے مگر وہ تو اسی کے بنانے سے امام بنا ہے پھر اپنی (بنائی ہوئی) امامت کی بدولت وہ کیسے واجب الطاعۃ ہوا۔

(۲) دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ہر وہ مجتہد جو امامت کو قایم کرتا ہے اگر مسائل اجتہادی میں اپنے اجتہاد

کی بنا پر امام سے اختلاف کرے تو اس (مجتہد) کے لئے یہ جائز ہے کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس میں تم نے امام کی اطاعت کو فرض قرار دیا ہو مگر اسی کے ساتھ مجتہد کو اپنے اجتہاد سے کام لے کر اس میں اپنے امام سے اختلاف جائز ہے پھر ہم اس کو واجب الطاعۃ امام کیسے بنائیں اس شرط کے ساتھ کہ مجتہد امام کی مخالفت بھی کرے جب کہ اس کا اجتہاد اس کے مخالفت کی اجازت دے ان کا قول ہے، یہ سب اس پر دلالت کرتا ہے کہ امامت شرعاً واجب نہیں ہے۔ البتہ اگر کسی ایسے رئیس کی ضرورت پیش آئے جو دائرۂ اسلام کی حمایت کرے اور پراگندہ جماعتوں کو ایک مرکز پر جمع کرے اور ان کا اجتہاد اس کا مقتضی ہو کہ وہ اپنا ایک سردار مقرر کرلیں تو یہ جائز ہے بشرطیکہ وہ سردار عدل و انصاف پر کاربند رہے اور اگر وہ کسی مقدمہ میں ایک شخص پر بھی ظلم کرے تو اس کو علیحدہ کر دینا ان پر واجب ہے جیسا حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے ساتھ کیا گیا کیونکہ جب عثمانؓ سے غلطیاں سرزد ہوئیں تو لوگوں نے حضرت عثمانؓ کو علیحدہ کر دیا اور جب وہ علیحدہ نہ ہوئے تو انھوں نے حضرت کو قتل کر دیا۔ اور جب حضرت علیؓ حکم بنانے پر راضی ہو گئے اور اپنی امامت میں شک کیا تو ان کی بھی علیحدگی عمل میں آئی اور ان سے جنگ ہوئی۔

شیعوں کا قول ہے کہ دین میں امامت عقلاً اور شرعاً دونوں طرح واجب ہے جس طرح کہ نبوت فطرت میں عقلاً و سمعاً واجب ہے۔ امامت کا وجوب عقلی لوگوں کے اس احتیاج سے ظاہر ہے کہ ان کے لئے ایک ایسا امام ضروری ہے جو احکام شریعت کی حفاظت کرے اور ان کو دینی حدود کی رعایت پر آمادہ کرے۔ اور یہ ضرورت ویسی ہی ہے جیسے لوگوں کو ایک صاحب شریعت رسول کی ضرورت ہے جو ان کے لئے احکام شریعت مقرر کرے اور ان کو حلال و حرام سے واقف کرائے۔ مخلوق کو جس طرح تمہید شریعت کی ضرورت ہے۔ اسی طرح بقار شریعت کی بھی ضرورت ہے جب پہلی واجب ہے خواہ اس کا وجوب خدا کے لطف و کرم سے ہو خواہ حکمت عقلی سے تو دوسری بھی واجب ہے۔

امامت کا سمعاً واجب ہونا تو اس سے ظاہر ہے کہ خدا نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اولی الامر کی اطاعت و پیروی کریں چنانچہ ارشاد ہے کہ "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" یعنی خدا و رسول اور اپنے اولی الامر کی اطاعت کرو۔ پھر جب امام واجب الطاعۃ موجود نہ ہو تو ہم پر یہ تکلیف کس طرح لازم آئے گی

اور خدا کا حکم ہے کہ "یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین" یعنی اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ ہو جاؤ پھر اگر امامت میں واجب الطاعت صادقین موجود نہ ہوں تو ان کا ساتھ دینا ہم پر کس طرح واجب ہوگا اور یہ ناممکن ہے کہ خدا کسی انسان کو اس پر مکلف کرے کہ فلاں شخص کے ساتھ ہو جاؤ اور وہ فلاں شخص دنیا میں موجود ہی نہ ہو۔ اور جب دنیا کسی صادقِ مطلق سے خالی نہیں ہے تو اس شخص کی عصمت کا وجود ثابت ہے کیونکہ عصمت سے ہماری مراد تمام اقوال کی صداقت ہی ہے اور جو تمام اقوال میں سچا ہوگا وہ تمام احوال میں بھی صالح ہوگا۔

انھوں نے اس کی ایک دوسری تقریر بھی کی ہے کہ جس طرح صحابہؓ سے حسن ظن واجب ہے کہ وہ نص ظاہری کو چھوڑ کر انتخاب سے کام نہیں لیتے کیونکہ وہ ان برگزیدہ ہستیوں میں ہیں جن کو تقدمِ ایمان اور اولیتِ اسلام کا شرف حاصل ہے اسی طرح رسولؐ سے بھی حسن ظن واجب ہے کیونکہ جب رسولؐ نے یہ جان لیا کہ مخلوق کو ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو ان کی پراگندہ جماعتوں کو ایک مرکز پر جمع کرے اور ان کے باہمی اختلافات کو دور کر دے اور ان کو شریعت کا پابند رکھے، مظلوم کی دادرسی کرے اور ظالم کو ظلم کی سزا دے اور ان کے لئے یہ نسبت استنجا اور موزوں پر مسح اور مٹی سے تیمم وغیرہ کے مسائل جاننے کے ایسا راہ نما زیادہ ضروری ہے جو زبان و تلوار سے مخالفتِ اسلام کرنے والوں کو دعوتِ اسلام دے اور تبلیغ کا انتظام کرے پھر جب رسولؐ نے ان میں سے ہر ہر بات میں ایسا حکم بیان کرنے سے کوتاہی نہ کی جس سے اسی باب کے دوسرے نظائر پر بھی استدلال کیا جاتا ہے تو پھر ان سب سے اہم باب کو رسولؐ نے کس طرح قطعاً چھوڑ دیا کہ اس کے متعلق کچھ بھی صراحت نہ کی اور نہ کسی شخص کے تعین کا اشارہ ہی کیا اور نہ اس کا کوئی وصف ہی بیان کیا۔ یہاں تک کہ امت میں اصول و فروع دونوں کے متعلق اختلاف پیدا ہو گیا ان میں سے کوئی گمراہ ہے اور کوئی راہ راست پر مگر ہر ایک کا یہی دعویٰ ہے کہ وہ حق پر ہے اور اس کا مخالف باطل پر اور ان دونوں میں کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں ہے ان میں جاہل بھی ہیں اور عالم بھی مگر ہر شخص یہی دعویٰ کرتا ہے کہ وہ عالم ہے اور اس کا مدمقابل جاہل اور ان دونوں کا کوئی راہ نما نہیں۔ پس اگر بندے یہ کہہ سکتے ہیں کہ "ربنا لولا ارسلت الینا رسولا" یعنی اے ہمارے پروردگار تو نے ہمارے پاس کسی رسول

کو کیوں نہ بھیجا باوجودیکہ خدا پر کوئی سوال نہیں وارد ہوتا تو کیا پھر امت یہ نہیں کہہ سکتی کہ اے ہمارے نبی آپ نے ہمارے لئے کسی امام کو کیوں نہ معین فرمادیا کہ ہم ذلت ورسوائی اٹھانے سے پہلے اس کے ارشاد کی پیروی کریں نیز خدا نے رسولوں کو بھیجا تاکہ اس کے بعد لوگوں کو خدا کے مقابلہ میں کوئی حجت باقی نہ رہے پھر رسول نے امامت کو کیوں نہ بیان کردیا اور کسی امام کو کیوں نہ معین فرمادیا تاکہ اماموں کے بعد لوگوں کو نبی کے مقابلہ میں بھی کوئی حجت باقی نہ رہے اب اگر تم یہ کہو کہ نبی کو مخلوق کی ضرورت تو معلوم تھی مگر انھوں نے کسی کو معین نہیں فرمایا تو تم کو نبی سے حسن ظن نہیں ہے اور اگر تم یہ کہو کہ نبی نے معین بھی کیا اور بیان بھی فرمایا مگر لوگوں نے اتباع نہ کی تو صحابہؓ سے تم کو حسن ظن نہیں اب تم ہی بتاؤ کون سی صورت درست اور کس پر الزام لگانا بہتر ہے۔

بہرحال تمہارے آگے دو صورتیں ہیں۔ یا تو یہ کہو کہ امامت امت کے درمیان ایک امر تفویضی ہے جو مجتہدین کی رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ غور وفکر کرنے والے مجتہد کی فضیلت بہ مقابلہ اس شخص کے جو مرتبۂ اجتہاد سے قاصر ہے ظاہر ہو جائے اور تمام علماء، حامل شریعت و ناقل دین بنائے گئے ہیں اس صورت میں سوال یہ ہے کہ اسی طرح نبوت بھی عقلمندوں کے درمیان کیوں نہ امر تفویضی ہوا۔ اگر اس کو بھی مفکرین کی فکر اور مجتہدین کے اجتہاد پر چھوڑ دیا جاتا تو لوگوں کو ڈرانے اور خوشخبری سنانے کے لئے رسولوں کو بھیجنے کی ضرورت نہ پڑتی اور غور وفکر کرنے والے مجتہد کی فضیلت اور کم فہم ناکارہ کی کوتاہی ظاہر ہو جاتی۔ اور خود صحابہ نے یہ طریقہ کیوں نہ اختیار کیا وہ بھی اس کو امت کے درمیان ایک امر تفویضی بنا دیتے اور امامت کی ترتیب نہ قائم کرتے اور نبی کو دفن کرنا چھوڑ کر امام کو مقرر کرنے میں نہ مشغول ہو جاتے کہ فاضل کی فضیلت اور قاصر کی کوتاہی ظاہر ہو جاتی۔

یا پھر یہ کہو کہ امامت کو نہ تو امر تفویضی بنایا اور نہ اس کو شوریٰ پر چھوڑ دیا گیا اس صورت میں تم کو نص اور تعین شخص کا ماننا لازم ہو جائے گا پھر نص بھی اس شخص کے حق میں ہوگی جو نص کا دعویٰ کرتا ہے اور جو نص کا دعویٰ نہیں کرتا بھلا اس کی تخصیص نص سے کس طرح ہو سکتی ہے۔ واضح ہو کہ اس مسئلہ میں صرف یہی شبہ ہے جو ہم نے بیان کیا (اس کے علاوہ) امامیہ صحابہ کی شان میں جو بدگوئی کرتے ہیں اور رسول

پر جن احادیث کا افترا کرتے ہیں وہ ایسی بیہودہ باتیں ہیں جو ہرگز اس قابل نہیں کہ ان سے کتابوں کو زینت دی جائے اور قلم سے لکھا جائے اور اسی طرح زیدیہ جو کہتے ہیں کہ فاضل کی موجودگی میں مفضول کی امامت درست ہے زیدیہ کے پاس استحقاق امامت کے لئے چار خصلتیں درکار ہیں (۱) عفت (۲) علم (۳) شجاعت (۴) اور خروج مگر اس شخص کا فاطمی ہونا بھی مقدم ہے اس سے ہر سرزمین پر واجب الطاعۃ امام کا ہونا لازم آتا ہے اور زمین پر لاکھوں واجب الطاعۃ اور نافذ الامر ہو جائیں گے اگر ان میں سے ہر ایک فرد میں یہ خصلتیں جمع ہو جائیں۔

اہل سنت نجدات کے اس قول کا کہ امامت عقلاً و شرعاً کسی طرح بھی واجب نہیں یہ جواب دیتے ہیں کہ ہمارے یہاں واجب شریعت سے ہوتا ہے اور اس واجب کا پتہ اجماع امت سے چلتا ہے اور تم نے تعین امام کے بارے میں جس اختلاف کا ذکر کیا ہے وہ اس امر کی ادنیٰ دلیل ہے کہ اصل امامت واجب ہے ورنہ وہ لوگ نہ تو کسی کو معین کرتے اور نہ اس کے لئے ایسی سرگرمی سے کام لیتے، رہی یہ بات کہ اجماعِ امت آیا دلیلِ شرعی ہے اور ایسے اجماع کا واقع ہونا تصور بھی کیا جا سکتا ہے جو اجتہاد سے اس طرح صادر ہو کہ اس میں اختلاف کا تصور نہ ہو سکے ایسی ہے کہ عقلاً تو ایسے اجماع کا تصور جائز ہے کیونکہ دو شخصوں کا ایک رائے پر متفق ہو جانا عقلاً ناجائز نہیں اور جب دو شخصوں کی رائیں متفق ہو سکتی ہیں تو تین چار بلکہ سب کی رائیں متفق تصور کرنے میں کون امر مانع ہے۔ صدر اول میں تو اس کا وقوع فرض کرنا تمام مفروضات سے آسان تر ہے کیونکہ صحابہؓ کی دو ہی قسمیں تھیں۔ مہاجرین و انصار اور ان میں بھی اہل الرائے اور اجتہاد کا مرتبہ رکھنے والے محض گنے چنے تھے جن کا ایک مجلس میں جمع ہو کر کسی امر کی نسبت باہمی تبادلِ خیال کے بعد ایک رائے پر متفق ہو جانا اور ان میں سے کسی کا بھی اس سے انکار نہ کرنا ممکن ہے۔ اجماع کا دلیل ہونا تو ہم بداہتہً جانتے ہیں کہ صحابہ کا جب کسی امر پر اجماع ہوتا ہے تو ان کا یہ اتفاق بغیر کسی نص خفی کے نہیں ہوتا کیونکہ وہ اس سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں کہ یہ نص بعینہٖ اسی امر کے متعلق ہے یا اجماع کے حجت ہونے پر ہے پھر بسا اوقات یہ نص صحابہ کے پاس متواتر ہوتی ہے حالانکہ ہمارے نزدیک وہ خبر احاد ہے جس کی وجہ سے کسی ایسے اضمارِ قطعی کی ضرورت ہے جس کی بنا پر اس کو حجت قرار دیا جا سکے

مگر اجماع ایک قرینہ ہے جو اس پر قطعی دلالت کرتا ہے اور وہ متواتر احادیث کی طرح ہو جاتی ہے لہٰذا اس خبر کا یقین عدد سے نہیں حاصل ہوتا بلکہ قرینہ سے اس کا یقین حاصل ہوتا ہے۔ اجماع کے حجت شرعی ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جو شخص اجماع کا خلاف کرتا صحابہ اس کو ملامت کرتے اور گمراہ قرار دیتے تھے۔ صحابہ اہل اجماع کے استناد پر اعتراض نہ کرنے کو جائز رکھتے اور اجماع میں کبھی قرینہ قولی سے استناد کیا جاتا اور کبھی ایسے قرینہ فعلی سے استناد ہوتا جو صحابہ کے لئے تو مفید علم ہوتا مگر الفاظ میں اس کی تعبیر نہ ہو سکتی اور کبھی ایسی کھلی ہوئی بات بھی ہوتی کہ اگر صحابہ اس کی صراحت کر دیں تو اس مسئلہ میں وہ ایک ثابت دلیل ہو۔ اور اگر صراحت نہ کریں تو ان کا اجماع ہی کافی ہے۔

شیعوں کا یہ قول درست نہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کی امامت پر سب لوگوں کا اتفاق نہیں ہوا کیونکہ کوئی صحابی ایسے نہیں جنہوں نے بیعت نہ کی۔ بیعت کے وقت حضرت علیؓ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مصروف اور آپ کی جدائی کے صدمہ سے بہت مغموم تھے اس لئے ان کے پاس نہیں گئے مگر جب آپ نے دیکھا کہ لوگ داخلِ بیعت ہو چکے ہیں تو آپ نے بھی بیعت کر لی اور ان کا انکار تو کہیں بھی مذکور نہیں۔

شیعہ یہ کہتے ہیں کہ امامت قایم کرنے کا اجماع یہ ہے کہ اول تو اجماع کرنے والوں کی طرف سے خود امام پر یہ واجب کریں کہ وہ ان کے لئے واجب الطاعۃ ہو جاتے پھر اس کے بعد معاملہ برعکس ہو جاتا ہے اور ان لوگوں پر امام کی اطاعت واجب ہو جاتی ہے حالانکہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔

ہمارا جواب یہ ہے کہ یہ تو اس وقت ہوتا جب کہ اجماع کا وجوب خود اجماع کرنے والوں پر منحصر ہوتا حالانکہ یہ بات نہیں ہے کیونکہ وجوب کا استناد صاحب شریعت علیہ السلام کی نصِ خفی یا نصِ جلی سے ہوتا ہے اس لئے دراصل نص ہی واجب کرنے والی ہے اور اجماع وجوب کا ظاہر کرنے والا ہے اور یہی اس کے معلوم کرنے کا بہترین طریق ہے نہ کہ اس شخص کا قول حجت ہو سکتا ہے جس کی صداقت کا عدمِ ثبوت ایک بدیہی امر ہے۔

شیعوں کا سوال ہے کہ اگر ہر مجتہد کسی مسئلہ میں اپنے امام کے خلاف کرے تو جائز ہوگا؟

ہمارا جواب ہے کہ ہاں چونکہ وہ بھی امام کی طرح مجتہد ہے اور مجتہد کے لئے مجتہد کی تقلید جائز نہیں مگر
وہ اس اجماع سے اختلاف نہیں کر سکتا جو باستناد نص اس کی امامت پر ہوا ہے البتہ وہ کسی دوسرے مسئلہ میں
امام سے اختلاف کر سکتا ہے اور یہ جائز ہے کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا اجتہاد یہ ہوا کہ جو لوگ مرتد ہو گئے
اور جو زکوٰۃ نہیں ادا کرتے ان سے جنگ کریں اور ان کے بال بچوں کو قید کر لیں اور ان کے اموال کو غنیمت قرار دیں
اور حضرت عمرؓ کا اجتہاد یہ ہوا کہ ان کے قیدی انھیں واپس کر دئے جائیں اور انھیں واپس کر دیا۔ فرائض۔ دیت اور
ایجاب رجم کے کتنے ہی مسائل ہیں جن میں صحابہ نے آپ سے اختلاف کیا اور حضرتؓ نے اپنا اجتہاد چھوڑ کر ان کے قول
کی طرف رجوع کیا اور یہ اس لئے ہوا کہ اماموں کے لئے عصمت واجب نہیں ہے ان سے خطا اور کبائر کا صدور بھی ممکن ہے اجتہاد

ان کے اس قول کا کہ "لوگ اگر باہمی عدل و انصاف سے کام لیں تو انھیں امام کی ضرورت ہی نہیں"
جواب یہ ہے کہ گو عقل کے نزدیک یہ بات جائز ہے جیسے شریعت وارد ہونے سے پہلے غور و فکر کرنے
والوں کی فکر راہ راست پر ہو سکتی ہے لیکن عادت یہی ہے اور یہی عملدر آمد ہے کہ لوگ از خود انصاف اور
شریعت کے راستوں پر نہیں ٹھہرتے تا وقتیکہ ایسا حاکم نہ ہو جو ان کو ڈرا کر اور سختی کے ساتھ اس کا پابند کرائے
اور یہ کام بغیر سیاستِ امام و بغیر خوف شمشیر اور ظالم پر سختی کئے بغیر نہیں چل سکتا۔

شیعوں کے اس قول کا کہ "امامت یا تو واجباتِ عقلی میں ہے" ہم جواب دے چکے ہیں۔ تقرر امام
واجب ہونے کا استناد اجماع سے ہے جو نصِ شرعی پر دلالت کرتا ہے ان کا یہ قول کہ "اللہ تبارک و تعالیٰ
نے ہمیں اولی الامر کی اطاعت اور صادقین کی پیروی کا حکم دیا ہے" یہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ مطلق امام کی
اطاعت واجب ہے لیکن اس تخصیص میں کلام ہے کہ آیا وہ شارع کے معین کرنے سے بربنائے نص معین
ہوا ہے یا اہلِ اجماع کے معین کرنے سے اس کا تعین ہوا ہے پہلی بات ثابت نہیں کیونکہ وہ ثابت ہوتی
تو اس کی روایت بھی کی جاتی ایسے موقع پر جب کہ لوگ امام کے متعین کرنے میں اختلاف کر رہے ہوں کل کی
قوم یا ان میں سے ایک شخص کا بھی خاموش رہنا تصور میں نہیں آ سکتا ان کے مقابلہ میں کیا یہ واقعہ نہیں ہے
کہ جب انصار نے دعویٰ کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے جن کے پاس امامت کے لئے تخصیصِ قریش کی نص تھی
روایت کی اور انصار اپنے دعوے سے دست بردار ہو گئے اور امامت از روئے نص قریش کے لئے مختص ہو گئی۔

اسی طرح اگر کسی کے پاس بنی ہاشم کی تخصیص کے متعلق نص موجود ہوتی تو وہ اس کو بھی بیان کرتا تاکہ نزاع رفع ہو جائے کیونکہ انصار کی نزاع قریش سے ویسی ہی ہے جیسی قریش کی بنی ہاشم سے اور بنی ہاشم کی حضرت علیؓ سے۔

یہ عجیب بات ہے کہ تخصیص قریش والی حدیث خبر متواتر نہ تھی ورنہ انصار شرکت خلافت کا دعویٰ ہی نہ کرتے انھوں نے خبر احاد کے آگے تو سر تسلیم خم کر دیا پھر ان کی نسبت یہ گمان کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ خبر متواتر کی اطاعت نہ کرتے۔

اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عمرؓ تو امامت کو غیر قریش بلکہ موالی کے لئے بھی جائز سمجھتے تھے جب ہی تو آپ نے فرمایا کہ اگر حذیفہؓ کے موالی سالمؓ زندہ ہوتے تو مجھے خلافت کے بارے میں کوئی شک و خلجان نہ رہتا۔ نیز تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ امامت کے لئے کوئی نص نہیں ہے حالانکہ تخصیص قریش کے متعلق نص موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے امام قریش کے بنائے جائیں تمہارے پاس اس شخص کا کیا جواب ہے جو یہ کہتا ہے کہ جب تمام مسلمانوں سے قریش کی تخصیص نص سے ثابت ہوتی ہے تو قریش میں سے بنی ہاشم کی تخصیص بھی نص سے ثابت ہونا جائز ہے۔ تم نے پہلے تو یہ دعویٰ کیا کہ ثبوت نص محال ہے اور امامت کے حکم کو اجماع سے متعلق کر دیا پھر کہا کہ اجماع نص پر مشتمل ہوتا ہے تاکہ وہ دلیل شرعی ہو جائے پس تم امامت کو نص سے متعلق کر چکے۔ تم نے یہ دعویٰ کیوں نہ کر دیا کہ حضرت ابو بکرؓ کی خلافت پر نص موجود ہے۔ نص کے بطلان اور اجتہاد کو ثابت کرنے کے لئے ایک باب قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے جس حدیث کی روایت کی اس کو حضرت عمرؓ نے تسلیم فرما لیا اور انھوں نے یہ ظاہر نہ فرمایا کہ وہ غیر قریش کے لئے امامت کو جائز تصور کرتے ہیں کیونکہ سالمؓ کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہ قریش کی طرف منسوب ہیں اس لئے آپ نے فرمایا کہ مجھے اس میں کوئی خلجان نہ رہتا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سالم کی نیک کرداری اور امانت داری کی شہادت دی ہے وہ نص خفی جس پر اجماع مشتمل ہوتا ہے میری جان کی قسم قطعاً لازمی ہے جبکہ امامت بغیر اجماع کے نہیں ثابت ہوتی اور اجماع بغیر نص کے نہیں ثابت ہوتا تو امامت بغیر نص کے نہیں ثابت ہوتی۔

جواب یہ ہے کہ وہ نص جو اجماع کے ضمن میں ہوتی ہے کبھی امامت کے متعلق ہوتی ہے کبھی اجماع کے حجت ہونے کے متعلق ہوتی ہے لہٰذا دونوں امور کا احتمال ہوا اس لئے ہم حضرت ابو بکرؓ کی نسبت نص ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

بعض وقت یہ نص ظاہری نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کے پاس قرینۂ حال ہوتا ہے کیونکہ وہ لوگ حاضرین بارگاہ رسالت ہیں اس لئے بعض دفعہ ان کو اس کا قطعی علم ہوتا ہے اور ان کے آگے غیر ظاہر بھی ظاہر کی طرح ہو جاتا ہے اور اس کا انھیں یقین حاصل ہو جاتا ہے۔

واضح ہو کہ اجماع صرف اس وجہ سے حجت ہے کہ اجماع کرنے والے اپنے مجموعہ میں خطا، کفر اور گمراہی سے معصوم ہوتے ہیں اگرچہ انفرادی طور پر ان کے لئے یہ باتیں ممکن ہیں اس امت کے مجموعہ کی عصمت ایک شخص کی عصمت کے قائم مقام ہے اور یہ جائز ہے کہ ایک حکم کسی مجموعہ کے لئے بہ حیثیت مجموعہ ہونے کے تو خبر متواتر سے ثابت ہو اور انفرادی طور پر ان میں سے کسی پر بھی ثابت نہ ہو لہٰذا اس میں شک نہیں کہ علم تو اس کے مجموعہ سے حاصل ہوا ہے اگرچہ اس کے افراد سے نہیں حاصل ہوا جس طرح پیالوں سے نشہ اور لقموں سے سیری حاصل ہوتی ہے اور اسی پر محمول ہے یہ ارشادِ خداوندی یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ یعنی اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ اور خدا کا یہ ارشاد کہ

وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ — وہ مومنین کے راستہ کے سوا دوسرا راستہ چلتا ہے

ان کے وارد کردہ اشکال کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہیں جانتے تھے کہ آپ کے بعد کون آپ کا قائم مقام ہوگا اور مسندِ امامت پر بیٹھے گا بس اگر آپ اپنے اصحاب کو ان باتوں کی خبر دیتے تھے جو آپ کے بعد قیامت تک پیش آنے والی ہیں یعنی فتنہ، بلائیں، دجال کا نکلنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ زمین میرے لئے روشن کر دی گئی ہے اور مجھے اس کے مشارق و مغارب دکھائی دیئے گئے اور قریب میں میری امت کا ملک وہاں تک پہنچ جائے گا جو میرے آگے روشن کیا گیا اور آپ اپنے اصحاب عشرہ مبشرہؓ کو ان میں سے ہر ایک جو کچھ کرتا اور جو تقدیر اس پر جاری

ہوتی بتا دیا کرتے تھے اور آپ نے حضرت علیؓ کو خبر دی ہے کہ تم عہد شکن، ظالم، بے دینوں سے جنگ کرو گے اور ذو الخویصرہ والی حدیث عہ تو مشہور ہے کہ جب اس نے آنحضرتؐ سے منافقانہ تکرار کی تو آپ نے اس کی نسبت یہ پیشین گوئی فرمائی کہ یہ شخص خوارج میں مل جائے گا جن کی علامت یہ ہوگی کہ ان میں سے ایک شخص ذو الثدی ہوگا صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ تمہاری بھی اسی طرح آزمائش ہوگی جس طرح میری آزمائش ہوئی ہے چنانچہ آپ کی یہ پیشین گوئی بوقت تحکیم پوری ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کے حالات کی آپ کو خبر دی ہے جیسے فرمایا لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ ان کو زمین پر خلیفہ بنائیں گے اور قُل لِّلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ إِلَىٰ قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ پیچھے رہنے والوں سے کہہ دیجئے کہ تم بہت جلد ایسی قوم کی طرف بلائے جاؤ گے جو سخت خوفناک ہے اور یہ بھی مروی ہے کہ آنحضرتؐ کو خواب میں دکھایا گیا کہ حضرت ابو بکرؓ نے ایک یا دو ڈول کھینچے اور حضرت عمرؓ بہت طاقت و شدت سے کھینچتے تھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے کسی بڑے سے بڑے طاقت ور کو اس خوبی سے کھینچتے نہیں دیکھا اور حضورؐ کا ارشاد ہے کہ میرے بعد ابو بکرؓ

عہ اس واقعہ کو امام بخاری نے حضرت ابو سعیدؓ سے روایت کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دفعہ آنحضرتؐ مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے کہ عبد اللہ ذو الخویصرہ آیا اور آنحضرتؐ سے کہا کہ یا رسول اللہ عدل کیجئے آپ نے فرمایا تجھ پر افسوس ہے اگر میں بھی عدل نہ کروں تو کون عدل کرے گا اس پر حضرت عمرؓ نے عرض کیا اگر حکم ہو تو اس کا سر اڑا دوں مگر آنحضرتؐ نے ان کو باز رکھا۔ اور اس کی نسبت یہ پیشین گوئی فرمائی کہ آئندہ یہ شخص خوارج میں شریک ہو جائیگا اس کے ساتھی لوگ ایسے ہوں گے جن کی نمازوں کے آگے تم کو اپنی نمازیں حقیر معلوم ہوں گی اور جن کے روزوں کے آگے تمہیں اپنے روزے حقیر دکھائی دیں گے مگر حقیقتاً دین سے ان لوگوں کو کوئی واسطہ نہ ہوگا اور ان کی یہ علامت بیان فرمائی کہ ان میں ایک شخص سیاہ فام ذو الثدی ہوگا۔ ابو سعیدؓ جو اس حدیث کے راوی ہیں بیان کرتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی تھی اور جنگ نہروان میں حضرت علیؓ کے مقابلہ میں جو خوارج مارے گئے ان میں ایک نعش ایسے شخص کی برآمد ہوئی جس کا ایک ہاتھ عورت کی پستان کی طرح تھا۔

امام بخاریؒ نے اس حدیث کو دو جگہ لکھا ہے مگر یہ جملہ (یخرج من ضئضئ هذا الرجل) کسی جگہ بھی نہیں لکھا۔ بخاری شریف جلد اول ص۵۰۹ مطبوعہ مصطفائی۔

باب علامات نبوت اور باب ترک قتال خوارج

جلد اول ص۵۰۹ جلد دوم ص۱۰۲۴

اور عمرؓ کی اقتدار کرو۔

لہذا یہ تو بالکل بعید از قیاس ہے کہ خدا نے آپ کو یہ نہ بتایا ہو کہ آپ کے بعد کون آپ کا خلیفہ ہوگا مگر یہ بعید نہیں ہے کہ آپ نے یہ کسی پر ظاہر نہیں فرمایا اور نہ کسی شخص ہی کو مقرر فرمایا کیونکہ آپ کو اس کا حکم نہیں ہوا تھا اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ آپ اس پر مامور تھے تو پھر نص و اظہار دونوں قطعاً لازمی ہیں۔ بے شک خدا نے آپ کو ہادی مہدی اور سراج منیر بنا کر بھیجا جیسے ارشاد ہے کہ هُوَ الَّذِىٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ الآیہ خدا وہ ہے کہ جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ آنحضرتؐ نے غدیر خم کے روز اس کو ظاہر فرما دیا کہ لوگوں کو (نخلستان) دوحات میں جمع ہونے کا حکم دیا اور خطبہ میں حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر یہ فرمایا کہ میں جس کا مولیٰ ہوں علیؓ اس کے مولیٰ ہیں بار خدایا جو ان کو دوست رکھے تو بھی اس کو دوست رکھ اور جو ان سے عداوت رکھے تو بھی اس سے عداوت رکھ اور جو ان کی مدد کرے تو بھی اس کی مدد کر اور جو ان کو چھوڑ دے تو بھی اس کو چھوڑ دے اور ہمیشہ حق کو ان کے ساتھ ساتھ رکھ اور یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی تھی کہ "يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ‌ؕ وَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسَالَتَهٗ" اے رسول آپ کے رب کی طرف سے آپ پر جو اترا ہے اس کو پہنچا دیجیے اور اگر آپ نے نہیں پہنچایا تو آپ نے خدا کی رسالت کا حق ادا نہ کیا ارشاد نبوی من کنت مولاہ فعلی مولاہ کے معنی لوگوں نے خلافت ہی سمجھے چنانچہ حضرت عمرؓ نے ان کو مبارکباد دی اور فرمایا کہ علیؓ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ ہر مومن مرد اور عورت کے مولیٰ ہو گئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میرے لئے ایسے ہی ہو جیسے حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے لئے تھے مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں اور آنحضرت یہ بھی فرما چکے ہیں کہ میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کے دروازہ ہیں اس کے سوا ایسی اور احادیث بھی ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسی احادیث تمہاری تشفی کے لئے کافی ہیں تو ایسی ہی احادیث حضرت ابوبکرؓ کی شان میں ہم سے بھی سنو۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا کہ دوات لاؤ اور اپنے شانہ کا سہارا دو تاکہ میں ابوبکرؓ کے لئے ایسی تحریر لکھوا دوں جس پر دو شخص بھی اختلاف نہ کریں اور آپ نے فرمایا

کہ ابو بکرؓ لوگوں کو نماز پڑھائیں، آپ کا ارشاد ہے کہ اگر تم ابو بکرؓ کو خلیفہ بناؤ گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ وہ اپنی ذات میں کمزور اور خدا کے حکم میں قوی ہیں اور اگر تم عمرؓ کو خلیفہ بناؤ گے تو تم دیکھو گے کہ وہ اپنی ذات اور خدا کے حکم دونوں میں قوی ہیں اگر تم عثمانؓ کو خلیفہ بناؤ گے تو وہ تم کو سیدھے راستہ چلائیں گے اگر علیؓ کو خلیفہ بناؤ گے تو تم انھیں ایک ایسا ہدایت یافتہ راہنما پاؤ گے جو تم کو صراط مستقیم کی طرف لے جا رہا ہے آپ کا ارشاد ہے کہ جب تک قریش کے دو شخص بھی باقی ہیں یہ امر (خلافت) قریش میں رہے گا محدثین بیان کرتے ہیں کہ جب سورۂ فتح نازل ہوئی اور اسکے کچھ ہی دنوں بعد آپ علیل ہوئے تو حضرت عباسؓ حضرت علیؓ کے پاس آئے اور کہا کہ خاندان عبدالمطلب کے چہرہ پر موت کے جو آثار ہوتے ہیں میں ان سے واقف ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے آرہا ہوں آپ کے روئے انور سے موت کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں میرے ساتھ آپ کی خدمت میں چلو آپ سے دریافت کریں کہ آپ کے بعد کون خلیفہ ہوگا۔ اگر خلافت تم میں رہتی ہے تو خیر اور اگر دوسروں میں جاتی ہے تو حضور اس شخص (خلیفہ) سے تمہارے لئے وصیت فرمادیں مگر حضرت علیؓ نے اس سے انکار کردیا۔ حضرت عباسؓ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس گئے اور اس امر میں حضرت سے گفتگو کی تو آپ نے وہ خطبہ پڑھا جو مشہور ہے اور اس کے آخر میں آپ کا ارشاد ہوا کہ جو شخص اس امر کا والی ہو تو اس کو چاہیے کہ ان کے نیکو کاروں کی نیکی قبول کرے۔ اور خطا کاروں سے درگذر کرے لوگوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ قریش کے لئے وصیت فرمایئے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ لوگ قریش کے تابع ہیں پھر اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ میں تم کو میرے اہل بیت و عترت کے ساتھ بھلائی کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ وہ میرا گوشت ہیں لہذا ان کی بھی ویسی ہی حفاظت کرو جیسی تم آپس میں کیا کرتے ہو یہ سب احادیث انتخاب پر دلالت کرتی ہیں۔ اگر یہ سوال ہو کہ ہم نے تو کہا ہے کہ تعین امام کا علم نص سے ہوتا ہے نہ کہ انتخاب سے کیونکہ امام کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ خاص خاص صفات سے موصوف ہو جن میں عصمت عقل علم، شجاعت اور عفت کے ساتھ عدل و انصاف بھی داخل ہیں اور اجتہاد یا گمان غالب ان صفات اور ان کی مقدار کے سمجھنے سے قاصر ہیں بلکہ یہ امور رسول کی ایسی نص کے بغیر معلوم ہی نہیں ہو سکتے جس کا استناد وحی خداوندی کی طرف ہو اور تم جب اماموں کو ان کے حالات ظاہری کے نظر کرتے انتخاب کرتے

ہوا دراس کے بھی قائل ہو کہ ممکن ہے کہ امام باطنی طور پر بے دین ہوں خدا اور رسول پر جھوٹ بولیں اور حدودِ شرعی کو معطل اور حقوق کو باطل کر دیں اور متشابہات قرآنی کی بے جا تاویلات کریں، احادیث کو غلط طریقوں پر روایت کریں خدا اور رسول پر بہتان لگائیں کیا یہ واقعہ نہیں کہ بنی امیہ نے اہل بیت کو ستایا ان کو قتل کیا ان کی توہین کی اور ان کے مالوں کو حلال کر لیا رعایا پر ان کا ظلم وستم اور ان کا فسق وفجور میں مبتلا رہنا کوئی چھپی ہوئی بات نہیں پھر اس کا کیا اطمینان ہے کہ ظالم اماموں کی پیروی تم کو عذابِ دوزخ میں نہ مبتلا کرے گی اور وہ لوٹنے کی بہت بڑی جگہ ہے۔

جواب یہ ہے کہ صفتِ امامت پر علامات سے استدلال کیا جانا جائز ہے تو ال علم وفضل پر اور افعال کی خوبی عفت پر دلالت کرتی ہے اور مہارتِ جنگ سیاست وشجاعت پر دلالت کرتی ہے جس طرح گواہی اور قضا کے لئے افعال سے استدلال کیا جاتا ہے اسی طرح ان صفات پر بھی استدلال ہوتا ہے جو امامت کے لئے مشروط ہیں اگر اس کے بعد امام سے جہالت، ظلم، گمراہی یا کفر سرزد ہو تو وہ خود امامت سے دست بردار ہو جاتے یا ہم خود اس کو علیحدہ کر دیں امویہ کے متعلق جو کچھ مشہور ہے وہ درست ہے مگر ان کے پاس وہ منافی امامت نہیں اور نہ ان کے پاس جو اماموں کے لئے ان امور کو جائز قرار دیتے ہیں (یہ منافی امامت ہے) اگر یہ کہو کہ وہ کون کون سی قابل تعریف صفات ہیں جن کی بدولت ایک شخص امامت کا مستحق ہوتا ہے اور امت کے کتنے افراد کی بیعت سے عقد بیعت صحیح ہوتا ہے۔

جواب۔ وہ صفات یہ ہیں۔ مسلمان ہونا، قریشی ہونا، بلحاظ علم مجتہد ہونا۔ رعیت کی سیاست سے بخوبی واقف ہونا، صاحب شجاعت اور رعیت کے لئے مفید وکار آمد ہونا۔ تعداد کی نسبت اختلاف ہے بعض علماء نے ہماری بیان کردہ تعداد سے کم تعداد بیان کی ہے۔ بعض علماء نے اس سے زیادہ تعداد بیان کی ہے

صحت عقد بیعت کی تعداد سے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ ایک عادل شخص کے بیعت کر لینے سے بھی بیعت درست ہو جاتی ہے بعض دو شخصوں کی بیعت اور بعض چار شخصوں کی بیعت ضروری کہتے ہیں اور بعض کا قول ہے کہ اربابِ حل وعقد، ذی اقتدار اور ماہرین امر کی ایک جماعت کا بیعت کرنا ضروری ہے اگر ایک شخص نے بیعت کر لی اور باقی دوسرے لوگوں کا انکار کرنا نہ سنا گیا ہو تو یہی کافی ہے مگر اس کی شہادت

ضروری ہے کیونکہ یہ ایک نہایت اہم واقعہ اور ایک منصبِ عظیم ہے۔ اور دو شہروں یا دو ملکوں میں دو شخصوں کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ہم نے جو ذکر کیا اور اس پر جو مسائل مرتب ہوتے ہیں یعنی اگر کوئی امام دست بردار ہو جائے یا اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جس کی وجہ سے وہ قابل علیحدگی ہو جائے تو آیا وہ خود ہی دست بردار ہو جائے یا یہ واجب ہے یہ ساری باتیں نتائج اجتہاد پر موقوف ہیں جن کے لئے تمہیں ان کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے جو علم کلام میں تصنیف ہوئی ہیں کیونکہ اس کتاب میں میں نے اپنے آپ پر یہ شرط نہیں لگائی ہے کہ ان تمام باتوں کو نقل کر دوں جو علم کلام میں مذکور ہیں۔ میں نے صرف یہ شرط لگائی ہے کہ منقولات کو چھوڑ کر معقولات کی مشکلات کو حل کر دوں اور اہل اصول کی معقولات میں انتہائی ترقی کو بیان کروں۔

ہندوستان میں قدیم تعلیمی نظام کی بربادی

از

(جناب سید محبوب صاحب رضوی)

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو برہان بابتہ مئی ۱۹۵۲ء)

گزشتہ مضمون میں یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ مسلمان جن جن ممالک میں پہنچے وہاں ان کے ذوقِ علم نے چپہ چپہ پر مدرسوں، درسگاہوں اور کتب خانوں کا ایک لامتناہی جال بچھا دیا تھا، اور اسلامی آبادی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو علمی سرگرمیوں سے خالی رہا ہو، یہی کیفیت ہندوستان کی بھی تھی، سلطنت کی کوئی مجلس ایسی نہ تھی جس کی ممتاز ترین خصوصیت علم و فضل کی خدمت نہ رہی ہو، مسلمانوں کا ایک ایک امیر اپنی علمی فیاضی سے ملک کے گوشہ گوشہ میں فضل و کمال کی روح پھونکتا رہتا تھا، سلاطین اور امراء علمی فیاضی اور علماء و طلباء نوازی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا اپنے لئے فخر و مباہات کا باعث اور نجاتِ اخروی کا ذریعہ سمجھتے تھے، نواب نجیب الدولہ کی نسبت حضرت شاہ عبد العزیزؒ نے لکھا ہے کہ ان کی سرکار سے نوسو علماء کو وظائف ملتے تھے، شاہ صاحبؒ کے الفاظ یہ ہیں:-

"نزد نواب نجیب الدولہ نہ صد عالم بود، ادنیٰ پنج روپیہ و اعلیٰ پانصد روپیہ می یافت"[1]

روہیل کھنڈ جیسے غیر معروف خطہ میں پانچ ہزار علماء مختلف مدارس میں درس دیتے تھے، اور حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی ریاست سے تنخواہ پاتے تھے[2]

غرض کہ ملک میں جہاں جہاں علماء اور معلمین رہتے تھے اُن کی گزر بسر کے لئے سلاطین و امراء کی جانب

---

[1] ملفوظات حضرت شاہ عبد العزیز دہلویؒ صـ۸۱ خود راقم الحروف کے خاندان میں بھی نواب نجیب الدولہ کا ایک فرمان موجود ہے جس میں خاندان کے ایک عالم کو وظیفہ دیئے جانے اور سرکاری محاصل کی معافی کا حکم تحریر ہے۔

[2] حیات حافظ رحمت خاں ص ۲۷۴

سے اوقاف یا خزانہ سے وظائف مقرر ہو جاتے تھے، اور وہ لوگ کسبِ معاش سے مطمئن ہو کر فراغت اور سکونِ خاطر کے ساتھ درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم میں مشغول رہتے تھے، طلبار کے لئے اوقافِ عام تھے جوان کے خورد و نوش اور تعلیمی مصارف کے کفیل ہوتے تھے اس طرح سے ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک تعلیم عام اور مفت ہوتی تھی انہی علمار میں ہر زمانہ اور ہر دور میں ایسے علمار کی بھی ایک بڑی تعداد موجود رہی ہے جن کو کسی مالی اعانت کی چنداں ضرورت نہ ہوتی تھی، وہ یا تو ذاتی طور پر فارغ البال ہوتے تھے اور یا ان میں استغنار اس درجہ کا ہوتا تھا کہ جو کچھ میسر آگیا اس سے اپنا کام نکال لیا، ایسے لوگ حسبۃً للہ تعلیم و تدریس اور علم کی فیض رسانی میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے،

ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری تک دہلی، آگرہ، لاہور، ملتان، جونپور، لکھنو، خیر آباد، پٹنہ، اجمیر سورت، دکن، مدراس، بنگال اور گجرات وغیرہ کے بہت سے مقامات علم وفن کا مرکز تھے، ہندوستان کے صرف ایک صوبہ بنگال کے متعلق انگریز مصنف کیبر ہارڈی نے میکس مولر کے حوالہ سے یہ کیفیت بیان کی ہے کہ:۔

"انگریزی عملداری سے قبل بنگال میں اسّی ہزار مدرسے تھے، اس طرح پر ہر چار سو آدمیوں پر ایک مدرسہ کا اوسط نکلتا ہے"[1]

اسی صوبہ بنگال میں سلاطین و امرار نے مدارس کے لئے جو جائدادیں وقف کی تھیں اُن اوقاف کا مجموعی رقبہ بقول مسٹر جیمس گرانٹ بنگال کے چوتھائی رقبہ سے کم نہ تھا، اوقاف کے علاوہ سلاطین و امرار نقد وظائف کے ذریعہ سے بھی اہل علم کی اعانت کرتے تھے،

مدارس اور درسگاہوں کا یہ عظیم الشان جال کیوں کر ٹوٹا؟ اور یہ مکاتب و مدارس کس طرح تباہ و برباد ہوئے؟ اس سوال کے جواب کے لئے بارہویں صدی ہجری (اٹھارویں صدی عیسوی) کے ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا جاننا ضروری ہے۔

سیاسی نظام کی تبدیلی اور اوقاف کی ضبطی | ایسٹ انڈیا کمپنی جو ابتداءً صرف تجارتی اغراض و مقاصد لے کر ہندوستان

---

[1] تاریخ از میجر باسو جلد پنجم ص ۱۴ بحوالہ روشن مستقبل صد ۱۲

میں داخل ہوئی تھی اس کو ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی مشہور جنگ نے ایک نئی اور زبردست طاقت میں تبدیل کر دیا، یہ نئی طاقت جس زمانہ میں ظہور پذیر ہوئی اس وقت بدقسمتی سے ہندوستان کی مرکزی طاقت پارہ پارہ ہو چکی تھی اور ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا، صوبہ دار اور امراء آزاد اور خود مختار ہو چکے تھے، ہندوستان کی اس سیاسی کمزوری سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور وہ آہستہ آہستہ اپنی دسیسہ کاریوں اور ریشہ دوانیوں کے ذریعہ سے ملک پر قابض ہوتی چلی گئی، تاآنکہ انیسویں صدی کے اوائل تک اس نے پنجاب کے علاوہ پورے ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کر لیا، پرانا قانون، اور قدیم نظام تعلیم و تہذیب منسوخ کر دیا گیا، اب قانون کی تنفیذ اور ملک کا پورا نظام کمپنی کے ہاتھوں میں تھا اس تغیر و تبدل کا ملک کے حالات پر جو اثر پڑا اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے میں یہاں صرف تعلیمی تبدیلی کا مختصراً ذکر کروں گا، قدیم مدارس جن کے مصارف کے لئے سلاطین و امراء نے چھ سو سال کی طویل مدت میں بڑے بڑے اوقاف مقرر کئے تھے ۱۸۳۸ء میں کمپنی کی حکومت نے ان تمام اوقاف کو ضبط کر لیا، وظائف حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ہی موقوف ہو چکے تھے، اس وقت تعلیم کا تمام تر دار و مدار انھی اوقاف پر تھا جو اسی مقصد کے لئے مخصوص کئے گئے تھے، ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر نے جو بنگال میں ایک بڑے سول عہدہ پر فائز تھا ۱۸۷۱ء میں "ہمارے ہندوستانی مسلمان" نامی کتاب لکھ کر اس سلسلہ کے تاریخی حقائق کو سرکاری کاغذات سے واشگاف کیا ہے، ہنٹر کہتا ہے کہ:-

"صوبہ بنگال پر جب ہم نے قبضہ کیا تو اس وقت کے قابل ترین افسر مال جیمز گرانٹ کا بیان ہے کہ اس وقت صوبہ کی آمدنی کا تخمیناً ایک چوتھائی حصہ جو معافیات کا تھا حکومت کے ہاتھ میں نہیں تھا، ۱۷۷۲ء میں وارن ہیسٹنگز نے ان علاقوں کی واپسی کی مہم شروع کی، مگر ناکام رہی، ۱۷۹۳ء میں لارڈ کارنوالس نے پھر اس معاملہ کو اٹھایا مگر اس وقت کی طاقت ور حکومت بھی اس پر قابو نہ پا سکی، پچیس برس کے بعد ۱۸۱۹ء میں حکومت نے پھر اس معاملہ کو زور سے اٹھایا مگر عمل کی جرأت نہ ہو سکی، آخر ۱۸۲۸ء میں آٹھ لاکھ پونڈ کے خرچ سے مقدمات چلا کر ان معافیات اور اوقاف تعلیم پر حکومت نے قبضہ پا لیا، صرف ان معافیات سے حکومت کی آمدنی میں تین لاکھ پونڈ یعنی تقریباً پینتالیس لاکھ روپے کا اضافہ ہو گیا۔"[1]

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۲۵۵ و ص ۲۵۶

اس کارروائی کا مسلمانوں کی علمی زندگی پر کیا اثر پڑا؟ اس کی نسبت ہنٹر لکھتا ہے کہ:-

"سینکڑوں پرانے خاندان تباہ ہو گئے، اور مسلمانوں کا تعلیمی نظام جس کا دارومدار انہی معافیات پر تھا تہ و بالا ہو گیا، مسلمانوں کے تعلیمی ادارے ۱۰۰ سال کی مسلسل لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے"[1]

آگے چل کر لکھتا ہے کہ:-

"مسلمانوں کے اس الزام کا جواب نہیں دیا جا سکتا کہ ہم نے ان کے اوقاف کا ناجائز استعمال کیا، اس حقیقت کو چھپانے سے کیا فائدہ کہ مسلمانوں کے نزدیک اگر ہم اس جائیداد کا جو اس مصرف کے لئے ہمارے قبضہ میں دی گئی تھی ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے تو بنگال میں آج بھی ان کے پاس اعلیٰ اور شاندار تعلیمی ادارے موجود ہوتے"[2]

اندازہ کیجئے کہ اسلامی حکومت میں جب صرف ایک ایسے دور افتادہ صوبے میں جس کو اس زمانہ کے لحاظ سے کوئی خاص تعلیمی فوقیت اور مرکزیت حاصل نہ تھی، تعلیم کے لئے پینتالیس لاکھ روپے سالانہ آمدنی کے اوقاف موجود تھے تو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بالخصوص ان مقامات میں جن کو تعلیمی مرکزیت حاصل تھی کس قدر اوقاف ہوں گے؟ مسلمانوں کے نظام تعلیم کو مٹا کر جو جدید نظام قائم کیا گیا اس میں مسلمانوں کے مذہبی رجحان کی کس حد تک رعایت ملحوظ رکھی گئی تھی اس کو بھی ہنٹر ہی کی زبان سے سنئے کہتا ہے کہ:-

"ہمارے طریق تعلیم میں نوجوان مسلمانوں کے لئے مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے"[3]

اس کارروائی نے بقول ہنٹر مسلمانوں کے نظام تعلیم پر ایک کاری ضرب کا کام کیا اور فی الواقع یہ ایسی کاری ضرب تھی کہ "قدیم مدارس" کے "موسم بہار" میں "خزاں" آگئی، مدارس اور خانقاہیں ویران اور بے چراغ ہو گئیں، شخصی حلقہ ہائے درس ٹوٹ پھوٹ گئے، علمی مجلسیں درہم برہم ہو گئیں، علماء اور اساتذہ جو اب تک فکر معاش سے مطمئن اور بے فکر ہو کر درس و تدریس میں مصروف تھے منتشر اور پراگندہ ہو گئے، مدارس اور درسگاہوں پر موت کا سناٹا چھا گیا، برک اپنی اس یادداشت میں جو برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کی گئی تھی لکھتا ہے کہ:-

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۲۵۴ و ص۲۵۵ [2] ایضاً [3] ایضاً ص۲۵۲

"ان مقامات میں جہاں علم کا چرچا تھا اور جہاں دور دور سے طالب علم پڑھنے آتے تھے آج وہاں علم کا بازار ٹھنڈا پڑ گیا ہے"[1]

مگر ان حوادثات کے باوجود بھی ہندوستان میں کچھ ایسے سخت جان علماء موجود تھے جن کا علمی فیضان کسی مالی اعانت و امداد کا چنداں محتاج نہ تھا، دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کا خاندان اور لکھنؤ میں ملا نظام الدین کا گھرانہ اور خیرآباد کا مشہور علمی خانوادہ سینکڑوں میں چند مثالیں ہیں، ایسے حضرات ہر قسم کے حوادث و مصائب سے بے نیاز ہو کر اپنے کام میں مصروف تھے کہ ۱۸۵۷ء کی دارو گیر کا قیامت خیز ہنگامہ پیش آگیا، گنے چنے علماء جو باقی رہ گئے تھے ان پر برطانوی گورنمنٹ نے بغاوت کا جرم عائد کر دیا پھانسیاں دی گئیں، کالے پانی بھیجے گئے یا جلاوطن کر دئے گئے جو بچے ان میں سے اکثر ممالک اسلامیہ کو ہجرت کر گئے، حضرت شاہ عبد الغنی صاحبؒ جو اس وقت ولی اللّٰہی مسند علم کے جانشین تھے مکہ مکرمہ چلے گئے۔

۱۸۳۸ء میں اوقاف کی ضبطی سے قدیم مدارس کو جو عظیم نقصان پہنچا تھا، انیس سال بعد ۱۸۵۷ء کے حادثہ نے اس کی تکمیل کر دی، اب رہا سہا تعلیمی نظام بھی درہم برہم ہو گیا، اور ع

الیسا مٹا چمن کہ نشاں تک نہیں رہا!!

عیسائی مبلغین کے جارحانہ حملے قدیم مدارس کی تباہی کے ساتھ کمپنی کی حکومت نے جو تعلیمی نظام جاری کیا وہ مسلمانوں کے لئے بے حد مایوس کن تھا، ۱۸۱۳ء کے ایک قانون کے ذریعہ یورپ کے پادریوں کو ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کے لئے مشن اسکول کھولنے کا موقع ہاتھ آگیا، ان اسکولوں نے پادریوں کی ہندوستان میں آمد و رفت، قیام اور تبلیغ و اشاعت میں بڑی مدد پہنچائی، اور مسیحیت کے مبلغوں کا ایک سیلاب امنڈ آیا، انھوں نے شہروں سے لے کر دیہات تک عیسائیت کی تبلیغ کا جال پھیلا دیا، یہ لوگ صرف اپنے مذہب کے فضائل و محاسن بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق ایسا لٹریچر شائع کرتے تھے جس میں ہندوستان کے مذاہب اور بالخصوص اسلامی تہذیب

---

[1] بحوالہ مسلمانوں کا نظام تعلیم جلد اول ص ۲۹۲

اور اسلام کی تعلیمات کا مذاق اڑایا جاتا تھا، پیغمبر اسلام اور مسلمان بادشاہوں اور بزرگوں کی توہین و تذلیل کی جاتی تھی، ان کوتاہ نظروں کا مقصد غالباً یہ تھا کہ سیاسی زوال کے بعد مسلمان ہمت و حوصلہ اور بلند نظری سے محروم ہو گئے ہیں اس لئے اس موقع پر اگر ان کے سامنے عیسائیت کے محاسن و فضائل اور ان کے اپنے مذہب اسلام کے معائب بیان کئے گئے تو بہت ممکن ہے کہ مسلمان اپنے مذہب کو خیرباد کہہ کر مسیحیت اختیار کر لیں اور انگریزوں کو ہندوستان پر اطمینان سے حکومت کرنے کا موقع مل جائے، مشہور و معروف پادری فنڈر کی سرگرمیاں اس جماعت میں بہت نمایاں تھیں، مولانا فضل حق خیرآبادی جن کو فتویٰ جہاد ۱۸۵۷ء کے جرم میں عبور دریائے شور کی سزا دی گئی تھی، اپنے زمانہ اسارت کی تصنیف ثورۃ الہندیہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"انھوں (انگریزوں) نے تمام باشندگان ہند کو کیا امیر، کیا غریب، چھوٹے بڑے، مقیم و مسافر، شہری و دیہاتی سب سب کو نصرانی بنانے کی اسکیم بنائی، ان کا خیال تھا کہ ان کو نہ تو کوئی مددگار و معاون نصیب ہو سکے گا اور نہ انقیاد و اطاعت کے سوا سرتابی کی جرأت ہو سکے گی، انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں سے باشندوں کا اختلاف تسلط و قبضہ کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا، اس لئے پوری جانفشانی اور تندہی کے ساتھ مذہب و ملت کے مٹانے کے لئے طرح طرح کے مکر و حیلہ سے کام لینا شروع کیا، انھوں نے بچوں اور ناسمجھوں کی تعلیم اور اپنی زبان و دین کی تلقین کے لئے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کئے، پچھلے زمانہ کے علوم و معارف اور مدارس و مکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی"[1]

سر سید مرحوم جیسا شخص جس نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں انگریزوں کی حمایت و اعانت میں بیش از بیش حصہ لے کر انگریزوں سے اپنی وفاداری کو غیر مشکوک بنا لیا تھا وہ بھی اس ہنگامہ کے اسباب میں ایک بڑا سبب انہی پادریوں کی علانیہ اور خفیہ ریشہ دوانیوں کو قرار دیتا ہے، چنانچہ سر سید مرحوم اسباب بغاوت ہند میں لکھتے ہیں کہ :-

"سب کو یقین تھا کہ گورنمنٹ علانیہ مذہب بدلنے پر مجبور نہیں کرے گی، البتہ خفیہ تدبیریں کر کے جس طرح عربی

---

[1] الثورۃ الہندیہ ص ۳۵۶ و ۳۵۷ مطبوعہ مدینہ پریس

اور سنسکرت کو فنا کر دیا ہے اسی طرح ملک کو مفلس اور جاہل بنا کر اور اپنے مذہب کی کتابیں اور وعظ و
تبلیغ کے ذریعہ نوکریوں کا لالچ دے کر لوگوں کو بے دین کر دے گی ۔

۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی بنائے گئے وہ شمالی مغربی اضلاع میں گورنمنٹ
کے طرز عمل کے لئے ایک نمونہ گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو اس طرح سے مفلس و محتاج کر کے
اپنے مذہب میں لے آئیں گے، جیسے جیسے گورنمنٹ کی فتوحات زیادہ ہوتی تھیں ہندوستانیوں
کو رنج ہوتا تھا کیونکہ ان کو یقین تھا کہ جب کسی دشمن اور ہمسایہ حاکم کے مقابلہ اور فساد کا اندیشہ نہ رہے گا
تو ہمارے مذہب اور رسم و رواج میں کھلے بندوں مداخلت کی جائے گی، سب جانتے تھے کہ گورنمنٹ
نے پادریوں کو مقرر کیا ہے، ان کو تنخواہ دی جاتی ہے، تقسیم کتب اور دیگر اخراجات کے لئے بڑی بڑی
رقمیں دی جاتی ہیں، حکام شہر اور افسران فوج ماتحتوں سے مذہبی گفتگو کرتے اور اپنی کوٹھیوں پر بلوا کر
پادریوں کا مذہبی وعظ سنواتے تھے، غرضیکہ اس بات نے یہاں تک ترقی کی تھی کہ کوئی نہیں جانتا تھا
کہ گورنمنٹ کی عملداری میں ہمارا یا ہماری اولاد کا مذہب قایم رہے گا، اکثر مذہب کی کتابیں بطور سوال
و جواب مفت تقسیم کی جاتی تھیں جن میں دوسرے مذاہب پر اعتراضات اور رکیک حملے ہوتے
تھے، پادری غیر مذاہب کے مجامع میں جا کر وعظ کہتے تھے اور کوئی شخص حکام کے ڈر سے کچھ کہہ نہ
سکتا تھا، بسا اوقات چپراسیوں کو اپنے ہمراہ لے جاتے تھے، بہت سے مشنری اسکول قائم کئے گئے
ان میں مذہبی تعلیم شروع کی گئی، بڑے بڑے حکام ان اسکولوں میں جاتے اور دوسروں کو ان میں شامل
ہونے کی ترغیب دیتے، امتحان مذہبی کتابوں میں لیا جاتا، مذہبی سوالات کے جوابات اگر عیسائی مذہب
کے مطابق دئے جاتے تو نو عمر بچوں کو انعامات ملتے لوگ مجبوراً اپنے بچوں کو ان اسکولوں میں داخل
کراتے کیونکہ ان کی حد سے زیادہ مفلسی اور محتاجی نے اولاد کی تعلیم کے لئے ان اسکولوں کے علاوہ
اور کوئی ذریعہ باقی نہ رکھا تھا، جس کے بعد وہ بسر اوقات کی شکل نکال سکتے،

دیہاتی مکاتب نے یہ یقین اور بھی زیادہ مضبوط کر دیا تھا کہ ان کا مقصد صرف عیسائی بنانا ہے،
انسپکٹر اور ڈپٹی انسپکٹر کو کالا پادری کہتے تھے، یہ لوگ افسران بالا کو خوش کرنے کے لئے زبردستی

بچوں کو ان مکاتب میں داخل کراتے دراں حالیکہ بچوں کے ماں باپ کو یقین ہوتا تھا کہ یہ عیسائی بنائے جانے کا جال ہے، انھی کالے پادریوں کے سرٹیفکیٹ پر ملازمت مل سکتی تھی،

۱۸۵۵ء میں پادری ایڈمنڈ نے کلکتہ سے عموماً لوگوں کے پاس اور سرکاری ملازمین کے پاس خصوصاً خطوط بھیجے جن کا مطلب یہ تھا کہ اب تمام ہندوستان میں عملداری ایک ہوگئی، اس لئے آپ کو بھی صرف ایک مذہب عیسائی میں داخل ہوجانا چاہیئے۔

ان خطوط کے آنے سے سب پر دہشت طاری ہوگئی، خوف کے مارے آنکھوں میں اندھیرا آگیا، سب کو یقین ہوگیا کہ ہندوستانی جس چیز کے منتظر تھے آخر وہ آہی گئی، اب سارے سرکاری ملازمین کو عیسائی بننا پڑے گا، سرکاری ملازم شرم کی وجہ سے ان خطوط کو چھپاتے پھرتے تھے کیونکہ ان کے دوست واحباب ان کو طعن دیتے تھے، اور یقین کرتے کہ سرکاری ملازموں کو ایک دن کرشان بننا پڑے گا۔"[۱]

لارڈ میکالے نے جو ۱۸۳۵ء کی تعلیمی کمیٹی کے صدر تھے اپنی رپورٹ میں ہندوستان کے آئندہ تعلیمی نظام کی بنسبت لکھا تھا کہ :-

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہمارے اور ہماری رعایا کے درمیان مترجم کا کام دے سکے، اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق، رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔"[۲]

غرض کہ ایک طرف تو پادریوں کی تبلیغی سرگرمیاں جاری تھیں، مشن اسکول کھولے جارہے تھے جن میں حصول تعلیم کے لئے سہولتیں مہیا کی جاتی تھیں، کمپنی کے حکام پشت پناہ تھے اور ہر قسم کی امداد واعانت بہم پہنچاتے تھے، سب سے بڑھکر یہ کہ ملازمتوں کا لالچ تھا ــــــ دوسری طرف کمپنی کی اسکیم یہ تھی کہ ہندوستان کے بسنے والوں بالخصوص مسلمانوں کو جاہل اور مفلس بنا کر (جس کے لئے طرح طرح کے جائز وناجائز ذرائع اختیار کئے جاتے تھے) اور ملازمتوں کے حصول کی ترغیب

---

[۱] ملخص رسالہ اسباب بغاوت ہند مصنفہ سرسید احمد خاں [۲] تاریخ تعلیم از میجر باسو ص ۱۰۵ بحوالہ روشن مستقبل طبع چہارم ص ۱۳۱

دلاکر مشن اسکولوں میں تعلیم پانے پر مجبور کردیا جائے جو اس وقت عیسائیت کی تبلیغ کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھے جاتے تھے، اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ مسلمانوں کے علوم اور ان کا مذہبی شغف تھا، اس کے لئے ۱۸۳۵ء کا تعلیمی نظام مرتب کیا گیا جس کی روح لارڈ میکالے کے نزدیک یہ تھی کہ "ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہو مگر فکر اور عمل کے اعتبار سے عیسائیت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو"

انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب کا یہ دوسرا حربہ کوئی شبہ نہیں کہ پہلے حربہ سے کہیں زیادہ کامیاب تھا، ظاہر ہے کہ کمپنی کی یہ اسکیم اور اس کا یہ تعلیمی نظام مسلمانوں کی مذہبی زندگی قومی روایات اور علوم و فنون کے لئے سخت تباہ کن اور مہلک ترین حربہ تھا، جس کو قبول کرنے کے لئے وہ کسی طرح تیار نہ ہو سکتے تھے، اور ابھی تک وہ اپنی مذہبی زندگی اور قومی شعور کو برقرار رکھنے کا کوئی حل سوچ نہ سکے تھے کہ اسی دوران میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ پیش آگیا جس کی بے پناہ تباہ کاریوں اور ہولناکیوں نے دلوں کو ہیبت زدہ، دماغوں کو ماؤف اور روحوں کو پژمردہ کر دیا، پوری قوم پر جمود، بے حسی اور مایوسی کی گھٹائیں چھا گئیں، حاکمانہ عظمت و اقتدار اور دولت و شوکت کا خاتمہ ہو چکا تھا، اور ان کی جگہ باقی السیئات نے قوم پر قبضہ جما لیا تھا، مسلمان ذرائع معاش سے یکسر محروم کر دیئے گئے تھے، عادات قبیحہ روز بروز ان میں جڑ پکڑ رہی تھیں اور قوم کی قوم تباہی کے غار میں گرتی چلی جا رہی تھی، تعلیم سے بے رغبتی اور مذہب سے بے گانگی میں روز افزوں اضافہ تھا اپنی قوت و حیثیت کا احساس فنا ہوتا جا رہا تھا ادھر پادریوں کی تبلیغی سرگرمیوں نے حالات کو اور زیادہ تشویشناک بنا دیا تھا اور وہ زمانہ بہت قریب تھا کہ علماء کی وہ نسل جو سابقہ درس گاہوں کی تعلیم یافتہ تھی رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی،

یہ حالات تھے جن میں ہمارے مفکرین اور ارباب علم و فضل کو یہ محسوس کرنا پڑا کہ سیاسی زوال وانحطاط اور حکومت سے محرومی کے ساتھ مستقبل میں مسلمانوں کا علم و مذہب اور قومی زندگی سخت خطرے میں ہے، وہ تاریخ کے اس فیصلے سے باخبر تھے کہ جب کسی قوم نے کسی ملک کو فتح کیا اور اس ملک کے باشندوں پر سیاسی غلبہ اور تسلط پایا ہے تو فاتح قوم کے اثرات و خصائص مفتوح قوم

کے جسموں تک محدود نہیں رہتے بلکہ مفتوح قوم کے دل و دماغ اور علم و فکر بھی مسخر ہو جاتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفتوح قوم اپنے ملی شعائر، قومی خصائص اور فکر و عمل کو نہ صرف یہ کہ خیرباد کہہ دیتی ہے بلکہ "الناس علی دین ملوکھم" کے اصول اور مدت تک جذب و کشش کا مسلسل عمل جاری رہنے کے باعث وہ آخرکار اپنی روایاتِ قدیم اور فکر و عمل سے نفرت کرنے لگتی ہے اور اس کے لئے صرف فاتح قوم کی نقالی اور کورانہ تقلید و اتباع ہی سرمایۂ افتخار رہ جاتا ہے!

اس امر کے سدباب کے لئے اس وقت تعلیم کے سوا کوئی اور ایسی چیز باقی نہیں رہ گئی تھی جس کے ذریعہ سے مسلمان اپنے مذہبی شعائر اور قومی زندگی کا تحفظ کر سکتے اور مغلوب و محکوم ہونے کے باوجود بحیثیت مسلمان زندہ رہ سکتے، جہاں تک نفس تعلیم کے مسئلہ کا تعلق ہے اس میں تمام ارباب فکر متفق تھے لیکن طریق تعلیم میں اختلاف تھا، علمائے کرام کی رائے تھی کہ مسلمانوں کو صرف اسلامی علوم و فنون کی تعلیم دی جائے جس کے ذریعہ وہ آئندہ اپنے قومی شعور کو برقرار رکھ سکیں ——

اس کے برخلاف دوسرے طبقہ کے نزدیک حکومت متسلطہ کی زبان اور علوم و فنون کا پڑھنا ضروری تھا تاکہ اس کے ذریعہ سے ملک میں منصب اور عہدے حاصل کئے جا سکیں۔[1] یہ رائے حکومت کی مقرر کردہ پالیسی سے قریب تھی۔ دونوں گروہ اپنی جگہ کامیاب ہوئے اسلامی فنون کے لئے قدیم مدارس کی نشاۃ ثانیہ کو ضروری سمجھا گیا اور اس مقصد کے لئے مدارس عربیہ قائم کئے گئے اور ملکی عہدوں اور منصبوں کے حصول کے لئے اسکول اور کالجوں کا رخ اختیار کیا گیا۔

---

[1] اس سے قبل تک ہندوستان میں جو تعلیمی نظام رائج تھا اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دینی علوم کے ساتھ ساتھ بڑے سے بڑے ملکی اور فوجی منصب کے لئے طلبا کو تیار کرتا تھا، حتی کہ ان ہی مدارس کے تعلیم یافتہ طلباء وزارت اور حکمرانی کے فرائض تک نہایت عمدگی اور قابلیت کے ساتھ انجام دیتے تھے اور وہی شخص جو علوم دینیہ پر دسترس رکھتا تھا بڑے سے بڑے ملکی اور انتظامی منصب کے لئے اسی کی ضرورت پیش آتی تھی!

جدید نظام تعلیم کے جاری ہونے سے مسلمانوں کے تعلیمی نظام میں "قدیم" و "جدید" کے نام سے دو علمی طبقے پیدا ہو گئے، جس سے علم اور فکر و نظر کی سابقہ وحدت ختم ہو گئی، اور قدیم طرز پر تعلیم پانے والے مملکتی انتظام و مسائل اور تمام ملکی عہدوں اور منصبوں سے محروم ہو گئے، اب تمام منصب و عہدے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پانے والوں کے لئے مخصوص ہو گئے

مسلمانوں کے لئے قدیم و جدید اور دینی و دنیوی علوم کی یہ تفریق "مفید" ثابت ہوئی یا "مضر" آج اس فیصلہ کے لئے ایک پوری صدی کے

آواز کی کہانی

از

(جناب پروفیسر محمد نصیر احمد صاحب عثمانی ایم۔ اے۔ بی۔ ایس۔ سی

سابق ریڈر طبیعیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

ریڈیو کی بدولت موجوں سے آج کل ہر شخص واقف ہوگیا ہے اور یہ بھی ہر شخص جانتا ہے کہ ریڈیو میں آواز کو بہت اہمیت حاصل ہے کیونکہ ہم ریڈیو سے آواز ہی کو سنتے ہیں۔ یہ برقی موجوں کے کاندھوں پر ہم تک پہنچتی ہے۔ لہذا ذرا آواز کی کتھا بھی سن لیجئے۔

نطق یا گویائی ہی انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔ انسان کا بچہ اپنی آمد کا اعلان آواز سے ہی کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ موسیقی نہایت قدیم زمانے سے انسانوں میں مقبول رہی ہے لیکن چونکہ ان لوگوں نے کوئی نوشتے نہیں چھوڑے اس لئے ہم کو یونانیوں ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ان لوگوں نے بہت سے نوشتے اور یادگاریں چھوڑی ہیں۔

اس سے یہ تو ظاہر ہوا کہ فن موسیقی بہت قدیم ہے لیکن علم آواز یا صوتیات (ACOUSTICS) اس قدر قدیم نہیں ہے۔ کیونکہ گانا بجانا تو انسان کو صوتیات کا ایک حرف جانے بغیر آسکتا ہے لیکن اس کے باقاعدہ علم کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔

ہاں تو یونانیوں میں حکیم فیثا غورث گزرا ہے جس کا زمانہ ۵۸۰ تا ۵۰۰ ق م ہے اس نے موسیقی اور آواز پر بھی تحقیق کی۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک روز لوہار کی دکان سے گزر رہا تھا لوہار نہائی پر ہتھوڑا چلا رہا تھا۔ ہر ضرب پیدا آواز پیدا ہوئی۔ آواز میں سُر پیدا ہوا۔ فیثا غورث سر دھننے لگا۔ غور کیا۔ معلوم ہوا کہ پنچم بھی ہے اور سرگم بھی ہے۔ فکر ہوئی کہ تاروں سے ہی سر پیدا کئے جائیں تجربے کئے۔ نتیجہ میں معلوم

ہوا کے تاروں کے طولوں اور پیدا شدہ سروں کے درمیان ایک خاص رشتہ ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یونانی تجربے نہیں کیا کرتے تھے۔ اس لئے فیثا غورث نے بھی کوئی تجربے نہیں کئے بلکہ یہ سب خیالات وہ مصر سے لایا تھا۔ لیکن ایسے لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ موسیقی شروع ہی سے مذہب اور روحانیات سے وابستہ ہونے کی وجہ سے مقدس سمجھی جاتی رہی ہے لہذا اس کی خاطر لوگ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ بہر حال کچھ بھی ہو فیثا غورث نے قاعدے اور کلیے بیان کئے جن میں سے بعض آج بھی صحیح ہیں۔

ارسطو نے بھی آواز کی طرف توجہ کی۔ اس نے بتلایا کہ آواز ہوا میں ایک کیفیت ہے یعنی ہوا میں حرکت سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ اور نلیوں اور نلکیوں سے جو آوازیں پیدا ہوتی ہیں ان میں مدت دگنی لگتی ہے اگر نلی کے طول کو دگنا کر دیا جائے۔

یونانیوں کے بعد رومیوں کا زمانہ ہے اور چونکہ موسیقی اپنی جاذبیت کی وجہ سے ہر قوم اور ملک میں مقبول رہی ہے اس لئے رومیوں نے علمی حیثیت سے تو کوئی اضافہ کیا نہیں لیکن عملی حیثیت سے باجوں کے بنانے میں انھوں نے اچھی شہرت حاصل کی۔

عربوں نے بھی اپنے دور میں موسیقی کی طرف کافی توجہ کی۔ آلات موسیقی کی ایجاد میں انھوں نے اچھی مہارت بہم پہنچائی۔ دوسروں سے جو آلات موسیقی اخذ کئے ان کی اصلاح بھی کی اور خود نئے نئے آلات تیار کئے۔ چنانچہ ایک باجے کا نام "قانون" ہے جو آج بھی رائج ہے۔ مشہور بھی ہے کہ اس آلے کا موجد مشہور فلسفی ابو نصر فارابی تھا۔ اس کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے ایک باجا دو لکڑیوں کو ترکیب دے کر بنایا تھا ان کو مختلف طریقوں سے ملانے اور ایک کو دوسرے پر مارنے سے طرح طرح کے نغمے پیدا ہوتے تھے چنانچہ اس چوبی باجے کا یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ فارابی سیف الدولہ کی مجلس طرب میں جا پہنچا۔ وہاں اسے کوئی پہچانتا نہ تھا۔ اس نے مغنیوں کے عیب نکالنے اور اعتراضات کرنا شروع کئے۔ سیف الدولہ کو بڑی حیرت ہوئی۔ پوچھا کیا تم اس فن سے واقف ہو؟ یہ سن کر فارابی نے وہی دو چوبی باجا نکالا اور بجانے لگا۔ پہلی مرتبہ مجلس کے تمام لوگ بے اختیار ہنسنے لگے دوبارہ نئی ترکیب سے بجایا تو سب رونے لگے

تیسری مرتبہ ایک نئے انداز سے بجایا تو جتنے لوگ محفل میں تھے سب سو گئے۔ فارابی ان لوگوں کو اسی حال میں چھوڑ کر چلا آیا لیکن کہتے ہیں کہ اپنا باجا وہاں قصداً یا سہواً چھوڑ گیا۔ جب لوگ موسیقی کے تنویمی اثر سے آزاد ہوئے تو انھیں تلاش ہوئی کہ وہ مغنی کہاں ہے۔ انھیں باجے پر ابو نصر فارابی لکھا ہوا ملا۔ تب اُن کو معلوم ہوا کہ وہ ساحر کون تھا۔

ہندوستان میں بھی موسیقی کا بہت چرچا رہا اور ہے۔ لیکن ان سب قوموں میں موسیقی بہ حیثیت فن کے رہی۔ آواز کے علم یا صوتیات میں کچھ زیادہ کام نہ ہوا یعنی موسیقی کی سحر آفرینی کے اسباب و علل پر کم توجہ کی گئی۔

اب ذرا اس پر غور کیجئے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ آواز ایک موجی حرکت ہے تو اس سے مطلب کیا ہوتا ہے۔ موجی حرکت کی چند خصوصیات ہوتی ہیں وہ خصوصیات اگر آواز میں پائی جائیں تو آواز موجی حرکت ہوگی ورنہ نہیں۔ آیئے اس معیار سے آواز کو دیکھیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ موجی حرکت یا موجوں کے لئے ایک واسطے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ایک مشہور تجربہ ہے کہ کسی برتن میں سے ہوا نکال لی جائے تو برتن کے اندر کسی گھنٹی کی آواز سنائی نہیں دیتی۔

پھر یہ بھی ہر شخص جانتا ہے کہ موج کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانے کے لئے مدت درکار ہوتی ہے یعنی اس میں رفتار ہوتی ہے۔ آواز کی بھی رفتار ہے۔ جس کو ہر شخص دریافت کر سکتا ہے نیوٹن انگس کے لئے ایک نظری ضابطہ پیش کیا تھا اور عملی طور پر بھی رفتار دریافت کی تھی لیکن ضابطہ اور مشاہدے میں فرق آتا تھا جن کو نیوٹن دور نہ کر سکا۔ اس کو لاپلاس (Laplace) نامی فرانسیسی نے دور کیا

آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ پانی میں موجیں جب کنارے کی دیوار سے ٹکراتی ہیں تو پلٹ پڑتی ہیں اسی کو انعکاس کہتے ہیں۔ آواز میں انعکاس کی بہت سی مثالیں ہم کو ملتی ہیں۔ ریل کا انجن جب مکانوں کے قریب سے گزرتا ہے تو پختہ مکانوں سے آواز اس طرح منعکس ہوتی ہے کہ گاڑی مکان کے پیچھے چلتی معلوم ہوتی ہے۔ مکان کی پختہ دیوار گویا آواز کے لئے آئینہ ہے اس کے علاوہ گنبدوں سے جو گونج

سنائی دیتی ہے وہ بھی اسی انعکاس کا نتیجہ ہے۔

جب موج ایک واسطے سے ہوکر دوسرے واسطے میں جاتی ہے تو دونوں واسطوں کی درمیانی سطح پر وہ اپنا راستہ بدل دیتی ہے۔ اسی کو انعطاف (Refraction) کہتے ہیں۔ آواز میں بھی انعطاف ہوتا ہے لیکن وہ انعکاس نور کی طرح واضح نہیں ہے۔ یوں تو اس کے متعلق بہت سے تجربے انجام دئے جا سکتے ہیں لیکن ایک سادہ سا تجربہ ایسا ہے جسے ہر شخص انجام دے سکتا ہے وہ یہ کہ ایک فٹ بال لیا جائے اور اس میں اتنی ہوا بھری جائے کہ وہ گول گیند کی طرح نہ رہے بلکہ عدسہ (Lens) کی شکل میں آجائے اب اس کو آگے سے باندھ کر لٹکا دیا جائے۔ اس کے دونوں رخوں کے مرکزوں میں سے گذرنے والے خط کا اندازہ کر لیا جائے پھر فٹ بال کے ایک طرف ایک جیبی گھڑی لٹکائی جائے۔ اور دوسری طرف سے سنا جائے۔ تو معلوم ہوگا گھڑی کی ٹک ٹک ہر مقام پر نہ سنائی دے گی بلکہ مرکزی خط کے کسی خاص مقام پر ہی سنائی دے گی۔ یہ نتیجہ ہے انعطاف کا۔

لیکن اگر آپ اس تجربے کو انجام نہ دے سکیں تو پھر ایسا کیجئے کہ بستی کے باہر یا جنگل میں ایسے مقام پر جائیے جہاں پانی کا کوئی نالہ بہتا ہو جو اتنا چوڑا ہو کہ آپ آسانی سے اس کو عبور نہ کر سکیں پس اگر آپ ایک کنارے پر کھڑے ہوں اور دوسرے کنارے پر آپ کا دوست آپ کے مقابل ہو اور وقت صبح یا شام کا ہو تو اکثر ایسا ہوگا کہ آپ کی آواز دوست تک نہ پہنچے گی۔ البتہ اگر دوست دائیں یا بائیں ذرا ہٹ جائے تو پھر آواز صاف سننے لگتا ہے۔ یہ بھی آواز کا انعطاف ہے۔

موجیں کونوں کناروں پر سے مڑ جایا کرتی ہیں۔ یعنی اپنا راستہ بدل دیتی ہیں۔ آواز میں یہ صورت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کو انکسار (Diffraction) کہتے ہیں یہ ایک خاص صورت ہے۔ عام صورت یہ ہے کہ دو موجیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں تو دونوں موجوں کے برابر اور مخالف ہونے کی صورت میں نتیجہ سکون ہوگا اس کو تداخل (Interference) کہتے ہیں۔ یہی اصل معیار ہے اس بات کا کہ کوئی حرکت موجی ہے یا نہیں۔ اگر موجی حرکت ہے تو تداخل کا پایا جانا لازم ہے اور اگر موجیت نہیں ہے تو پھر تداخل بھی رونما نہیں ہو سکتا آواز کو دیکھئے تو دو آوازیں مل کر خاموشی پیدا کرتی ہیں لیکن اس کے لئے چند شرائط ہیں

وہ پوری ہو جائیں تو تداخل کے زیر اثر دو آوازوں سے بالکل خاموشی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا تجربہ آسان ہے مشکل نہیں۔

غرضکہ آواز چونکہ موجی حرکت ہے اور ایک واسطے میں ہو کر چلتی ہے تو واسطہ اگر ساکن ہو جائے تو پھر آواز کی اشاعت بھی نہ ہو گی۔ چنانچہ یہ تخیل ایک افسانے میں پیش کیا گیا ہے کہ قطب شمالی پر دو شخص بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کہ اتنے میں سردی کی شدت سے ہوا تقریباً ساکن ہو گئی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دوسرے کی بات کوئی سن نہ سکا۔ ایک ہفتہ کے بعد جب نسبتاً گرمی پیدا ہوئی تو ہوا حرکت میں آئی اور پھر وہ آواز سنائی دی۔ اس میں اصولاً کوئی امر خلاف نہیں ہے گو ایسا مشاہدہ ابھی ہوا نہیں تاہم آواز کی موجیت اس سے اچھی طرح نمایاں ہو جاتی ہے۔

آواز کی موجوں کے طول کا اندازہ یوں کیجئے کہ کوئی حرکت اگر ایک ثانیہ میں سولہ مرتبہ سے کم ہو تو پھر وہ آواز کی حیثیت سے سنائی نہیں دیتی اور آواز کی رفتار ایک ثانیہ میں ۱۱۲۰ فٹ ہے یعنی ۱۱۲۰ فٹ میں ۱۶ موجیں ہوئیں۔ پس ہر موج ۷۰ فٹ کی ہوئی اگر حرکت ایک ثانیہ میں ۲۰ ہزار مرتبہ سے زیادہ ہو تو بھی ہم کو آواز سنائی نہیں دیتی۔ ایسی موجوں کا طول ایک سنٹی میٹر سے بھی کم ہوتا ہے۔

سترھویں صدی اور اٹھارویں صدی میں آواز پر کام کچھ زیادہ نہیں ہوا۔ اس کا باقاعدہ مطالعہ تو سمجھا جاتا ہے کہ انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوا ہے۔ سترھویں صدی میں نیوٹن نے کچھ کام کیا تھا۔ اور اٹھارھویں صدی میں بھی تھوڑا ہی کام ہوا۔ موسیقی کی طرف توجہ فی الواقع زیادہ رہی۔ لیکن اس کو طبعیات کی شاخ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ سائنس اور طبعیات میں آواز کا صحیح مقام کلیڈنی (Chladni) کا رہین منت ہے۔ اس کا زمانہ ۱۷۵۶ - ۱۸۲۷ ہے۔ اس لئے اس کو صوتیات کا باوا آدم کہتے ہیں اس نے موجوں اور موجی حرکت کا اچھی طرح مطالعہ کیا یہاں تک کہ تختیوں اور جھلیوں کی حرکت بھی دریافت کی اگر آپ گول یا چوکور تختی شیشے یا دھات کی لے لیں اور بیچ میں کس کر اس پر دانہ دار ریت بکھیر دیں تو سارنگی کے گز سے تختی کو رگڑنے پر ریت نہایت دلآویز شکلوں میں ترتیب پاتی ہے۔ یہی مشہور و معروف کلیڈنی کی شکلیں ہیں۔ اسی طرح دو حرکتوں کو ملانے سے جو شکلیں پیدا ہوتی ہیں لساجو (Lissajous) نے

ان کا مطالعہ کیا وہ لسا جو کی شکلیں کہلاتی ہیں۔ جرمنی کے ہلمہولٹس (Helmholts) نے موسیقیت وغیرہ پر کافی کام کیا اور نظریے قایم کئے۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن لوگوں نے سمجھا کہ آواز پر کام بہت ہوگیا ہے اب زیادہ کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ لہذا ایسا معلوم ہونے لگا کہ لوگوں نے اپنے کان بند کر لئے ہیں اور آواز کی کہانی سننا نہیں چاہتے لیکن آواز اس پر خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔ ۱۹۱۴ میں جنگ عظیم برپا ہوئی۔ آواز کی چیخیں سنائی دینے لگیں فضا میں چیل گاڑیاں یعنی ہوائی جہاز اڑنے لگے۔ پانی کے اندر مچھلی گاڑیاں یعنی آبدوز کشتیاں چلنے لگیں۔ آواز سن کر دشمن کے ہوائی جہاز کا مقام معلوم کرنا۔ آبدوز کشتی میں بیٹھ کر سطح کے جہازوں کی آوازیں سن کر ان کا مقام دریافت کر لینا۔ غرض یہ اور اسی طرح کے جنگی مسائل نے آواز کے مطالعہ پر مجبور کر دیا چنانچہ ایسے تمام مسائل کی تحقیق کی گئی اور ان کو حل کیا گیا اور اب جو جنگ ختم ہوئی ہے اس میں ان مسائل کے علاوہ دیگر فوجی مسائل بھی کامیابی سے حل کئے گئے۔

چونکہ جنگ ختم ہو چکی ہے لہذا ہم بھی رزم کو چھوڑ کر بزم میں آتے ہیں۔ اب یہاں دیکھئے کہ بڑے بڑے شہر آباد ہوئے۔ تیز رفتار اور تیز آواز سواریاں چلنے لگیں۔ ان سے شور پیدا ہوا۔ جس نے دماغوں کو متاثر کیا۔ دماغی امراض بڑھ گئے۔ لہذا شور کی تحقیق کی گئی اور اس کے اثرات کم کرنے کی تدبیریں سوچی گئیں۔

آواز کی موجی نوعیت کو واضح کرنے کے لئے آلہ اہتزاز نگار (oscellograph) کی مدد سے آواز اب دیکھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ دوران جنگ کی جنگی نمائش میں یہ آلہ دکھلایا گیا تھا ہر شخص اس آلے کے سامنے بولتا تو آلے کی تختی پر اس آواز کی موجی نوعیت نمایاں ہو جاتی خود انسانی آواز پر تحقیق کی گئی کیونکہ آواز پیدا کرنے کے جاندار ذرائع میں سے یہی بہت اہم ہے بے جان ذرائع بالخصوص برقی ذرائع سے کام لے کر آواز کا تعدد بہت بڑھا دیا گیا۔ یہاں تک کہ ایک ثانیہ میں ۲۰ ہزار یا زیادہ حرکتیں پیدا ہونے لگیں۔ اب جو موجیں پیدا ہوئیں وہ بھی آواز کی موجیں ہیں ان ہی کو بالا صوتی موجیں (ultrasonic) (supersonic waves) کہتے ہیں یہ سنائی نہیں دیتیں لیکن حشرات کو ہلاک کر دیتی

ہیں چنانچہ دودھ میں سے ان کو گزارا جائے تو دودھ جراثیم سے پاک ہو جاتا ہے۔ ان کے متعلق بھی کافی کام ہو رہا ہے۔

ساتھ ہی عمارتی صوتیات پر بھی تحقیق کی گئی۔ اب معلوم ہوا کہ بعض پرانی عمارتیں اس نقطۂ نظر سے اچھی نہیں ہیں کیونکہ کسی بڑے ہال میں کسی مقرر کی آواز کو ہال کے تمام گوشوں میں یکساں پہنچنا چاہیے گو آلۂ مکبر الصوت (Loud speakers) کی بدولت یہ دقت ایک حد تک رفع کی گئی ہے۔

بہرحال یہ مختصر سی روداد ہے آواز کی جو امید ہے کہ سمع خراش نہ ہوئی ہوگی۔

اخلاق و فلسفۂ اخلاق

مکمل اور جدید ایڈیشن

علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب، جس میں تمام قدیم و جدید نظریوں کو سامنے رکھ کر اصولِ اخلاق، فلسفۂ اخلاق اور انواعِ اخلاق پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور اس کے لئے ایک مخصوص اسلوبِ بیان اختیار کیا گیا ہے اسی کے ساتھ اسلام کے نظامِ اخلاق کی تفصیلات کو ایسی دل پذیر ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے مجموعۂ اخلاق کی فضیلت تمام ملتوں کے اخلاقی نظاموں کے مقابلے میں روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے، فی الحقیقت ہماری زبان میں اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں تھی۔ جس میں ایک طرف علمی اعتبار سے اخلاق کے تمام گوشوں پر مکمل بحث ہو اور دوسری طرف ابوابِ اخلاق کی تشریح علمی نقطۂ نظر سے اس طرح کی گئی ہو کہ اس سے اسلام کے مجموعۂ اخلاق کی برتری دوسری ملتوں کے ضابطہائے اخلاق پر ثابت ہو جائے اس کتاب سے یہ کمی پوری ہو گئی ہے اور اس موضوع پر ایک معیاری کتاب سامنے آگئی ہے، اس ایڈیشن میں بہت کچھ حک و فک کیا گیا ہے اور متعدد مباحث کو نئے سرے سے مرتب کیا گیا ہے، حجم بھی پہلے سے کافی بڑھ گیا ہے صفحات ۵۹۲ بڑی تقطیع قیمت غیر مجلد چھ روپے آٹھ آنے ۶/۸، مجلد سات روپے آٹھ آنے ۷/۸

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

ملاحظاتِ ادبیّہ

از

(جناب مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی لکچرر تاریخ مدرسہ عالیہ کلکتہ)

اس مضمون کا تعلق ہندوستان کے جلیل القدر ادیب مولانا عبد العزیز میمنی مدظلہ کے شائع کردہ مجموعۂ قصائد و منظومات عرب الطرائف الادبیۃ سے ہے، یہ مجموعہ مولانا کا وہ خاص تحفہ ہے جسے آپ نے اپنی علمی سیاحت سے واپسی پر حلقۂ ارباب علم و ادب میں پیش کیا تھا اس کی طباعت آج سے پندرہ برس پیشتر سنہ ۱۹۳۷ء میں لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر کے روح رواں احمد امین کے خاص اہتمام سے ہوئی تھی؛ الطرائف کے دو حصے ہیں ان میں سے القسم الاول دیوان الافوہ اودی دیوان شنفریٰ ازدی و دیگر متعدد قصائد فرائد پر مشتمل ہے؛ اعظم گڈھ کے موقر مجلہ معارف اور کلکتہ مدرسہ میگزین بابتہ ماہ مئی سنہ ۱۹۵۱ء کے القسم العربی میں اسی حصہ کی ایک نظم "قصیدۃ العروس" کے متعلق راقم السطور کے مضامین شائع ہو چکے ہیں پیش نظر مضمون میں بھی القسم الاول ہی سے متعلق چند باتیں ذیل میں پیش کی جائیں گی؛

مجھے مولانا موصوف کی کتابوں سے بے حد شغف اور ان کے ٹھوس ادبی خدمات سے والہانہ عقیدت ہے ذیل کی سطریں یا پیشتر جو مضامین شائع ہو چکے ہیں ان کے پس پردہ دراصل یہی عقیدت کارفرما ہے الطرائف میں بہتیرے ایسے مقامات ملتے ہیں جن کی تصحیح نہیں کی گئی اور ان مقامات پر "کذا" "کذا فی الاصل" یا سوالیہ نشانات کے ذریعہ تنبیہ کر دی گئی ہے جیسا کہ عصر حاضر کے محققین و مصححین کا طریقہ ہے، ان مقامات میں سے بعض کی تصحیح کی صورت میرے ذہن میں بھی آئی چنانچہ سطور آئندہ میں پوری تفصیل ملے گی؛ الطرائف کے ذیول و حواشی نہایت قیمتی اور پر از معلومات ہیں لیکن بعض مراجع کی مدد سے منکشف ہوا کہ شاید اختصار پسندی کی بنا پر مولانا نے بعض روایتی اختلافات کو نظر انداز کر دیا ہے، ان

میں سے بعض اہم لفظی اختلاف کی تصریح ضروری معلوم ہوئی، اسی طرح چند تصحیفات کی تصحیح کی بھی جرأت کی گئی ہے۔

الفراع | الطرائف ص ۴۶، شطر ۹۵ ابو النجم العجلی:

طَاوِيَةً جَنْبَیْ فُرَاعٍ عَثْجَلِ

میری گفتگو کا تعلق لفظ (فُرَاعٌ) بالعین سے اس لفظ کی تفسیر شرح میں اس طرح کی گئی ہے:۔

الفراع حوض من ادم اھ مولانا نے کتب لغت کی طرف مراجعت فرمائی پر اس لفظ کا سراغ حوض کے معنی میں کہیں نہیں ملا چنانچہ حاشیہ میں فرماتے ہیں:۔ قولہ الفراع حوض، لا اعرفہ، وفی مستدرکات التاج الفراع بالکسر ما علا من الارض وارتفع جمعہ فرعۃ اھ (تعلیق ۹۵)

اصل یہ ہے کہ "فراع" بالعین حوض یا برتن کے معنی میں عربی زبان میں کہیں نہیں آیا اور اس لفظ کے مادہ کو حوض کی خصوصیت معنوی سے کوئی مطابقت ظاہری نہیں، (فراع) اپنے مادہ کے اعتبار سے ارتفاع و علو کے معنی بتاتا ہے اور حوض کے لئے خلاء، وسعت اور گہرائی ضروری ہے لہذا (فراع) اور اس کی تفسیر مذکورۂ بالا میں تطبیق کی صورت ممکن ہی نہیں کہ حوض کے معنی پر دلالت کرے، حوض کی معنوی خصوصیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس لفظ کے اصل قالب تک پہنچ سکتے ہیں، لفظ (فراع) کو اس قالب سے بڑی مشابہت ہے البتہ ان دونوں میں ایک نقطہ کا فرق ہے ایسی صورت میں کتابت کی تصحیف عام طور پر پائی جاتی ہے اس ایک نقطہ کے اضافہ سے حوض کے معنی ظاہر کرنے کے لئے جس قالب کا تعین ہو سکتا ہے (فَرَاغٌ) بالغین المعجمہ ہے نہ کہ (فراع) بالعین، اب اصولِ لغت کی مراجعت کی جائے تو اس خیال کی تصدیق ہو جائے گی، لفظ کی صحیح صورت میرے ذہن میں جس طرح آئی ہے کم و کاست اسی طرح بیان کر دینا مناسب معلوم ہوا ورنہ اس تطویل کی ضرورت ہی کیا تھی:

اب آپ کے سامنے نص لغوی بھی پیش کئے دیتا ہوں۔

صاحب لسان نے مشہور امام لغت اصمعی کے حوالہ سے (الفراغ) کے معنی (حوض من ادم) نقل کئے ہیں اور اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اصمعی نے استشہاد میں ابو النجم کے اسی شطر کو

پیش کیا ہے اصل عبارت حسب ذیل ہے:

عن الاصمعی: الفراغ حوض من ادم واسع ضخم قال ابو النجم:

طاف بہ جنبی فراغ عثجل

ویقال عنی بالفراغ ضرعہا انہ قد جف ما فیہ من اللبن فتغضن اھ (لسان ج ۱۰/۳۴۸)

لفظ کی صحیح صورت معلوم کر لینے کے بعد شاید اس تصریح کی ضرورت نہ سمجھی جائے کہ (ف) کو کسرہ کی حرکت ہوگی نہ کہ ضمہ کی، تاہم مزید توثیق کے خیال سے قاموس کی یہ عبارت پیش کی جاتی ہے "کتاب العدل من الاحمال، وحوض واسع ضخم من ادم والاناء اھ (ف رغ)

اس شعر کا لفظی اختلاف بھی ملحوظ رہے کہ الطرائف میں (طاویۃ) اور لسان العرب میں (طاف بہ) ہے لسان کی روایت اصل کی تصحیف پر مبنی ہے، ورنہ روایت صحیحہ (طاویۃ) ہے تاج العروس کی روایت بھی یہی ہے (ج ۶/۲۶) لسان کے مصحح نے (طاف بہ) کے متعلق "کذا فی الاصل" کہہ کر تاج کی روایت کو مناسب قرار دیا ہے غور کیا جائے تو (طاویۃ) کا (طاف بہ) کی شکل اختیار کر لینا کاتب کی ادنیٰ بے توجہی سے ممکن ہے، مخطوطات کی تصحیح کرنے والے جانتے ہیں کہ ناسخین کی ستم ظریفی صحیح الفاظ کو اس سے زیادہ عجیب و غریب ہیئت عطا کرتی ہے! تاج میں شعر ۹۲ بھی موجود ہے!

<u>عن</u> الطرائف ص ۲۸: عدی بن الرقاع کے بیت ۳ کی شرح میں ذیل کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

قال ابو یوسف: سمعت ہشاما المکفوف یحکی عن ابی عمرو عن الاصمعی (کذا) وکذا الک الاداوۃ مضمومۃ مثل النحاز الرداع والقلاعب قال ابو عمرو وھو السواف بالفتح اھ

اس عبارت کی تصحیح میں مولانا نے بین القوسین المربعین حرف [عن] بڑھایا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور مشکل پیش آگئی جس سے تقصّی کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو ہلالین کے درمیان (کذا) کا اضافہ کر دیا! مجھے یقین ہے کہ جو مشکل ان کو پیش آئی وہ دراصل حرف (عن) کے اضافہ سے پیدا ہوئی: لسان میں یہی عبارت زیادہ مکمل طور پر موجود ہے اس کی عبارت پیش نظر ہو تو تصحیح کی صورت

ظاہر ہو جائے گی لہذا عبارت نقل کی جاتی ہے۔

قال ابن السکیت: سمعت هشاما المکفوف یقول لأبي عمرو إن الأصمعي یقول: السواف بالضم ویقول الأدواء کلها جاءت بالضم نحو النحاز والدکاع والزکام والقلاب والخمال قال أبو عمرو هو السواف بالفتح اھ (لسان ج ۱۱/۶۶ سوف)

میرے خیال ناقص میں مذکورہ بالا عبارت کی روشنی میں تصحیح اس طرح ہونی چاہیے:

قال أبو یوسف: سمعت هشاما المکفوف یحکي لأبي عمرو عن الأصمعي [یقول السواف بالضم] وکذالک الأدواء مضمومة الخ ابو یوسف اور ابن السکیت کے درمیان صرف کنیت اور نسبت کا فرق ہے:

الرداع | مذکورة الصدر عبارت میں امراض کے جو نام آئے ہیں ان کی تصحیح میں بھی مولانا نے یقیناً بڑی زحمت اٹھائی ہے، ورنہ اصل نسخہ میں ان مفردات کی صورتیں مسخ ہو چکی تھیں چنانچہ حاشیہ ۲ پر ان کی اصلی صورتوں کو محفوظ کر دیا گیا ہے: الأصل (النجار الرکاع ۔ ۔ ۔ ۔ العلات)

مجھے ان میں سے صرف ایک لفظ کی تصحیح سے اختلاف ہے، مولانا نے (الرکاع) کی صحیح صورت (الرداع) تجویز فرمائی ہے، ان دونوں میں صورۃً کچھ مشابہت ضرور ہے لیکن اقرب الی الصواب یہ ہے کہ (الرکاع) کی صحیح شکل (الدکاع) کو قرار دیا جائے؛ (الد) کا (الر) بن جانا بہت آسان ہے لیکن (داع) کا (کاع) بن جانا نسبۃً مستبعد ہے، نیز لسان العرب کی مذکورہ بالا عبارت میں (الرداع) کے بجائے (الدکاع) ہے، دکاع کی تفسیر کے لئے لسان کی عبارت ملاحظہ ہو:

الدکاع سعال یاخذ الابل وقیل داء یاخذ الابل والخیل فی صدورها کالسعال قال القطامی: تری منه صدور الخیل زورا کأن بها نحازا أو دکاعا اھ (ج ۹/۴۴)

الشفاق | الطرائف ص ۱۵، ب: الأعلال فی الخ شفاق بالشین والقاف مولانا میمنی کے نزدیک صحیح ہے ارشاد فرماتے ہیں: الشفاق الشفقة مصدر اخلّت به المعاجم اھ (تعلیق ۲)

مولانا نے اس منظومہ کے ابیات کی تخریج نہیں کی ہے بلوغ الارب (ج ۲/۲۸۷) میں اس کے

بعض ابیات باختلافِ الفاظ موجود ہیں، بہ ظاہر شفاق بہ معنی شفقت یہاں پر چسپاں ضرور ہے لیکن اس مصدر کا ثبوت معاجم کے علاوہ مجامیع ادبیہ سے بھی شاید ہی بہم پہنچے، بلوغ الارب میں (الشقاق) بالشین والقاف چھپا ہے اس کو تصحیف مطبعی قرار دینا آسان تھا لیکن کتاب المحبر لابن حبیب جو ۱۹۴۲ء میں حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے اس میں بھی (الشقاق) بالقاف ہی چھپا ہے (المحبر ص ۳۲۲) غرض شفاق بالفاء کی صحت محتاج ثبوت رہی، ظن محض یا نسخہ شنقیطی کے اعتماد پر اس لفظ کی تثبیت مناسب نہیں جبکہ اس نسخہ کے متعلق مولانا خود فرماتے ہیں: ولم یخل من اغلاط اھ

عَبَر | ص ۱۵، ب: وجاءوا الخ اس لفظ پر مولانا کا حاشیہ ہے: وھو جمع عبرۃ او بالفتح الدمع اھ بلوغ الارب اور کتاب المحبر کے صفحات محولہ بالا میں (غبر) بالمعجمہ ہے، اس لفظ پر کسی نے المحبر کے اصل نسخہ میں یہ تعلیق لکھی ہے جمع غبرۃ من التراب اھ مفہوم کے اعتبار سے بھی اس کا موزوں ہونا واضح ہے، گرچہ (عبر) بالعین پڑھنے کی بنا پر بھی مفہوم میں کوئی خرابی نہیں پیدا ہوتی تاہم میرے خیال میں اصح (غبر) بالمعجمہ ہے، کتاب المحبر میں اس منظومہ کے پانچ ابیات لفظی اختلاف کے ساتھ ملتے ہیں ان اختلافات کا ذکر باعث تطویل ہوگا،

مُکتتبٌ | الطرائف ص ۱۰۰، ب ۲۲: مستضرع الخ شرح میں بھی دو بار (مکتتب) کا لفظ مذکور ہے یہ اگر خطاء مطبعی نہیں تو یقیناً تصحیفِ فاحش ہے، صحیح لفظ (مکتنت) ہے (لسان ج ۱۰/۱۹۱، تاج العروس ج ۱/۵۷۹، الاکتنات: الخضوع والرضا (قاموس)

زَنَاء الحامیین | الطرائف ص ۹۹، ب ۱۳: شأس الھبوط الخ لفظ زناء کو مولانا نے کسرہ کی حرکت دی ہے لسان العرب میں یہ شعر دو جگہ آیا ہے اور دونوں جگہ (بشغ فشغ) بالضم ضبط کیا گیا ہے لیکن صحیح ضبط بفتح الزاء ہے فیروزآبادی کا قول ہے: الزناء کسحاب (قاموس)، زمخشری کا بیان ہے: زناء ھو فی الصفات نظیر براء وجواد وجبان الخ (الفائق ج ۱ ص ۲۷۰) ابن الاثیر نے النہایہ میں اور زبیدی نے تاج العروس میں زمخشری ہی کے قول کو نقل کیا ہے (تاج: ۱/۴۷):

تَوَاقُر | ص ۱۱۴، ب ۷: صحیح تواقر بالزاء ہے اس لفظ کی تصحیح مع سند لغوی میرے مضمون مطبوعہ معارف

میں گذر چکی ہے یہاں لسان العرب کے ماخذ کی تصریح کر دی جاتی ہے۔

لسان کی عبارت ابو عبید القاسم بن سلام کی کتاب الغریب المصنف سے منقول ہے، ابو عبید کے الفاظ باب ماخالفت العامة فيه لغات العرب من الكلام کے تحت یہ ہیں: وهي قاقوزة وقازوزة للتي تسمى ناقزة (ملاحظہ ہو مجلد ۳ ZD ۸۸، رامور ۹ سطر ۶-۷، ج ۶۹ صفحہ ۱۹۱۵ء) اس لفظ کا استعمال الاقیشر اپنے ایک بیت میں کرتا ہے:

افنى تلادي وما جمعت من نشب | قرع القواقيز افواه الاباريق

اس کے بعد دو بیت اور ہیں (الشعراء: ابن قتیبة ص ۲۱۹، طبع المعاہد ۱۹۳۲م)

سطور ذیل میں چند اہم روایتیں ذکر کی جاتی ہیں۔

ص ۷، ج ۳: ببرقة دا كفي بجائے ببرقة ضاحك (یاقوت، ج ۱/۵۸۸)

ص ۸، د ۳: یاقوت ایضاً، بہ روایت کاساد العرفجة (یاقوت ج ۲/۲۱۶)

ص ۹، ھ ۲: القتبي کی روایت تعج بتقديم العين على الميم (معاني القتبي: ص ۲۳۲ حیدرآباد)

ص ۳۶: أى ۲: سمير الليالي بجائے سجيس الليالي (تفسیر الطبري ج ۷/۱۳۹، الشعراء ص طبع المعاہد صحاح "سمر" الاغانی وغیرہ)

ص ۳۹: هي ۲۰: عمرو ادرهطه بجائے سعد بن مالك (یاقوت ج ۱/۳۴۰)

ص ۶۳، شطر ۴۴: روایت الإِيَّل بالفتح والكسر بروزن قنب وسيد، نیز ابن الاعرابی کی قراءت میں یائے مشدد کے بجائے جیم مشدد یعنی الاجل بروزن قنب وقبر ہے (تاج العروس ج ۴/۱۸۳، ج ۷/۲۰۴، ۲۱۵، لسان ج ۸/۲) ابدال الیاء بالجیم لغت قلیلہ ہے (التاج بر موقع، الشعراء ص ۲۹ رسالة النضر بن شميل في الحروف العربية ص ۱۶۲ طبعة بیروت، او غسنت ہفر)

ص ۶۷، شطر ۱۲۹: المهلبي کی روایت من جب عادیہ بجائے من نحت عاد کے یاقوت کی تصریح ہے: قال محمد بن ابي عبيدة المهلبي البير التي بالماوية وهي بير عادية لا تقبل

ماءها ولو وردها جميع اهل الارض وإياها عنى ابو النجم العجلى حيث قال: من جبب الخ المادية ج ۴/۴۵۴)

ص ۹۸ شطر ۱۵۲: نی سرظم ھاد بجائے وکاهل ضخم، سرظم بروں جبفرو زبرج دتاج العروس ج ۸/۱۴)

ص ۷۴ ثب: ابن قتیبہ کی روایت عارية بجائے عادية اور رہج بجائے ذنب ہے اقال القتيبي: العارية النار لانها لا تكسي شيئا الا اكلته و رهجها دخانها شبهه بالغبار معانی القتيبي ص ۴۳۱

ص ۸۷، ب ۲۸: مصرعہ ثانی کتاب الاغانی میں اس طرح ہے:

حياء يكف الدمع ان يتطلعا (ج ۵/۱۲۷)

ص ۸۷، ب ۲۹: صدر البیت کے الفاظ کتاب الاغانی میں اس طرح ہیں:

تبرض عينيه الصبابة كلما

ص ۹۶ ب ۱: معجم البلدان کی روایت دکناء ملحمة ہے بجائے بیضاء محملقہ کے (ج ۲/۳۹) نیز بیضاء محکمۃ کی روایت بھی موجود ہے (ج ۳/۳۴) معجم الشعراء للمرزبانی میں بیضاء کے بجائے غبراء ہے:

(ف) کہا جاتا ہے کہ اس مضمون کو سب سے پہلے بنی عقیل کے ایک جاہلی شاعر نے باندھا تھا اس کا شعر حسب ذیل ہے:

يثيران من نسج الغبار عليهما قميصين اسمالا ويرتديان

اس کے بعد مشہور شاعرہ خنساء اسی مضمون کو اس طرح ادا کرتی ہے:

جارى اباه فاقبلا وهما يتعاوران ملاءة الحضر

اخیر میں عدی بن الرقاع اسی مفہوم کو پیش کرتا ہے

يتعاوران من الغبار ملاءة بيضاء محكمة هما نسجاها (یاقوت معجم)

ص ۹۸ ب ۲ : لسان اور تاج میں تنبھم کے عوض ان تتہئم ہے (لسان، نصح، تاج ج ۵/ ۵۲۵)

ص ۹۸ ب ۴ : لسان میں بجائے المحافل، المواطن ہے ؛ ابو الہیثم کے نزدیک مضطلعٌ کے عوض مطّلع بالادغام بھی روایت صحیح ہے ابن السکیت کا قول ہے : لا یقال ھو مطّلع بحمله، لیکن اللیث اور احمد بن حاتم کے بیان سے ابو الہیثم کو تقویت پہنچتی ہے، اختلاف کی یہی نوعیت ابن مقبل کے اس مصرعہ میں بھی ہے : مناطویل نجاد السیف مطّلعُ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے لسان (ضلع) اور تاج العروس (ج ۵/ ۴۳۵، ۴۲۴)

ص ۹۹ ب ۹ : تاج العروس میں بعضہم کی جگہ وددھم ہے ؛ شمر کی روایت میں من ذی نرائل کے عوض مقابل الخطو ہے (تاج، ج ۶/ ۱۲، لسان ج ۱۰/ ۱۱۷)

ص ۹۹ ب ۱۲ لسان اور تاج دونوں کی متفقہ روایت عنا بہا بجائے عنا بہا رل، شرح تاج ج ۵/ ۹۷ ۳) عنان کسحاب دیار بنی عامر میں ایک وادی کا نام ہے (قاموس، یاقوت ج ۳/ ۷۳۴)

ص ۹۹ ب ۱۳ : تنشغ کے عوض بشغ بھی روایت صحیح ہے، بشغ بالامر بشغا وبشاعة ضاق به ذرعاً (اللسان ج ۹/ ۳۵۷؛ التاج، ج ۵/ ۹۷۵، ج ۶/ ۳۴)

سردست انھی سطروں پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ روایات والفاظ کے جملہ اختلافات پیش کئے جائیں تو بہت ممکن ہے کہ بعض قارئین پریشان خاطر ہو جائیں، میں نے معانی القتبی کے بعض حوالے صرف اس خیال سے پیش کئے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ فوائد اس مضمون میں جمع ہو جائیں ورنہ یہ تو ابھی سنہ ۱۹۴۹ - ۵۰ء میں حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے گرچہ اس کے نسخۃ الخط کے حوالے علامہ میمنی کے ذیول وحواشی میں بھی نظر آتے ہیں۔

اخیر میں مولانا میمنی سے خصوصی طور پر عرض کرنا ہے کہ عاجز راقم کا مقصد وحید علم وادب کی خدمت ہے لہذا ان سطور کو نقد بری پر محمول کریں، نیز یہ بھی گذارش ہے کہ الطرائف کی طباعت کو ایک عرصہ ہو چکا ہے اس اثنا میں ان کے پاس غیر مصحح مقامات کی تصحیح واصلاح کے متعلق کافی ذخیرہ جمع ہو گیا ہوگا ان تصحیحات ودیگر علمی فوائد کو اگر کسی رسالہ میں شائع فرما دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا کہ اس دور خمول میں جبکہ عربی ادبیات سے لوگوں کی دلچسپی ختم ہو چلی ہے الطرائف کے دوبارہ چھپنے کی امید تو نہیں کی جا سکتی۔

ادبیات

دورِ جام

از

(جناب الم مظفر نگری)

حسن کا ہر ایک جلوہ عشق کا پیغام ہے
عشق کا پیغام، پیغامِ خدا کا نام ہے

ناز مت کر دولتِ دنیا فنا انجام ہے
یہ ترا دیہیمِ شاہی آفتابِ شام ہے

اے مسافر اک نمودِ گردشِ ایام ہے
صبحِ منزل جس کو سمجھا ہے قریبِ شام ہے

دل لرز جاتا ہے اے ساقی تغافل پر ترے
زندگی شاید بقدرِ لطفِ دورِ جام ہے

باغِ رضواں کی بہاریں جس کے شعلوں پر نثار
میرے دل میں موجزن وہ آتشِ بے نام ہے

گل تو محوِ داستانِ موسمِ گل ہیں۔ مگر
سنئے کانٹوں کی زباں پر بھی تو اک پیغام ہے

احترامِ بادہ نوشی اس سے ممکن ہی نہیں
بزم میں جو ناشناسِ رسمِ دورِ جام ہے

نزع میں ہچکی سی آئی ہے مریضِ عشق کو
یہ پیامِ آخری شاید انھیں کے نام ہے

ہے یہاں بھی آدمی پابندِ رسمِ امتحاں
میں تو سمجھا تھا لحد اک منزلِ آرام ہے

کر رہی ہے رہبری تاروں کی دھیمی روشنی
اے مسافر شامِ غربت بھی مبارک شام ہے

آکے شرمندہ ہوتے اے میر دیوانِ جزا
تیری اس محفل میں تو اذنِ ورودِ عام ہے

کتنا چمکایا الم میرے زلالِ اشک نے
اب حرم افروز میرا جامۂ احرام ہے

عرفانِ حقیقت

از

(جناب انور صابری)

تفسیرِ حدیثِ سوز بھی ہوں ۔ آہنگ زبانِ ساز بھی ہوں
فطرت کا امینِ راز بھی ہوں ۔ عنوانِ شکستِ راز بھی ہوں
رومان کے میٹھے گیتوں کی تخلیق بھی مجھ سے ہوتی ہے
سنسار لرزتا ہے جس سے وہ درد بھری آواز بھی ہوں

(۲)

ڈھالے ہیں نظر کے سانچوں میں دلچسپ و حسیں نظارے بھی
پلکوں سے تراشے ہیں اکثر افلاک کے روشن تارے بھی
گلزارِ طرب ۔ ویرانہ غم ہیں میرے ہی یہ دونوں عالم
آنکھوں میں نہاں ہے شبنم بھی سینے میں نہاں انگارے بھی

(۳)

بیٹھا ہوں مرتب کرنے کو ہستی کا مکمل افسانہ
عرفانِ خودی کے ساقی کا ہر لفظ ہے رنگیں پیمانہ
بے ربط تکلم ہے انور اخفائے حقیقت کا پردہ
بہتر ہے یہی میرے حق میں دنیا مجھے سمجھے دیوانہ

جب اپنے تجلی خانوں کی شمعوں کو فروزاں کر دوں گا
بندوں پہ جمالِ یزداں کے ہر رخ کو نمایاں کر دوں گا

غزل

از

(جناب شارق میرٹھی ایم۔ اے)

کیں خرد نے ہزار تدبیریں ‏ سامنے آگئی ہیں تقدیریں
اپنی ہستی پہ اک نگاہ تو ڈال ‏ ظلمتوں میں نہاں ہیں تنویریں
خامشی پر نہ جا مری ظالم ‏ میں نے چپ رہ کے کی ہیں تقریریں
اور کیا ہے جہاں کے پردے پر ‏ میری نظریں تمہاری تصویریں
اب تو لگ جائے آگ ہی دل میں ‏ دیکھ لیں ضبطِ غم کی تاثیریں
میں تو اک آہ کر کے ہوں خاموش ‏ اب کرے کون غم کی تفسیریں

کیں نہیں بلکہ ہو گئیں شارق
ہیں کچھ ایسی بھی اپنی تقصیریں

قرآن مجید معرّیٰ

یہ قرآن مجید اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے بے مثل ہے اس کا خط بہت صاف اور روشن ہے ہر لفظ جدا جدا ہے اس میں بچے بہت آسانی سے حفظ کر سکتے ہیں اس کا ہر پارہ علیحدہ ہے۔ ہر صفحہ کی آخری سطر پر آیت ختم کی گئی ہے ہر منزل پر بہت عمدہ بیل بنی ہوئی ہے، ہر سورت کی تمام آیتوں پر شمار کے ہندسے دئے گئے ہیں صحت کا غیر معمولی اہتمام کیا گیا ہے۔ بہترین طباعت تقطیع ۲۰×۲۶/۸ کاغذ سفید گلیز نہایت صحیح جدید ترین ایڈیشن ہدیہ بلا جلد تین روپے آٹھ آنے مجلد جرمی چھ روپے چار آنے مجلد پارچہ چار روپے آٹھ آنے للعہ

ایک جدید علمی کتاب کا تعارف

طبیعیات کی داستان | مرتبہ پروفیسر مولوی محمد نصیر احمد صاحب عثمانی (علیگ) ایم - اے، بی ایس سی سابق معلم طبیعیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن - قیمت غیر مجلد پاکستان ۸ روپیہ ۱۲ آنے - ہندوستان ۱۲ روپے - ملنے کا پتہ :- پاکستان، انجمن ترقی اردو کل پاکستان ہسپتال روڈ کراچی - ہندوستان، اسٹرس امپوریم، سر فیروز شاہ مہتا روڈ بمبئی ۱

یہ کتاب انجمن ترقی اردو پاکستان کی طرف سے طبع ہو کر حال ہی میں شائع ہوئی ہے - کاغذ چکنا اور لکھائی چھپائی اچھی اور واضح ہے -

رسم الخط میں انگریزی املا کی تقلید میں کاما، ڈیش اور دوسرے اوقاف عبارت سے کام لیا ہے اور جملوں کو متفرق کیا گیا ہے یہ ایک مناسب اور ضروری اصلاح ہے -

آغاز کتاب میں ایک بسیط اور بصیرت افروز دیباچہ ہے - جس میں ان انگریزی کتابوں کی فہرست درج ہے جن سے اس کتاب کی تدوین میں مدد لی گئی ہے پھر ایک فہرست مضامین بھی دی گئی ہے

خود اس داستان کی داستان مختصر یہ ہے کہ دیباچہ کے مطابق مسودہ ۱۹۴۵ء میں تیار ہوا - انجمن ترقی اردو کے سپرد کیا گیا - دہلی پہنچا - لیکن خود دہلی اپنی جگہ سے ہل گئی - ملک کی تقسیم ہوئی - انجمن بھی تقسیم ہوگئی - مسودہ کراچی کی شاخ کو پہنچا انھوں نے چھ برس بعد ۱۹۵۱ء کے اخیر میں اسے شائع کیا جبکہ مؤلف بھی پنشن پر سبکدوش ہو گئے - شاید یہی وجہ ہے کہ کتاب کے اخیر میں "اشاریہ" نظر نہیں آتا جو ایسی کتابوں کا ضروری جز ہونا چاہیے - اور شاید اس کمی کو پورا کرنے کے لئے فہرست مضامین کو مفصل کر دیا گیا ہے -

کتاب کے اخیر میں ایک فرہنگِ اصطلاحات بھی شامل ہے جس میں ضروری انگریزی اصطلاحات

کے اردو مرادفات درج ہیں۔ یہ بیشتر وہی ہیں جو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں وضع ہوکر انجمن ترقی اردو کی مطبوعات اور دیگر سائنسی کتابوں میں رائج ہوئے۔ اور اب اردو ادب کے لئے چنداں نامانوس نہیں ہیں۔ علاوہ اس کے جہاں یہ اصطلاحیں کتاب کے متن میں آئی ہیں۔ وہاں فٹ نوٹ میں ان کو انگریزی املا میں بھی درج کردیا ہے اور یہ بہت اچھا کیا ہے۔

اخیر کتاب میں فرہنگِ اصطلاحات سے قبل ایک تاریخی جدول بھی شامل ہے جس میں وہ تاریخیں درج ہیں جن کا تعلق طبیعیاتی انکشافات سے ہے۔

اس حقیقت کے مدنظر کہ انگریزی جیسی مقبول اور وسیع زبان میں بھی سائنس کی تاریخ کی کتابیں تاحال کم ہیں اردو میں اس موضوع کی ایک پُر از معلومات اولین کتاب کی ایسی شاندار تیاری ایک جرأت آزما کام تھا جس کے لئے بابائے اردو (ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب) کے حسن انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے کہ موصوف نے یہ اہم فریضہ ایک ایسے ماہر فن تجربہ کار استاذ طبیعیات کے سپرد کیا جو اپنی تقریباً ساری عمر سائنس کی دنیا میں اور بالخصوص علم طبیعیات کے درس و تدریس میں گزار چکے ہیں اور تقریباً ۲۰ سال تک حیدرآباد میں سائنس کے پہلے اردو ماہنامہ کے معتمد و مدیر بھی رہ چکے ہیں اور جنھیں سائنس کے موضوعات سے زبان اردو کو متعارف اور مالا مال کرنے کا خاص ملکہ حاصل ہے۔

کتاب میں توضیح مطالب کے لئے کوئی ۸۰ تصویریں اور شکلیں بھی دی گئی ہیں مگر سب دستی خاکے ہیں جو زیادہ دیدہ زیب نہیں معلوم ہوتے۔ بعض تصویریں چھپنے میں بھدی بھی ہوگئی ہیں۔ مگران کے متوو غمازی کر رہے ہیں کہ وہ تقسیم کا عمل اس کا ذمہ دار ہے۔

طبیعیات کا ارتقا مختلف دوروں سے گزر کر ہوا ہے۔ جن کے مد و جزر کی دلچسپ داستان اس کتاب کا خاص موضوع ہے۔ ابتدائی دور بابلی، مصری، اور ہندی تمدن سے شروع ہوکر انیسویں صدی کے آخر تک پہنچتا ہے جب مقناطیس اور برق کا انتہائی پُر اعجاز طلسمی دور کہنا بے جا نہ ہوگا۔

چونکہ طبیعیات کا مطالعہ عام طور پر سات عنوانوں میکانیات یا حیل، حرارت، نور، آواز مقناطیسیت برق اور عام خواص مادہ کے تحت کیا جاتا ہے لہذا مولف نے بھی داستان کے مختلف

دور قائم کرکے ہر دور کے حالات ان ہی عنوانات کے تحت بیان کئے ہیں جس سے ان کی تدریجی ترقی کا مرقع آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

فاضل مولف نے یہ داستان شروع سے آخر تک نہایت دلچسپ پیرایۂ بیان اور عام فہم سادہ زبان میں پیش کی ہے۔ مگر ایک عامی جب موصل، نخراج، امالہ مجوزہ جیسے نامانوس مصطلاحات سائنس سے دوچار ہوتا ہے تو اسے ابتداً ایک "دھچکا" (اس کتاب کی اصطلاح میں) یا "دھکا" محسوس ہوتا ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ داستان سائنس، کوئی الف لیلہ، فسانہ آزاد، یا مثنوی بدر منیر نہیں ہے بلکہ ایک ٹھوس علمی اور فنی موضوع ہے جس پر عبور حاصل کرنے کے لئے بہر صورت ثقیل فنی الفاظ سے بچنا محال ہے جس طرح ایک ناخواندہ موٹر ڈرائور، ہب، ہڈ، ایڈجسٹر، ڈائنمو، ریفریجریٹر، بیٹری وغیرہ جیسے جبڑا توڑ الفاظ کو مشق و مزاولت سے بتدریج اپنا لیتا ہے اور بالآخر انھیں خوب سمجھنے اور بے تکلف بولنے لگتا ہے اسی طرح طلبا، سائنس اور علمی ذوق رکھنے والے اصحاب ان مصطلحات کے کڑوے گھونٹ کو حلق سے اتار کر کثرتِ استعمال سے مانوس، گوارا اور لذیذ بن سکتے ہیں۔ در اصل ہماری زبان کو علوم سائنس سے مالا مال کرنے کے لئے فنی اصطلاحات کے اس سخت اور کرخت مرحلے سے گزرنا ناگزیر ہے۔ اس نوبت پر ہم مولف کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے تقریباً ساڑھے پانسو صفحات کی اس طویل داستان کو اصطلاحات کی بھرمار سے بوجھل نہیں بنا دیا ہے۔

بہرحال بہ حیثیت مجموعی طبعیات کی یہ داستان اردو زبان میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور قابل مولف کی یہ کوشش و کاوش ہر طرح مستحق تحسین اور قابل مبارکباد ہے۔

اس سلسلے میں ایک ضروری توجہ طلب امر کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔ اول تو اردو میں اب تک سائنس کی کتابیں زیادہ نہیں لکھی گئی ہیں۔ موجودہ کتب میں سے اکثر و بیشتر درسی رسالوں کی حیثیت رکھتی ہیں جو عام ناظرین کے لئے چنداں دلچسپ نہیں۔

چند سال قبل بنگال کے ایک فاضل پروفیسر ڈاکٹر محمد قدرت خدا نے "سائنس کی انوکھی کہانی" کے نام سے ایک نہایت اچھی کتاب شائع کی تھی جس میں فلکیات، ارضیات، نباتیات، حیوانیات

فعلیات، طبیعیات اور کیمیا پر مشتمل چند اہم اور بنیادی معلومات درج تھیں۔ اس کتاب پر رسالہ سائنس حیدر آباد دکن میں ایک مختصر تبصرہ بھی پیش کیا گیا تھا۔ اس تبصرے میں اس پر زور دیا گیا تھا کہ اردو اصطلاحات سائنس کے وضع و ترویج کے لئے ایک ہم آہنگ طریقہ کار نہایت ضروری ہے جس کی مدد سے ان میں باقاعدگی، یک رنگی اور یکسانیت پیدا ہو سکے، دراصل یہ عظیم بالشان کام کسی مرد واحد کے بس کا روگ نہیں ہے۔ بلکہ اس پر ایک ایسے مرکزی ادارے کی ہدایت اور نگرانی ضروری ہے جو ملک میں شائع ہونے والی تمام سائنسی کتابوں سے متعلق فنی اصطلاحوں وغیرہ کے معاملے میں مختلف اہل قلم حضرات کی حسب ضرورت امداد اور رہنمائی کرتا رہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نے سات آٹھ سال پہلے اصطلاحات سائنس کے جو ایک دو مختصر مجموعے شائع کئے تھے ان کی حیثیت ایسی ہے جیسے اونٹ کے منہ میں زیرہ۔ مختلف شعبہ جات سائنس کی اصطلاحات کا میدان ایک ہمہ گیر، وسیع النظر لائحہ عمل کا طالب ہے۔

بایں ہمہ ایک مرکزی بنیادی کام جس کی فوری تکمیل ممکن ہے یہ ہے کہ اب تک جتنی چھوٹی بڑی درسی کتابیں یا عام کتابیں موضوعات سائنس کے متعلق اردو میں متفرق طور پر جہاں کہیں بھی شائع ہو چکی ہیں ان کی ایک مکمل اور مبسوط فہرست تیار کی جائے اور ان میں استعمال شدہ مصطلحات کا ایک مکمل مجموعہ تاحال شائع کیا جائے۔ اگر یہ اہم کام انجام پا جائے تو اس سے آئندہ کام کرنے والوں کو بڑی سہولت حاصل ہو جائے گی اور سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ سابقہ اور آئندہ تالیفات سائنس کے درمیان مشارکت اور یک رنگی پیدا ہو سکے گی۔

دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن نے سالہا سال کی محنت اور صرف کثیر سے طبی اصطلاحات کا جو لغت تیار کیا تھا اس میں علوم طبعیہ کے علاوہ حیاتیات، کیمیا، طبیعیات وغیرہ کے ضروری الفاظ بھی ایک حد تک شامل تھے۔ مگر بدقسمتی سے اس کی طباعت و اشاعت صرف (K) سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اگر اردو کے بہی خواہ اب بھی کسی طرح اسے مکمل شائع کرا دیں تو ایسا مجموعہ بہت کارآمد ہوگا۔ اور آئندہ منزلوں میں ایک شمع ہدایت کا کام دے گا۔

انجمن ترقی اردو (ہند) جس کا صدر دفتر اب علی گڈھ میں ہے اس کے ارباب اختیار سے یہ توقع بے جا نہیں کہ اس کی طرف سے یہ اقدام عمل میں آئے۔ مگر اندیشہ ہے کہ "خاک ہو جائیں گے ہم ان کو خبر ہونے تک"۔ مجبوراً "تمنائے بے تاب" کی امید و آرزو کی نگاہیں بے اختیار "داستان طبیعیات" کے فاضل مؤلف مولوی نصیر احمد صاحب عثمانی جیسے پختہ کار استاذ سائنس کی طرف اٹھتی ہیں اگر موصوف اپنی توجہ خاص ایک مبسوط مجموعہ اصطلاحات سائنس کی تیاری کی طرف منتقل اور مبذول فرمائیں تو ان کی ذات سے اس اہم کام کے باحسن وجوہ تکمیل پانے کی امید کی جا سکتی ہے بالخصوص جبکہ وہ درس و تدریس کے فرائض سے سبکدوش بھی ہو چکے ہیں۔ موصوف کی یہ علمی خدمت تاریخ ارتقائے اردو میں آئندہ ایک زندہ اور پائندہ یادگار رہے گی۔ (ع)

حیات شیخ الاسلام

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید محمد انور شاہ صاحب قدس اللہ سرہ کے جستہ جستہ حالات تو لکھے گئے ہیں مگر اب تک کوئی جامع سوانح حیات مرتب نہیں ہوئی۔ انوریہ لائبریری دیوبند نے بنام خدا اس عظیم کام کے لئے قدم اٹھایا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے تلامذہ اور متوسلین سے گذارش ہے کہ حضرتؒ کی سوانح حیات سے متعلق اگر کوئی مواد موجود ہو تو براہ کرم ذیل کے پتہ پر ارسال فرما کر ممنون فرماویں۔ اگر اصل تحریر کے روانہ کرنے میں کوئی تامل ہو تو اس کی نقل معہ حوالہ کے عنایت فرمائیں۔

معتمد انوریہ لائبریری انجمن امداد الاسلام دیوبند یوپی

ایک خط

"جامع المجددین" کی ساتویں قسط اس دفعہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے شریکِ اشاعت نہیں کی جاسکی، کئی مہینے ہوتے اس سلسلہ کا ایک خط کانپور سے آیا تھا جس سے "جامع المجددین" سے متعلق بعض مباحث پر روشنی پڑتی ہے گنجایش نہ ہونے کی وجہ سے یہ خط اب تک شائع نہیں کیا جاسکا تھا اب اس کی اشاعت کا موقع نکلا ہے، قارئین اس مکتوب کے ضروری گوشوں کو بھی ذہن میں رکھیں۔　　"برہان"

جناب ایڈیٹر صاحب "برہان" السلام علیکم

آنجناب نے "برہان" میں جامع المجددین یا مولوی عبدالباری صاحب پر تبصرہ شروع فرمایا ہے مجھے اس سے قطع نظر کہ حضرت مولانا تھانوی مجدد تھے یا غیر مجدد اس بحث سے ایک شبہ پیدا ہوگیا۔ مہربانی فرماکر آپ یا مؤلف جامع المجددین صاحب اس کا حل فرمادیں مؤلف صاحب اس لئے کہ انھوں نے خواہ مخواہ دو عالموں کی علمی چھیڑ چھاڑ کو مجددیت کے اثبات میں پیش فرمایا اور آپ اس لئے کہ آپ نے اس کو ہوا دی بہرحال آپ کے واسطہ سے میں یہ امید کروں گا کہ میرے شبہ کا ازالہ فرمایا جائے گا۔

اگرچہ مسئلہ استیذان کو آپ نے صحیح سمجھا کہ وہ بیوتِ مسکونہ کے ساتھ خاص ہے لیکن اجمال سے کام لیا قرآنِ مجید سے دلیل تخصیص کو پیش نہیں فرمایا حالانکہ کلام اللہ میں صراحۃً آیتِ استیذان کے بعد دوسری آیت موجود ہے "لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ مَسْکُوْنَۃٍ" اس آیت میں غیر مسکونہ کی قید صاف بتارہی ہے کہ اول آیت میں بیوتاً عام نہیں ہے بلکہ خاص ہے اور مسکونہ کی قید مقدر ہے چنانچہ مفسرینِ احناف میں سے صاحب مدارک التنزیل نے بھی آیتِ استیذان میں غیر بیوتکم کے بعد یہ تفسیر کی "ای بیوتاً لستم تملکونہا ولا تسکنونہا" پھر دوسری آیت میں غیر مسکونۃ کے بعد واضح فرمایا "استثنیٰ من البیوت التی یجب الاستیذان علی داخلہا ما لیس بمسکون منہا کالخانات والربط وحوانیت البیاعین" یعنی موخر الذکر آیت کو مخصص بتاتے ہوئے مثال میں

خانقاہوں کو بھی پیش فرمایا ہے اور ظاہر ہے مولانا تھانوی کی خانقاہ سے یہ معاملہ متعلق تھا پھر تعجب ہے کہ مولانا مرحوم نے اپنے مخاطب سے فی الواقع یہ کیوں اخلاق برتا اور اگر علمی چھیڑ چھاڑ تھی تو اس کو معتقدین نے کیوں غلط رنگ دیا بہرحال مجھے جو اشکال پیش آیا وہ یہ ہے کہ حضرت مولانا تھانویؒ نے آیتِ استیذان میں تو دلیل تخصیص کا مطالبہ فرمایا۔ حالانکہ مخصص منصوص ہے لیکن سورۂ نور ہی میں "اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُنَّ" کے ظاہر پر (بیان القرآن) میں عمل نہ فرمایا اور امام مالکؒ و امام شافعیؒ کی طرح حکم کو ذکور و اناث دونوں اصناف کے لئے عام نہیں قرار دیا۔ کیا بقاعدۂ اصول لفظ مَا عام نہیں ہے؟ اور کیا غیر مسکوتہ کی قید کی طرح یہاں کوئی قید منصوص ہے؟ اگر نہیں ہے تو مولانا تھانوی نے پھر کیوں حکم کو عام نہیں سمجھا؟ کیا بوالعجبی ہے کہ مسئلہ استیذان میں تو تخصیص بالنص کو نظر انداز کرکے تعمیم کا حکم دیا جائے لیکن مسئلہ ابداء زینت میں جہاں بظاہر اماء و عبید دونوں کے لئے تعمیم ہے وہاں تعمیم بالنص کو قبول نہ فرمایا جائے اور صاحب ہدایہؒ کے قیاس یا اثر صحابی "لا تغرنکم سورۃ النور فانھا فی الاناث دون الذکور" پر عمل کیا جائے اور حکم کو محض اماء کے حق میں مانا جائے۔ امید ہے کہ کافی و اطمینان بخش جواب "برہان" میں شائع فرماکر مجھے شکر گذار فرمائیں گے اور میری طرح دوسرے صاحبوں کو بھی علمی طور پر مستفید فرمائیں گے۔ آپ کا مخلص اور عقیدت مند محمد حسین کانپوری

مورخہ ۲۸ رجنوری ۱۹۵۲ء　　اباحت اور تملیک کے مسئلہ پر بعد میں توجہ دلاؤنگا

نعت حضور صلے اللہ علیہ وسلم

برہان

جلد بست و نہم — شمارہ نمبر ۲

اگست ۱۹۵۲ء مطابق ذیقعدہ ۱۳۷۱ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

قارئین برہان کو یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنائی جارہی ہے کہ پچھلے مہینے جولائی کی بارہ تاریخ کو دوپہر کے قریب برہان کے مدیر اعلیٰ برادر عزیز مولانا سعید احمد کے والد ماجد جناب ڈاکٹر ابرار حسین صاحب قبلہ مراد آباد میں رحلت فرما گئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُون

مرحوم نہ صرف یہ کہ ایک کامیاب اور نامور ڈاکٹر تھے بلکہ بہت سے غیر معمولی اوصاف کی وجہ سے اکابر کی یادگار سمجھے جاتے تھے، مولانا سعید احمد کے تعلق سے وہ مجھے بھی اپنی اولاد کی طرح جانتے تھے اور اس تقریب سے مجھے بہت قریب سے ان کی زندگی کو پڑھنے کا موقع ملا ہے، اوّل درجے کے متبع شریعت، راسخ العقیدہ، فرائض و واجبات ہی کے نہیں مستحبات و آداب تک کے پابند بڑے فرض شناس اور عاشق رسول، انقلاب ۱۹۴۷ء اور دہلی چھوڑ دینے کے بعد بھی تین چار دفعہ یہاں تشریف لائے، پیرانہ سالی اور انتہائی نقاہت کے باوجود اسی پہلی سی آن بان کے ساتھ پابند اوقات، ان کی خدمت میں بیٹھکر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اباجی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بیٹھا ہوں اسی انداز کی محبت، اسی طرح کی بزرگانہ شفقتیں، ان کو دیکھکر قلب میں عجیب طرح کا سکون محسوس ہوتا تھا، ہر ضروری بات میں مجھ سے مشورہ لیتے اور اس کو غیر معمولی اہمیت دیتے تھے، مرحوم کی زندہ جاوید یادگار خود ان کے اکلوتے صاجزادے مولانا سعید احمد ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے فیوض کو تادیر قائم رکھے اور ایسی لائق و فائق اولاد ہر مسلمان کو نصیب ہو۔

میں نے جناب ڈاکٹر صاحب قبلہ مرحوم کے ضروری حالاتِ زندگی معلوم کرنے کے لئے برادر عزیز کو خط لکھا تھا، جواب میں ان کی جو تحریر آئی ہے اس کے اقتباسات یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

اباکی پیدائش بچھرایوں میں ہوئی، والد کا نام حکیم غلام نیاز تھا جو مرادآباد ضلع کے مشہور طبیب تھے

ڈل پاس کرکے نواب حسن پور کے ہاں اتالیق ہو گئے۔ مگر کچھ دنوں بعد خیال آیا کہ اس طرح زندگی گذارنا تو شیوۂ مردانگی نہیں ہے اس لئے والد، والدہ اور سب گھر والوں کی مرضی کے خلاف چپکے سے آگرہ آگئے اور آگرہ میڈیکل اسکول میں داخلہ لے لیا چونکہ گھر والوں کو خبر نہیں کی تھی اس لئے ٹیوشن کرکے اپنے ذاتی اور تعلیم کے اخراجات پورے کرتے تھے۔ چار سال اسی حالت میں گذارنے کے بعد جب ڈاکٹری کی ڈگری مل گئی تو گھر اطلاع کی۔ شروع ایام ملازمت میں منگلور، ہردوئی، جھانسی اور اعظم گڈھ میں رہے آخر آگرہ کے لوہامنڈی کے شفاخانہ میں ملازم ہو کر ایسے جمے کہ یہاں پچیس سال ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۲۵ء میں ریٹائرڈ ہو گئے۔

منگلور کے زمانۂ قیام میں قاضی عبدالغنی صاحب مرحوم سے بیعت ہوئے، علمائے دیوبند کے نام کے عاشق تھے۔ علی الخصوص حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا نانوتوی سے بیحد محبت تھی اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت میاں اصغر حسین صاحب، مولانا حبیب الرحمن صاحب اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب سے گہرے مراسم تھے۔ دیوبند کے مشہور جلسہ دستار بندی میں بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوئے۔ اور مولوی عبدالرحیم پشاوری جو دورہ میں فرسٹ آئے تھے ان کو کچھ روپیہ نقد اور صحیح بخاری کی دونوں جلدیں اپنی طرف سے دی تھیں ان کی دینداری اور نیکی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے آگرہ کے کامیاب اور مشہور ڈاکٹر ہونے کے باوجود مجھکو انگریزی کے بجائے عربی پڑھائی اور عالم بنایا، حالانکہ اس پران کا مذاق اڑایا جاتا تھا اور آگرہ میں ان کا مشہور رہتا ہی تھا کہ وہ ڈاکٹر جنہوں نے اس زمانہ میں اپنے لڑکے کو عربی پڑھائی ہے لیکن انہوں نے اس کی ذرا پرواہ نہیں کی اور میری عربی تعلیم پر وہی خرچ کیا جو وہ میری انگریزی تعلیم پر زیادہ سے زیادہ کر سکتے تھے۔ اس کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جبکہ اس بات کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ مجھ سے پہلے ابا کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئے تھے جن کا نوعمری میں ہی انتقال ہو گیا تھا اس کے بعد مسلسل سترہ سال تک ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی یہاں تک کہ انہوں نے ترکِ ملازمت اور ہجرت کا قصد کر لیا۔ مگر جب قاضی صاحب مرحوم کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے منع لکھ بھیجا اور ساتھ ہی خوشخبری دی کہ ان کے لڑکا ہوگا چنانچہ اس بشارت

کے چند سال بعد ۱۸۶۸ء کے رمضان کی ۷ تاریخ کو صبح صادق کے وقت میں پیدا ہوا تو ولادت سے دو گھنٹہ قبل ابا نے حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا نانوتوی کو خواب میں دیکھا کہ وہ منڈی کے شفاخانہ میں تشریف لائے ہیں اور فرماتے ہیں "ڈاکٹر! لڑکا مبارک! اس کا سعید نام رکھنا" چنانچہ ابا نے اس ارشاد کی تعمیل کی اور اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں بچہ کو دیوبند بھیجکر عالم بنواؤنگا۔ غرض کہ ایک معزز سرکاری عہدہ پر فائز ہونے ،معقول آمدنی رکھنے ۔ اور آگرہ شہر کے خاص ماحول میں رہنے کے باوجود انھوں نے اپنے اکلوتے لڑکے کو عربی کی تعلیم دلائی ۔ آمدنی کافی تھی ۔ مگر پس انداز کچھ نہیں کرتے تھے ۔ دوست احباب کہتے کہ کوئی جائداد خرید لیجئے ۔ تو فرماتے کہ اگر یہ لڑکا عالم باعمل ہو گیا تو بس یہی مری جائداد ہے جو آخرت میں بھی کام آئیگی اور اگر میں نے جائداد خرید بھی لی مگر لڑکا صالح نہیں ہوا تو پھر جائداد میرے لئے عذاب جہنم ہو جائیگی ۔

نماز با جماعت ۔ روزہ اور اوراد و وظائف کے سخت پابند تھے ۔ اب سے تین چار سال پہلے تک جبکہ وہ بیحد کمزور ہو گئے تھے تہجد اور اشراق تک کی نماز پابندی سے پڑھتے تھے ۔ بقر عید کے دنوں میں کئی کئی بکرے کرتے اور صدقات وخیرات بڑی فیاضی سے کرتے تھے ۔ کنبہ پروری ۔ مہمان نوازی اور غریبوں کی مدد ان کا شعار تھا ۔ حج خود کیا ۔ اور اپنی بیوی اور اولاد کو کرایا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مدینہ اور اہل مدینہ کے ساتھ انہیں فطری محبت تھی ۔ اہل مدینہ کے لئے ہر سال کچھ رقم بھیجتے تھے ۔ خود بہت سادہ رہتے تھے ۔ درویش صفت ۔ اور فقر منش طبیعت پائی تھی ۔ بیٹے کے ساتھ ان کو محبت نہیں عشق تھا بات بات پر دعائیں دیتے اور بلائیں لیتے تھے اور اب بھی وہی معاملہ کرتے تھے جو ایک باپ اپنے دو برس کے بچے کے ساتھ کرتا ہے ۔ تصوف کا خاص ذوق تھا ۔ اور اس فن کے مسائل پر عالمانہ گفتگو کرتے تھے بحیثیت ڈاکٹر کے اپنے فن میں نہایت کامیاب اور دور دور تک مشہور تھے ۔ قدرت نے دست شفا عطا فرمایا تھا نبض دیکھتے ہی مرض کی پوری کیفیت فوراً معلوم کرتے تھے اور مریض کے کچھ بغیر ہی بتائے سب حالات وعوارض بیان کر دیتے تھے ۔

کم وبیش ۸۲ سال کی عمر میں وفات پائی ۔ قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی نے قطعہ تاریخ وفات کہا ۔

ابرار حسین آنکہ بہ سالک طریقت — بہ سینہ اش منور از نور پاک ایزد

رحلت چو کرد ناگہ بودم بفکر سالش — آمد ندا ز غیبم "مغفور پاک ایزد"

۱۳۷۱ھ

تاریخ چین کا ایک ورق

از

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی)

بڑی گہری نیند اور کافی طویل خواب گراں کے بعد چین نے پھر کروٹ لی ہے اور تاریخ کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہا ہے، عموماً چین کی جدید بیداری نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف پھیر لی ہے۔ ناظرینِ "برہان" کے آگے بھی ایک تاریخی اذوقہ "اسی سلسلہ میں مناسب معلوم ہوا کہ پیش کر دیا جائے۔ (مناظر احسن گیلانی)

چین کا ایک دور امن اور چین کا دور تھا اس دور میں چینی قوم کی زندگی کا کیا رنگ تھا۔ اسی کا ایک اجمالی نظارہ اس مشہور تاریخی ڈائری میں پیش کیا گیا ہے جسے خیر سگالی کے اس وفد کے ایک رکن نے مرتب کیا تھا جو تیمور لنگ کے بیٹے اور جانشین مرزا شاہ رخ[1] والی ہرات کی طرف سے ۸۲۲ھ ہجری مطابق ۱۴۱۹ء میں خفغور چین

---

[1] جہاں پامالی کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد جب تیمور دم توڑنے کے لئے بستر مرگ پر لیٹا ہوا تھا تو لکھا ہے کہ ہچکیاں لیتے ہوئے کہتا تھا کہ "ہیچ آرزو در خاطر نماند" یعنی دل میں جو آرزو تھی وہ پوری ہوئی "مگر ملاقات قرۃ العین شاہرخ کہ می خواستم کہ یک نوبت دیگر دیدہ بدیدارادروشن سازم" میسر نشد" تیمور جس بیٹے کے دیدار کی تمنا لے کر مرا یہی شاہ رخ تھا اپنے بعد بیٹوں اور پوتوں پر پوتوں کی شکل میں لکھا ہے کہ تیمور نے ۳۶ اولاد چھوڑی تھی قدرتاً مرنے کے بعد بڑے جھگڑے پیش آئے مرزا خلیل سمرقند تیموری دار السلطنت پر قابض ہو گیا اور بقول صاحب روضۃ الصفا "خزائن خسروان نامدار از قلماق تا اقصی بلاد روم وہندتا نہایت شام واز خوارزم و دشت قبچاق تا آلان وچرکس و بلغار و فرنگ و دیگر تبرکات ملوک از بلاد کفر و اسلام جسے تیمور نے ۳۶ سال کی تگ و دو، لوٹ مار سے سمرقند میں جمع کیا تھا، اور بقول اسی مصنف کے "چنداں نقرہ ابیض و طلا احمر و اوانی مرصع وجواہر قیمتی در خزینہ موجود بود کہ ہرگز عشرِ عشیرآں در خیال قارون نگذشتہ" لیکن جانتے ہیں قارون کے حاشیہ خیال میں بھی جو خزانہ سما نہیں سکتا تھا اس کا انجام کیا ہوا اسی کتاب میں ہے کہ تیمور کے اسی لڑکے مرزا خلیل سلطان نے "در مدت چہار سال از ہمہ گنج وگوہر اثر نگذاشت" صفحہ ۱۰۷ روضۃ، گویا چالیس سال کی مدت پوری نہ ہوئی تھی کہ سب کچھ جمع بھی ہوا اور سب ختم بھی ہو گیا لڑائی جھگڑائی کے بعد مرزا شاہ رخ تیمور کا جانشین ہوا جو واقعی ایک نیک دل مسلمان بادشاہ تھا ہرات کو

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کے پاس روانہ کیا گیا تھا، وفد کے صدر، دربار کے ایک امیر شادی خواجہ تھے مرزا شاہ رخ نے رخصت کرتے ہوئے شادی خواجہ کو حکم دیا تھا کہ

"ازاں زماں کہ از دارالسلطنت ہرات بیروں روند تا بروزے کہ باز آمد آنچہ مشاہدہ ایشاں گردد از حوادث وکیفیت طرق وقواعد بلاد وصفت امصار واوضاع عمارات واوضاع واطوار بادشاہان وغیر ذالک بے زیادہ ونقصان بر صفحات قرطاس ثبت نمائند"

شادی خواجہ نے اپنے وفد کے ایک انشاپرداز بیدار مغز رکن خواجہ غیاث الدین کے سپرد سفر کی اس ڈائری کے مرتب کرنے کا کام کر دیا تھا جو واپسی پر بادشاہ مرزا شاہ رخ پر پیش کی گئی، شاہی کتب خانہ میں معائنہ کے بعد یہی ڈائری محفوظ کر دی گئی تھی، صاحب روضۃ الصفا خاوند شاہ نے اسی شاہی ڈائری کو اپنی کتاب روضۃ الصفا کے خاتمہ کا جزء بنا دیا ہے میرے سامنے یہی خاتمہ روضۃ الصفا کا ہے تفصیل کے لئے تو اسی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ یہاں اس ڈائری کے جن اجزاء کو میں پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہیں۔

اسلامی حدود کو چند مہینوں میں طے کرنے کے بعد وفد چینی سرحد میں داخل ہوا، قراخواجہ نامی مقام میں لکھا کہ "چینی حکومت کے لوگ آئے اور وفد میں جتنے آدمی تھے سب کے نام لکھ کر لے گئے" اس کے بعد اتا صوفی نامی آبادی میں پہنچے لکھا ہے کہ

"دراں موضع علوی از سادات ترمذ زاویہ ساختہ ولنگر اقامت انداختہ بود"۔

اور اس سے مسلمانوں کے سلف کے طرز عمل پر روشنی پڑتی ہے، حالانکہ مسلمانوں کی حکومت چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی، لیکن بجائے اسلامی علاقے کے اپنی خانقاہ چینی حکومت کے حدود میں ترمذی سید صاحب نے بنائی اور وہیں مقیم ہو گئے تھے۔ اسی کے بعد "قائل" نامی شہر میں وفد پہنچا، یہاں بھی دیکھا کہ

"امیر فخر الدین مسجدے عالی در غایت تکلف وتزئین ساختہ بود"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) دارالسلطنت قرار دیا، بڑے بڑے مدارس اور خانقاہیں اس کے زمانے میں بنیں محتسب کے ساتھ شراب خانوں کے توڑنے پھوڑنے میں کبھی خود بھی شریک ہوتا، فتح الباری صحیح بخاری کا نسخہ اپنے لیے نقل کرا کے شاہ رخ نے منگوایا تھا

حالانکہ اسی مسجد کے قریب ان ہی لوگوں کا بیان ہے کہ

"قریب باں (مسجد) بت پرستاں بت خانہ بزرگ وکوچک مصور بصور بدیع بنا نہادہ بودند ودر بیت خانہ صورت دو دیو بریک دگر حملہ کردہ نگاشتہ"

ظاہر ہے کہ مخلوقات کی عبادت سے چھڑا کر خالق کی عبادت کی طرف متوجہ کرنے کی صورت ہی اس کے سوا اور کیا ہوسکتی تھی کہ دونوں کا مقابلہ کرکے دکھایا جائے[1]۔ ورنہ مسلمان اگر اسی طرح بھاگتے رہتے، جیسے آج کل گریز کی راہ ان پر آسان کی گئی ہے، تو زمین کے پیدا کرنے والے کی عبادت کو زمین کے کرّے پر رواج دینے میں وہ کامیاب ہو سکتے تھے؟

خیر اس قصے کو چھوڑیئے، خیرسگالی کا یہ وفد اس کے بعد منزل بمنزل چینیوں کی مہمان نوازیوں سے مستفید ہوتے ہوئے سکچو نامی شہر میں پہنچا، جس کی تصویر ڈائری میں یہ کھینچی گئی ہے کہ

"شہرے ست درغایت عظمت وسورے (فصیل شہر) شامخ (بلند) برگرد آں کشیدہ اند ومعیت آں مربع متساوی الاضلاع مشتمل بر بازار ہائے عریض کہ عرض ہر بازارے چہل درعہ ست"

[1] مخلوقات سے منہ موڑ کر براہ راست جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اپنے پیدا کرنے والے خالق کے سامنے دست بستہ کھڑی ہوتی ہے اور خدا کے قدموں پر سر رکھتی ہے تو عادت کی وجہ سے خود مسلمانوں پر اس نظارہ کا اثر پڑے یا نہ پڑے، لیکن اپنے پیدا کرنے والے سے ٹوٹا ہوا آدمی جب اس نظارے کو دیکھتا ہے اور یہ تماشا اس کو دکھایا جاتا ہے، تو واقعہ یہ ہے کہ فطرت انسانی اندر سے بلبلا اٹھتی ہے، ہنری دی کاستر مشہور فرانسیسی نومسلم جس نے اسلام کی تائید میں متعدد کتابیں لکھی ہیں اس نے اسلام کیسے قبول کیا اس کی تفصیل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فرانسیسی حکومت کی طرف سے الجیریا کے کسی علاقے میں وہ فوجی افسر تھا چند عرب سپاہیوں کے ساتھ ایک دن کہیں جارہا تھا راستہ میں عصر کی نماز کا وقت آگیا عرب سپاہیوں نے نماز پڑھنے کی اجازت چاہی، جو دے دی گئی کسی تالاب میں ہاتھ دھو کر یعنی وضوء کرکے ہنری دی کاستر نے لکھا ہے وہ سامنے آئے اور ایک میدان میں صف باندھ کر نماز پڑھنے لگے، وہ گھوڑے پر سوار تھا، اس کا بیان ہے کہ اس حال کو دیکھ کر بار بار میرے دل میں ہوک اٹھتی تھی کہ اپنے پالنے والے مالک کا کیا میں دھتکارا ہوا راندہ درگاہ بندہ ہوں کہ غریب سپاہیوں کو تو خدا کے قدموں پر جھکنے کی اجازت ملی ہوئی ہے اور مجھے اس سعادت سے قدرت نے محروم رکھا ہے۔ دل میں خیال آتا تھا کہ کیا میں کتا ہوں، سور ہوں، الغرض نماز کے اسی نظارے نے ہنری دی کاستر کے دل میں اسلام کا تخم ڈالا، اور بالآخر وہی پروان چڑھا ۱۲

چالیس چالیس ہاتھ کی ان چوڑی سڑکوں کی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ

"آب زدہ و جاروب کشیدہ"

جس سے معلوم ہوا کہ مشرق کو میونسپلٹی کے قوانین سکھانے والوں نے خود ان قوانین کو کہاں سے سیکھا تھا، لیکن بھول کر کبھی اپنے مشرقی استاذوں کا نام ان کی زبان پر آتا ہے؟ اس کی شکایت مسلمانوں کو زیادہ ہے لیکن سچ پوچھئے تو احسان ناشناسی کے اس سلسلہ میں، غریب چین کو بھی مسلمانوں سے کم شاکی نہ ہونا چاہئے، بہرحال اس شہر کے چوراہوں پر ان لوگوں نے دیکھا تھا

"ہر ہر چہار سو چہار طاق بستہ در نہایت تکلف و تزئین کنگرہ ہا دراں تعبیہ کردہ اند"

لکھا ہے کہ سکچو کی سڑکیں اتنی سیدھی، صاف ستھری تھیں کہ شہر کے دروازے سے بازاروں تک پہنچنے میں گو کافی فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا، لیکن

"از غایت راستی اندک می نمود"

سکچو سے اس زمانہ میں چین کا جو دار السلطنت خان بالیغ نامی تھا، ان دونوں شہروں کے درمیان میں ان ہی لوگوں کا بیان ہے کہ ننانوے بام تھے اور ہر بام کے بیچ میں ایک قرغوی واقع تھا، بام سے مراد شاہی تھانے ہیں، لکھا ہے کہ

"ہر بامے مشتمل بر شہرے و قصبہ"

باقی یہ قرغوی جو ہر دو بام کے بیچ میں تھا، اس کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ

"قرغوی عبارت از خانہ کہ ارتفاع ان شصت گز باشد و پیوستہ دریں خانہ دو کس باشند داں راجیان ستاند کہ قرغوی دیگری نماند"

مطلب یہ ہے کہ چھ گز اونچی عمارتیں مسلسل بنی ہوئی تھیں ہر قرغو سے دوسرے قرغوی کا فاصلہ اتنا ہوتا تھا کہ ایک سے دوسرا نظر آئے۔ لکھا ہے کہ ملک کے کسی حصہ میں کسی قسم کا کوئی غیر معمولی حادثہ جب پیش آتا تھا تو ایک قرغو پر آگ جلائی جاتی، جسے دیکھ کر دوسرے قرغو والے بھی آگ روشن کرتے مسلسل یوں ہی خان بالیغ تک جتنے قرغو تھے سب میں آگ روشن ہو جاتی، نتیجہ یہ تھا کہ ایسے مقامات جہاں خان بالیغ

سے آدمی تین تین مہینوں میں پہنچتا تھا، لیکن وہاں کی خبر چوبیس گھنٹے کے اندر اندر دار السلطنت تک پہنچ جاتی تھی اس کے ذریعہ سے حادثہ کے ظہور کا اجمالی علم ارباب بست وکشاد کو ہو جاتا تھا پھر تفصیل کے لئے دوسرا نظام تھا جسے چینی زبان میں "کبدی قو" کہتے تھے۔ ڈیڑھ ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر "کبدی قو" کے لوگ رہتے تھے، جہاں حادثہ رونما ہوتا تھا، وہاں سے تفصیلی رپورٹ لکھ کر اس علاقہ کا ناظم ایک کبدی قو کے رہنے والوں کے حوالہ کرتا تھا، اور وہ دوڑ کر دوسرے "کبدی قو" والوں کے حوالہ اس رپورٹ کو کرتا، اور یوں دست بدست یہ رپورٹ دار السلطنت، خان بالیغ میں پہنچ جاتی تھی، کبدی قو والے مستقل سکونت اس مقام پر رکھتے تھے۔ بخلاف قراغو والوں کے کہ دس دس آدمی باری باری اس عمارت میں قیام کرتے تھے اور آگ کے منتظر رہتے تھے آپ دیکھ رہے ہیں۔ تار اور بے تار کے برقی پیغاموں کی ایجاد سے پہلے بہت پہلے چین خبر رسانی کے مسئلہ میں ارتقار کے کس مقام تک پہنچ چکا تھا۔ پھر خیر سگالی کا یہ وفد قچو پہنچا، جہاں سے دیکھا کہ مسافروں کے لئے رکشا یعنی آدمی سے کھینچے جانے والی گاڑیوں کا انتظام ہے اور خچر کی گاڑیاں بھی ملتی ہیں، رکشا کے متعلق لکھا ہے کہ

"ارابہائے بطریق گاذ بردوش می کشند وہر ارابہ بر عہدہ دوازدہ کس است"

گویا باری باری سے یا مل کر بارہ بارہ آدمی اس رکشے کو کھینچتے تھے۔ ان لوگوں کا بیان ہے کہ

"ہر چند بارندگی وسرما باشد از ارابہ رانی باز نماند"

چینیوں کی غیر معمولی سخت کوشیوں کا جس سے اندازہ ہوتا ہے۔ عموماً خیر سگالی کا یہ وفد جس کی سواری کے لئے گھوڑے کا نظم حکومت کی طرف سے کر دیا جاتا تھا خان بالیغ تک ان ہی سنانوے یاموں میں سے ایک ایک یام پر ان کو اتارا جاتا تھا۔ جہاں

"گوسفند وقاز و مرغ و برنج وعسل وآرد وانواع بقول آمادہ دہیا ص ۳۸"

ہر یام کے افسر کی طرف سے ان ایلچیوں کی دعوتیں بھی ہوتی تھیں، جن میں بڑی دعوتوں (ریتی ڈنر) کے سوا ایسا معلوم ہوتا ہے، چینیوں میں ایٹ ہوم دینے کا بھی رواج تھا ایک مقام کا ذکر کرتے ہوئے اسی ڈائری میں اطلاع دی گئی ہے کہ خوبصورت خوبصورت نوجوان لڑکے

"طبقہائے پر قند، وعناب، وچہار مغز وشاہ بلوط مقشر، ولیموں وسیر و پیاز سرکہ پروردہ وخربزہ وہندوانہ (تربوز) بریدہ برکف نہادہ بودند"

گویا آج کل جیسے بیرے اور بوائے ایٹ ہوموں میں کیک، پیسٹری، بسکٹ وغیرہ لئے ہوئے مہمانوں کے سامنے گھومتے پھرتے ہیں کچھ یہی رنگ اس دعوت کا نظر آتا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ایٹ ہوم کی اس مجلس میں اس قسم کے تفریحی مناظر بھی پیش کئے جاتے تھے کہ

"بازی گراں از کاغذ و مقوی صور جانوراں ساختہ بودند بر روئے خود بستہ چناں کہ بر ہیچ وجہ روی وگوش وگردن ایشاں نمی نمود"

یہ بھی لکھا ہے کہ لک لک کی صورت بنانے والے نے جو تماشے دکھائے وہ ان کو بہت پسند آئے بہرحال یوں ہی ہر ہر بام میں دعوتیں کھاتے، ایٹ ہوم اڑاتے ہوئے خیر سگالی کا یہ وفد خان بالیغ یعنی چین کے دارالسلطنت کی فصیل کے نیچے پہنچ گیا، یہ بھی بیان کیا ہے کہ جیسے جیسے پایہ تخت سے وفد قریب ہوتا جاتا تھا دعوتوں کے تکلفات میں اضافہ ہوتا جاتا تھا اسی سلسلہ میں ان کو ایک دریا بھی ملا تھا جس جس کا نام قرامون بتایا ہے جس پر لکھا ہے کہ ۲۳ کشتیوں کا پل بندھا ہوا تھا اور کشتیوں کو اتنے موٹے موٹے رسوں سے باندھا گیا تھا کہ آدمی کے ران کے برابر ان رسوں کی موٹائی تھی ان رسوں کو ان آہنی لاٹوں میں لپیٹ دیا گیا تھا جو ساحل سے ایک میل دور گڑے ہوئے تھے ان آہنی ستونوں کو بھی بیان کیا ہے کہ آدمی کی کمر سے ان کی ضخامت کم نہ تھی، پایہ تخت (خان بالیغ) میں پہنچ کر ان لوگوں کی مہمان نوازی کا حکومت کی طرف سے جو سامان کیا گیا تھا اور جب تک وفد وہاں مقیم رہا مہمان نوازی کے ان سامانوں سے مستفید ہوتا رہا لکھا ہے کہ ایک ایسے مکان میں اتارے گئے، جس کا ایک ایک کمرہ ہر رکن وفد کے لئے مختص تھا۔ اس کمرے میں ایک پلنگ جس کے متعلق بیان کیا ہے کہ

"با بستر و بالش وتکیہ، اطلس وکمخواب"

ان میں ہر ایک کو دیا گیا اور اسی کے ساتھ

"کفش کفی بغایت نازک، وصندلی (تخت) ومنقل آتش (انگیٹھی)، دراں حصیر ہائے نازک انداختہ"

یعنی ہر پلنگ کے پاس کیمخت چمڑے کی بنی ہوئی جوتیاں، پلنگ کے ساتھ ایک تخت اور انگیٹھی بھی ہر مہمان کو دی گئی اور کمرے میں چین کی بنی ہوئی نازک و نفیس چٹائیوں کا فرش بچھا ہوا تھا، اسی کے ساتھ روزانہ ہر ایک کے لئے غذا کی جو مقدار مقرر کی گئی تھی حالانکہ سینکڑوں سال پہلے کی بات ہے لیکن سننے والوں کے منہ میں ممکن ہے اب بھی پانی بھر آئے لکھا ہے کہ

"ہر کسے را روزے دہ سر گوسفند، یک قاز، دو مرغ، دو من آرد (یعنی دو سیر آٹا) بوزن شرع دیک کاسہ بزرگ برنج (چاول) دو کلیچہ پر حلوا و یک ظرف عسل (شہد) و سیر (لہسن) و پیاز و نمک و بقول (سبزیاں اور ترکاریاں) متنوعہ و یک طبق نقل (مٹھائیاں خشک میوے وغیرہ) ۔"

یہ ایک ایک مہمان کی یومیہ رسد تھی ظاہر ہے کہ ان معزز مہمانوں کے ساتھ خدام حوالی موالی جو تھے ان کی رعایت بھی کی گئی ہوگی، ورنہ ایک دن میں دس بکروں، ایک قاز دو مرغوں، کا گوشت بھلا تنہا ایک آدمی کیسے کھا سکتا تھا،

خان بالیغ میں شاہی دربار میں جب وفد پیش کیا گیا، دربار کے جو تفصیلات اس کتاب میں دئے گئے ہیں ان کا نقل کرنا تو دشوار ہے، تاہم چند باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ایک تو یہ کہ وفد والوں سے پہلے بادشاہ کے سامنے دیکھا گیا کہ کچھ لوگ پیش ہوئے جن کے گلوں میں تختیاں پہنا دی گئی تھیں اور سپاہی ان کے سر کے بال پکڑے ہوئے تھے، وفد والوں کو بتایا گیا کہ یہ وہ لوگ ہیں، جن کو عدالت نے تحقیقات کے بعد مجرم قرار دیا ہے، ان کے گلے میں جو تختی ہے، اسی میں مجرم کے جرم کی نوعیت اور جرم کے مطابق چینی قانون کے رو سے سزا وغیرہ لکھی ہوئی ہے۔

بیان کیا ہے کہ اس زمانہ میں چینی عدالتوں کا کام صرف یہ تھا کہ مجرم کے جرم کی تحقیق کر کے فیصلہ اور سزا وغیرہ لکھ دی جائے لیکن سزا کا نفاذ اس کا اختیار کسی کو نہ تھا، الفاظ کتاب کے یہ ہیں

"ہیچ حاکم و داروغہ مرخص بحکم قتل نیست"

بلکہ وہاں دستور ہے کہ

"ہر کہ گناہ کند، گناہ او بر تختہ پارہ نوشتہ در گردنش او یزند حتیٰ گناہش را نیز قلمی کنند" سزا ۱۲

چین جیسے وسیع ملک میں "مجرموں" کے ساتھ یہ عجیب سلوک تھا یعنی تختیاں ڈال ڈال کر سب کو خان بالیغ بھیج دیا جاتا تھا اور بادشاہ کے سامنے براہ راست سب پیش ہوتے تھے۔

"منتظر تا بادشاہ چہ فرمان دہد"

ان لوگوں نے دیکھا کہ بادشاہ نے بعضوں کے قتل اور بعضوں کو قید خانے بھیج دینے کا حکم دیا جب مجرموں کا فیصلہ ہوگیا تب خیر سگالی کا یہ وفد بادشاہ کے سامنے پیش ہوا۔ لکھا ہے کہ بادشاہ میانہ قد تھا، ڈاڑھی نہ زیادہ بڑی تھی نہ چھوٹی، دلچسپ بات یہ دیکھی کہ ڈاڑھی کے چند بال دو ڈھائی سو کے قریب،

"چناں دراز بود کہ سہ چہار حلقہ زدہ بود"[1]

یعنی ہندوستان میں سر کی چوٹیوں میں کبھی گرہ ڈال دی جاتی ہے کچھ اسی طریقہ سے ڈاڑھی کی چوٹیوں میں گرہ ڈالنے کا رواج چین میں تھا پھران کی نظر پڑی اور دیکھا کہ بادشاہ کے تخت کے دائیں بائیں جانب

"دو دختر ماہ پیکر، خورشید منظر موئے ہائے عنبریں جہاں سر کردہ و عارض و گردن مکشوف کشادہ و در ابدہائے در گوش نشستہ و کاغذ و قلم در دست منتظراں کہ بادشاہ ہرچہ گوید بنویسد"

گویا اسٹینوگرافروں کا خواتین سے خصوصی انتخاب کا طریقہ دراصل چین ہی کی اپج تھی اور چین ہی سے وہ وضع بھی ماخوذ معلوم ہوتی ہے جو آج کل آزاد منش خواتین میں زیادہ مقبول ہے خیر خان بالیغ پہونچنے کے بعد ان لوگوں کو یہ بھی معلوم ہوا، کہ چینی حکومت دوازدہ دیوان (یعنی بارہ وزارتوں) پر منقسم، جن میں ایک دیوانی (وزارت)

"مولانا خواجہ یوسف قاضی"

نامی ایک مسلمان کے سپرد بھی ہے، لکھا ہے کہ

"قاضی از جملہ مقربان بود و از دوازدہ دیوان بادشاہی یکے تعلق بادمی داشت" ص ۳۹

---

[1] حیدرآباد کے نواب افسرالملک جن کے سفرنامہ چین کا ذکر آئے گا، اس میں لکھا ہے کہ چینیوں کا قاعدہ ہے کہ ڈاڑھی کے چند بالوں کو مطلقاً بڑھنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ ان بالوں میں تصرف سے ان کے پوتوں پر کوئی مصیبت آجاتی ہے۔ گویا ہندوستان میں سر کے بالوں کے ساتھ جو عمل کیا جاتا ہے یعنی چوٹی کے لئے کچھ بال چھوڑ دئے جاتے ہیں یہی ہندوستانی سر کی چوٹی چینیوں کی ڈاڑھی میں منتقل ہوگئی تھی ۱۲

اسلامی ممالک سے جو وفود چین پہنچتے تھے ان کی ترجمانی قاضی صاحب کے سپرد تھی۔ خود خیر سگالی کا یہ وفد ایک مصیبت میں آگیا تھا، قاضی صاحب اپنے اثر سے اگر کام نہ لیتے تو شاید ان کا قصہ ہی ختم ہو جاتا، جس کی داستان طویل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ تیمور کا ایک خاص گھوڑا بھی مرزا شاہرخ نے شاہ چین کے پاس دوسرے تحائف کے ساتھ بھیجا تھا۔ شاہ چین تیمور کی سواری کے اسی تاریخی گھوڑے پر چڑھ کر شکارگاہ گیا۔ گھوڑا قابو سے نکل گیا بادشاہ گر پڑا ہاتھ میں کافی چوٹ آئی تکلیف کی شدت سے بے چین ہو کر بادشاہ کہنے لگا کہ وفد والوں کی غفلت سے میں گرا گھوڑے کی عادت سے ان لوگوں نے پہلے مطلع کیوں نہ کر دیا حالانکہ اس کو سمجھنا چاہیے تھا کہ تیمور کے گھوڑے کو تیمور ہی قابو میں رکھ سکتا تھا مگر غصہ میں وفد والوں کو ملزم قرار دے کر سزا دینے کا منصوبہ پکانے لگا قاضی یوسف صاحب کو جب حال معلوم ہوا تو اپنے ہم پیشہ دو غیر مسلم وزیروں ولیلاجی و جال واجی کو راضی کیا کہ بادشاہ کو سمجھانا چاہیے، جب شکارگاہ سے خان بالیغ بادشاہ واپس ہوا، تو قاضی صاحب ان دونوں وزیروں کے ساتھ بادشاہ سے ملے سمجھایا کہ ان لوگوں کا کوئی قصور نہیں ہے اور یہ سفراء ہیں سفیروں کے ساتھ یہ بین الاقوامی قانون ہے کہ کوئی بدبرتاؤ ان کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کی بدنامی سارے عالم میں ہوگی۔ بادشاہ نے قاضی صاحب کی بات مان لی۔ بڑے خوش خوش رئیس وفد سے ملے اور بولے کہ ع رسید بود بلائے ولے بخیر گذشت

بظاہر قاضی صاحب کی صحبت ہی کا نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وفد جب پہلی دفعہ بادشاہ کے سامنے پیش ہوا تو مرزا شاہرخ کے حالات دریافت کرتے ہوئے فغفور چین نے پوچھا کہ تمہارے بادشاہ کے علاقے میں ضرورت کی چیزوں کے نرخ کا حال کیا ہے جواب میں جب یہ اطلاع دی گئی کہ

"غلہ از سرحد کمال بیرون ست و نعمت از ہرچہ تصور کنند ارزاں و افزوں"

یہ سن کر فغفور چین کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری ہوئے

"آرے چوں دل بادشاہ با خداوند تعالیٰ ست حضرت آفریدگار نعمت بسیار ارزانی داشتہ" صنہ

ظاہر ہے کہ آفریدگار (خالق کائنات) کی یاد اور اس کے فضل و احسان کا ذکر ایک مخلوق پرست قوم کے بادشاہ کی زبان پر کسی موحّد کی صحبت ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے اسی ڈائری میں یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں حکومت

چین مسلمانوں کا خیال اس حد تک کرتی تھی کہ شہر میں مسجدیں کی تعمیر ہی کرتے کی ان کو اجازت نہ تھی بلکہ

"مسجدے کہ بادشاہ دریں شہر جہت ایشاں (مسلماناں) ساختہ"

یعنی غیر مسلم بادشاہ نے مسلمانوں کے لئے شاہی مسجد تعمیر کرائی تھی اور صرف یہی نہیں بلکہ اسی ڈائری میں یہ اطلاع بھی دی گئی ہے کہ ہر سال بادشاہ چندروز کے لئے سب سے الگ ہو جاتا ہے،

"در خانہ کہ ہیچ صورت و بت نبود بسر می برد و می گفت کہ "خدائے آسمان" را عبادت می کنم" ص۱۷

حالانکہ اس زمانہ میں جیسا کہ اسی ڈائری سے معلوم ہوتا ہے سارا ملک چین بڑی بڑی مورتیوں سے بھرا ہوا تھا بعض بتوں کا قد لکھا ہے کہ

"قامت پنجاہ گز و درازی قدمش نہ گز"

بھلا نو گز جس کے قدم کی طوالت ہو، اسی سے اندازہ کیجئے کہ وہ کتنا بڑا ہوگا۔ سر کے متعلق لکھا ہے کہ ۲۱ گز کا تھا۔ بت پرست ممالک میں اتنی لمبی چوڑی مورتیاں کم از کم اس زمانے میں چین کے سوا شاید کسی دوسری جگہ نہیں تھیں مگر باوجود اس کے مولانا یوسف قاضی اور ان ہی جیسے علماء [illegible] یہ سوال اٹھائے بغیر کہ چین میں مسلمانوں کی تعداد کیا ہے اور اس حساب سے وزارت میں ان کا حصہ کتنا ہونا چاہئے چین کی غیر مسلم اکثریت اور اس کے امراء، وزراء، بادشاہ سے ایسے خوشگوار تعلقات قائم کر لینے میں کامیاب ہو گئے کہ ایک طرف دنیاوی نفع یہ حاصل کیا کہ بارہ وزارتوں میں سے ایک مستقل وزارت پر قابض تھے اور دوسری طرف مسلمانوں کو جس حد تک نفع پہنچا سکتے تھے، پہونچاتے رہے، خیر سگالی کے اسی وفد ہی کو دیکھئے ان کی جان بھی قاضی صاحب کی بدولت بچی، سچ پوچھئے تو چین کے اسی قسم کے مسلمان حکام نے اس ملک کو مسجدوں سے بھر دیا۔ اسی خان بالیغ میں کون کہہ سکتا ہے کہ اس "شاہی مسجد" کے سوا مسلمانوں کے محلوں میں کتنی مسجدیں ہوں گی۔ ابن بطوطہ وغیرہ میں اس کی تفصیل پڑھئے، ۱۹۵۲ء جولائی میں اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ چین کے موجودہ پایہ تخت پیکنگ میں مسلمانوں کی (۹۴) مسجدیں ہیں (دنیا زمانہ ۱۳ جولائی ۱۹۵۲ء)

بہر حال اس وفد نے چینیوں کے تمدن و تہذیب کا جو نقشہ کھینچا ہے بعض بعض مقامات پر پندرہ پندرہ منزلہ ایسی عمارتیں ان کو اس ملک میں نظر آتی تھیں جن میں ہر منزل کا دوسری منزل سے تعلق ایک مرکزی آہنی

لاٹ سے قایم تھا۔ بیان کیا ہے کہ ہلکے سے اشارے سے یہ ساری عمارت گردش میں آجاتی تھی، ان لوگوں کی روایت ہے کہ چین کے

"واہلِ اسلام آں را چرخِ فلک می خوانند"

سونے چاندی مرمر اور مختلف قیمتی پتھروں کے جو مکانات مرمریں تختیوں پر طلاکاری کے جن نمونوں کے دیکھنے کا موقعہ ان کو ملا، اسی طرح دوسری نازک صنعتوں اور ماہرانہ کاریگریوں کا ذکر ان لوگوں نے کیا ہے ان کو سن کر آدمی حیران ہو جاتا ہے جشن شاہی کی تقریب سے چینی بازیگروں کے تماشے رسیوں پر الٹ کر سر کے بل لوگوں کا چلنا، بانس پر چڑھنے کی غیر معمولی مہارتیں ایک آدمی نوک پر جاکر بیٹھ جاتا ہے اچھل کر دوسرا اس کے کندھے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے تا آنکہ اسی طرح بیس آدمی یکے بعد دیگرے ایک دوسرے پر چڑھ گئے اس قسم کی ساری باتیں اس کتاب میں پڑھنے کے قابل ہیں اسی موقعہ پر چینیوں کی روشن گری اور آتش بازیوں میں ان کی ذہنی اور عملی دل چسپیوں کا جو ذکر کیا گیا ہے پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتی ہیں واقعہ تو یہ ہے کہ برق اور بجلی کے ان دنوں میں اگر ہم نہ ہوتے تو شاید اعتبار بھی نہیں کر سکتے تھے لکھا ہے کہ لاکھوں چراغوں کو رسیوں سے جکڑ کر جب ٹھیکریوں پر ان کو قایم کر لیتے تھے تو

"چوں یک چراغ برافروزد موشک (چھچھوندر آتشبازی کی) براں ریسماں نہادہ، دو، بہر چراغ رسد روشن سازد وبہ یک لحظہ چراغہا از بالائے کوہ تا پایاں روشن شود صلہ"

بہرحال چین کا ایک دور تو یہ تھا اور دسویں ہجری تک اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ چینی اپنے ملک میں امن اور چین سے گذار رہے تھے۔ سوچنے کی بات ہے جس ملک کے بادشاہ کے دل و دماغ پر سب سے زیادہ یہ سوال چھایا ہوا ہو کہ ملک میں چیزوں کا نرخ کیا ہے اسی لئے اپنے ہم عصر بادشاہ شاہرخ کے متعلق پہلی بات اس نے یہی پوچھی، اور یہ سن کر کہ ضرورت کی ساری چیزیں ارزاں ہیں اطمینان کا اظہار کرتا ہے ایسے بادشاہ کی رعایا امن و عافیت کے جس حال میں بھی ہو اس پر متعجب نہ ہونا چاہئے کون کہہ سکتا ہے کہ شخصی حکومت کی مغالطہ آمیز تعبیر سے جن حکمرانوں کی حکومت جمہوریت کے اس دور میں بدنام کی گئی ہے واقع میں وہ ان رسوائیوں کی مستحق تھی؟ بہرحال تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ

جمہوریت کے دور میں ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں سب کے سامنے ہے پھر یکایک زمانے نے پلٹا کھایا، یورپ کے مشرقی و مغربی برفستانوں میں جو قومیں ٹھٹھک رہی تھیں، وہ کھول دی گئیں، لکھا ہے، کہ ۱۵۱۷ء میں یعنی ہجری کے حساب سے ہزار سال پورے ہو چکے تھے کہ سب سے پہلے شاہ پرتگیز نے دربار چین میں اپنا سفیر بھیجا اور اسی کے بعد یکے بعد دیگرے یورپ کی دوسری حکومتوں کے سفراء چین پہنچنے لگے اس سلسلے میں ایک ہندو مصنف منشی رادھے لال رئیس موہان کا میں ممنون ہوں ان کی ایک کتاب ۱۸۷۰ء میں مطبع نول کشور میں شائع ہوئی تھی، نام[1] تو اس کتاب کا کچھ عجیب سا ہے۔ لیکن معلومات کا ایک قیمتی ذخیرہ اس کتاب میں منشی صاحب نے جمع کر دیا ہے۔ اردو فارسی کے علاوہ انگریزی زبان سے بھی وہ واقف تھے، زیادہ تر انگریزی زبان کی کتابوں اور اخباروں سے چین کے متعلق منشی صاحب نے فائدہ اٹھایا ہے، معلومات دلچسپ تھے، جی چاہا کہ پہلے دور کے بعد دوسرے دور کے متعلق منشی صاحب ہی کی کتاب کی چیزوں کو پیش کر دوں —

انھوں نے لکھا ہے کہ ۱۵۱۷ء میں پرتگیزی سفیر جب کینٹن جو اس زمانہ میں چین کا پایہ تخت تھا جب پہنچا تو اسی کے پیچھے پیچھے جزیرہ ملاکا کا جو مسلمان سلطان تھا اس نے شاہ چین کو مطلع کیا کہ جزائر شرق الہند کو پرتگیز والوں نے اپنی من مانی خواہشوں کی آج کل آماجگاہ بنا رکھا ہے۔ اور یہ کہ

"جو لوگ سفیر بن کر آتے ہیں وہ جاسوس ہیں ان کے آنے سے خطرہ ہے کہ چین تلوار اور آگ سے تباہ نہ ہو جائے" صفحہ ۲۶

منشی جی نے لکھا ہے، سلطان ملاکا کی رپورٹ سے شاہ چین بہت متاثر ہوا، اور پرتگیزی سفیر جس کا نام "پریزا" تھا وہ بادشاہ چین کے حکم سے قید کر لیا گیا۔

چھ سال قید رہنے کے بعد شاہ چین کے حکم سے پریزا قتل ہو گیا، مگر پرتگیزیوں نے نہ احتجاج ہی کی آواز بلند کی، اور نہ ان کی حمیت کی رگ پھڑکی، لکھا ہے بلکہ بجائے اس کے شاہ پرتگیز نے

"فرانسس زیور۔ اور ڈان دیکوبرین صاحب کو کچھ تحائف کے ساتھ شہنشاہ چین کے پاس روانہ کیا" صفحہ ۲۶

مگر ان کو فغفور کے دربار تک رسائی میسر نہ آئی۔

---

[1] یعنی "سدرس البحث" نام اس کتاب کا منشی صاحب نے رکھا ہے، چھ عنوانوں پر کتاب میں بحث کی گئی ہے وجہ تسمیہ اسی کو قرار دیا ہے ۱۲

پرتگیزیوں کے بعد ۱۶۶۷ء میں پرتگال والوں نے اپنا سفیر چین بھیجا، ان کے بعد پھر پرتگیزیوں کے مسلسل سفیر چین میں پے در پے دھمکتے رہے اور بادشاہ سے خوشامد برآمد کی باتیں کر کے اس کا حق حاصل کیا کہ جیسے اس ملک میں لوگوں کو دین اسلام میں داخل ہونے کی اجازت ہے، یہی اجازت عیسائی مذہب کو بھی عطا فرمائی جائے، بادشاہ نیک دل نے اجازت دے دی لیکن چند ہی دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ مذہب کی چادر اوڑھ کر دراصل سیاسی بازیگر ملک میں آئے ہوتے ہیں، منشی رادھے لال نے لکھا ہے کہ شاہ چین نے پرتگیز کے بادشاہ شاہ جان نامی کے پاس اپنے آدمی اس خط کے ساتھ روانہ کئے کہ

"مذہب رومن کیتھولک کے جو پادری یہاں آئے ہیں، اور جن لوگوں کو اپنے مذہب میں داخل کیا ہے وہ پادری چاہتے ہیں کہ یہ لوگ چین کے قانون کے پابند نہ ہوں"

شاہ چین نے آخر میں لکھا تھا کہ اپنے ان مذہبی پیشواؤں کو جو مذہب کے نام سے سیاسی جال پھیلا رہے ہیں، ان کو حکم دیجئے کہ

"ایسی کارروائی سے باز رہیں" ص۲۶

لیکن پادری اپنی سیاسی دسیسہ کاریوں سے پھر بھی باز نہ آئے، منشی صاحب کا بیان ہے کہ اسی عرصہ میں

"چین میں جدید بادشاہ تخت نشین ہوا، اس نے قطعی حکم دیا، کہ عیسائی مذہب کا کوئی پادری چین میں نہ آنے پائے اور نہ کوئی شخص اپنا مذہب تبدیل کرے" ص۲۶

اور یہ ہوا انجام ان لوگوں کا جو مذہب کو سیاسی تحریک کا آلہ بنانا چاہتے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کے بعد مذہب مذہب نہیں بلکہ بجائے سچائی، اخلاص و صداقت کے صرف فریب اور دھوکہ بن کر رہ جاتا ہے اسی چین میں صدیوں سے مسلمان آباد تھے اور آئے دن لوگ اسلامی دین کو قبول کر کر کے مخلوقات کی عبادت سے تائب ہو کر اپنے پیدا کرنے والے خالق کے مخلص بندے بنتے چلے جا رہے تھے مگر اسی ملک کے باشندوں کی کمائی اور محنت سے ناجائز نفع اٹھانے کا ذریعہ جب پادریوں نے چاہا کہ مذہب کو بنا لیا جائے تو آپ نے دیکھا کہ چین میں مذہب کے ادلنے بدلنے کے قصے ہی کو اس بادشاہ نے روک دیا بظاہر اس زمانے میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دین کے قبول کرنے کا بازار اس ملک میں کچھ دنوں کے لئے ان ہی پادریانہ حرکتوں کی وجہ

سے سرد پڑ گیا ہوگا۔ مگر یورپ کی کھوئی جانے والی قوموں پر تو سیاسی اقتدار کا بھوت سوار تھا، ان کے سفراء اور قوم کے لوگ چین سے نکالے بھی جاتے تھے۔ لیکن ان کے بادشاہوں کی طرف سے سفیروں کے بھیجنے کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا، ان سفیروں کی توہین و تذلیل و تحقیر میں کوئی دقیقہ چین کی حکومت نے اٹھا نہ رکھا لیکن بے حیائی کے تو بڑے چہروں پر چڑھائے ہوئے اس ملک میں وہ گھسے ہی چلے جاتے تھے منشی رادھے لال نے روس کی سفارت کا تفصیلی حال درج کرتے ہوئے روسی سفیر کی ذاتی ڈائری کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ جب شاہ چین کے سامنے ہم آئے تو

"نقیب نے آواز دی کہ تخت کے روبرو کھڑے رہو اور تین دفعہ سجدہ کرو، جب سفیر سجدہ کر چکے تو اسی طرح پھر نقیب نے سفیروں کو تین مرتبہ سجدہ کرایا اور اٹھایا اور حکم دیا کہ اپنی جگہ واپس جاؤ"

گویا دو دفعہ تو تین تین سجدے کرائے گئے، لکھا ہے کہ

"پھر گھنٹہ کی آواز آئی، اس آواز کے سنتے ہی سب ہی لوگ پھر سجدہ میں گر پڑے" صفہ۳

اور سجدوں کا قصہ ختم نہیں ہوا، بلکہ

"حکم تھا کہ جب شہنشاہ برخاست کریں اس وقت سب لوگ سجدہ میں گر پڑیں" صفہ۳

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کے ان سفیروں کے ساتھ حکمران چین کا یہ خاص برتاؤ تھا، کیونکہ شاہ برخ والے خیرسگالی کے وفد میں بار بار کے ان سجدوں کا ذکر ہم نہیں پاتے، منشی رادھے لال نے اسی سلسلہ میں یہ خبر بھی دی ہے کہ

"شاہ ڈچ نے ۱۶۶۶ء میں پھر سفیر بھیجے وہ ۴۶ یوم تک پیکن میں رہے، ان کو نہایت حقارت ہوئی اور ان سے لاانتہا سجدے کرائے گئے، صفہ۳

جس سے پتہ چلتا ہے کہ یورپ کے ان سفیروں سے یہ سجدے محض ان کی تحقیر و توہین ہی کے لئے کرائے جاتے تھے اور یہ جانتے ہوئے کہ شاہ چین علانیہ اس طریقے سے ان کی توہین کر رہا ہے یورپ کے بھی سفیر بخندہ پیشانی غایت اطمینان کے ساتھ سجدوں پر سجدے کئے چلے جاتے تھے۔ کردار کی بلندی، ضمیر کی آواز کا یہاں پتہ بھی نہ تھا، سجدہ کرنے والے ان سفیروں کے سلسلے میں ایک دلچسپ تماشا یہ بھی ایک دن

پیش آیا منشی جی نے نقل کیا ہے۔

"جوزف ڈی کیفر ایک سفیر تھا اس نے سجدے سے سر اٹھا کر شہنشاہ کو دیکھا... معلوم ہوا کہ شہنشاہ بہت خوبصورت اور کم سن ہیں شہنشاہ سر سے پیر تک سونے اور جواہرات میں غرق تھے ان پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی" ص۳۵

اور میں تو سمجھتا ہوں کہ انگریزی سفیر کے متعلق منشی جی نے جو یہ دلچسپ اطلاع درج کی ہے کہ

"اخبارات سے معلوم ہوا کہ جب سب سفیر دربار میں حاضر ہوئے، اور سفیر انگلستان نے شہنشاہ کی صورت دیکھی، تو شہنشاہ چین کے جاہ و جلال اور دربار کا جلوس دیکھ کر زبان بند ہو گئی غش آگیا" ص۲۸

واللہ اعلم بالصواب اخباروں کی اڑائی ہوئی یہ خبر کہاں تک صحیح ہے۔ لیکن اگر یہ واقعہ پیش آیا تھا تو کون کہہ سکتا ہے کہ مشرقی بادشاہوں کے نفسیات کے ساتھ یہ کوئی انگریزی کھیل نہ تھا شاید اسی طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا تھا جیسا کہ منشی صاحب ہی کا بیان ہے کہ جب لارڈ میکارینی انگریزی سفیر دربار چین میں باریاب ہوا تو بادشاہ نے حکم دیا کہ

"کل سردار انگریزی کپڑے پہنیں" ص۳۱

لارڈ میکارینی نے اپنی یادداشت میں یہ بھی لکھا تھا کہ

"شہنشاہ چین اس روز مخملی پوشاک پہنے ہوئے تھے اور زردوزی کا اس پر کام تھا اور انگلستان کا تمغہ لگائے ہوئے تھے" ص۳۰

یہ بھی لارڈ صاحب ہی کا بیان ہے کہ انگریزوں سے حکومت چین کے تعلقات اس قدر بڑھ چکے تھے کہ ان کی باریابی کے موقعہ پر

"شہنشاہ کا جو وزیر تھا وہ یونیورسٹی اکسفرڈ کا تعلیم یافتہ تھا" ص۳۱

گویا یونیورسٹی کی راہ سے انگریزی قوم کے لئے زمین کا درست کرنے والا خود چینیوں ہی میں پیدا ہو چکا تھا لارڈ میکارینی کی اسی سفارت کے سلسلہ میں یہ اطلاع بھی اسی کتاب میں دی گئی ہے کہ لارڈ صاحب

"شاہ انگلستان کی طرف سے چٹھی اور ایک بکس جواہرات کا لے گئے تھے"۔

اس بکس کو لاٹ صاحب نے جس طریقہ سے پیش کیا تھا، وہ بھی سننے کے قابل ہے لکھا ہے کہ

لارڈ صاحب

"حسب ہدایت بکس اور چٹھی کو سر سے اونچا کئے ہوئے، شہنشاہ کے روبرو بے گئے، جب زینہ پر چڑھے آداب بجالائے بکس و چٹھی شہنشاہ کے نذر کیا۔"

بادشاہ نے کہا کہ

"ایک شخص ایسا چاہیے جو تمہاری چٹھی کا ترجمہ زبان چینی میں ہم کو سنادے۔"

انگریزی حکومت کے لاٹ جہاں ضرورت پڑتی تھی کلی کا کام بھی کر لیا کرتے تھے، ور اس وقت تو کی غیرت و حمیت کا بارہ نقطہ انجمادی پر ٹھہرا رہتا تھا، خیر بادشاہ کی اس خواہش پر دیکھا گیا کہ چینی زبان کے سکھانے کا نظم انگریز کر چکے تھے، وفد کا ایک نوجوان رکن اسٹغین نامی آگے بڑھایا گیا، جس نے فراٹے کے ساتھ انگریزی زبان کی بہ چٹھی

"کا ترجمہ شاہ کو سنایا، شہنشاہ اس لڑکے سے نہایت خوش ہوئے اور ایک بٹوہ اشرفیوں سے بھرا ہوا جو شاہ کے پاس ہر وقت رہتا ہے[1] لڑکے کو مرحمت ہوا۔"

کلی کے کام کرنے والے ان لاٹ صاحب کی شاہ چین نے بعد کو دعوت بھی کی

"اور اپنے میز پر کھانا کھلایا شراب اپنے ہاتھ سے دی اور خود شراب لی اور کہا کہ جام تندرستی شاہ انگلستان کا پیتا ہوں۔" ص۳۲

دیکھا آپ نے فغفور چین کی تجلی کو ناقابل برداشت قرار دے کر بے ہوش ہو جانے اور غش کھا کر گرنے کے تماشے کو دکھا کر انگریزوں کے اقتدار کو دربار چین میں کہاں تک بڑھانے میں کامیابی حاصل کی گئی

---

[1] ہمارے وطن کے مغل بادشاہوں کا دستور بھی تھا کہ حضر و سفر اندر و باہر جہاں کہیں ہوں، ایک بٹوہ جسے جیب کہتے تھے ساتھ ساتھ ہر وقت رہتا تھا، اس بٹوہ میں لکھا ہے کہ اکثر اشیار ضروریہ از تراکیب و ادویہ مانند تریاق فاروق و دواء المسک و نوشدارو و کمونی، و زہر مہرہ و مومیائی و جدوار و امثال آں و محتوی بر صد اشرفی و صد روپیہ کہ ہموارہ در سفر و حضر در دون و بیرون پیشگاہ حضور می ماند ص۱۲۱ عمل صالح ج ۲ کبھی کبھی خوش ہو کر یہ جیب بھی انعام میں بخش دیا جاتا تھا۔

اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرزمین یورپ کی یہ کھولی ہوئی تومیں مشرق میں کن کن سوراخوں سے داخل ہوئیں اور یہ سب کچھ جس مقصد کے لئے کیا جاتا تھا، جب چین میں انگریز اس مقصد کو حاصل کرنے لگے تو لکھا ہے کہ

"سنہ ۱۸۱۶ء میں گورنمنٹ انگلستان نے لارڈ امہرسٹ صاحب کو بہ سفیر مقرر کر کے چین بھیجا، مگر وہ بات نہ ہوئی، بلکہ اہانت ہوئی" ص۳۶

دراصل ان ہی اہانتوں کا نتیجہ بالآخر "باکسر" والی لڑائی کی شکل میں پیش آیا۔ حیدرآبادی فوج کے کمانڈر انچیف نواب سرافسر الملک مرحوم جو فقیر کے خاص عنایت فرماؤں میں تھے اگرچہ میری ملاقات ان کی اس وقت ہوئی جب غالباً اسّی پچاسی کی عمر تک وہ پہنچ چکے تھے، چین کی اس فوجی مہم میں حیدرآبادی[1] فوج کے ساتھ وہ بھی شریک تھے جو باکسر کی لڑائی کے نام سے مشہور ہوئی، نواب صاحب مرحوم نے اپنی مطبوعہ سوانح عمری میں "چین" کے سفر کے حالات بھی درج کئے ہیں اس وقت وہ کتاب تو میرے پاس موجود نہیں ہے لیکن یادداشت میں کچھ نوٹ لے لئے گئے تھے، آئندہ جو کچھ عرض کروں گا، وہ ان ہی نوٹوں سے ماخوذ ہے، نواب مرحوم نے لکھا ہے کہ باکسر کا لفظ انگریزوں کا مشہور کیا ہوا لفظ ہے۔ ورنہ چینی زبان میں ملک کی یہ انقلابی پارٹی اپنے آپ کو خوشنو کے نام سے موسوم کرتی تھی، جس کے معنی ہیں "دہشت زن" اسی کا ترجمہ باکسر انگریزی زبان میں کر لیا گیا تھا، معلوم ہوا تھا کہ اس انقلابی پارٹی میں ایک کروڑ کے قریب چین کے باشندے ممبر تھے مغربی اقوام کے اثر سے جب محسوس ہوا کہ چین کو پاک کر لینے میں وہاں کے باشندے کامیاب ہو جائیں گے تو حسب روایت نواب صاحب مرحوم

---

[1] نواب افسر الملک نے اس زمانہ کی حیدرآبادی فوج کے متعلق لکھا ہے کہ ہر فوجی گھوڑے کو حکومت کی طرف سے روزانہ ایک سیر گھی اور ایک سیر شکر کا بھی راشن ملتا تھا لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ گھی اور شکر کا راشن گھوڑوں کے پیٹ میں جاتا تھا یا فوجی افسروں کے محلات کے گارے اور چونے میں کام آتا تھا محلہ سیف آباد جاتے ہوئے موڑ پر ایک بڑے فوجی افسر کا قصر اب بھی موجود ہے جسے دیکھ کر زبان پر وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ قرآن کی آیت چاہئے تو بی کر یاد آجائے۔

"...انگلینڈ، فرانس، جرمنی، روس، اٹلی سبھوں نے مل کر چین پر ایک ساتھ حملہ کر دیا تھا"

نواب صاحب کی حیدرآبادی فوج انگریزی فوج کی پشت پناہ بن گئی تھی، غالباً یہ بھی لکھا ہے کہ حیدرآباد سے جب انگریزوں نے چینی مہم کے لئے فوج طلب کی تو خود اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں مرحوم و مغفور نے براہ راست چین جانے کا ارادہ انگریزوں کی طرف سے ظاہر کیا تھا، جو منظور نہ ہوا، اور نواب افسر الملک حیدرآبادی فوج کے ساتھ چین بھیجے گئے اسی کتاب میں یہ بھی تھا، کہ بالآخر وہ وقت بھی آیا کہ دار السلطنت میں انگریزوں، فرانسیسیوں، جرمن اور روس اٹلی سب کی فوجیں مختلف سمتوں سے داخل ہوتیں اور غریب فغفور چین جسے دیکھ کر انگریزی سفیر غش کھا کر پڑا تھا اس کا آخری انجام یہ ہوا کہ اپنے شاہی محلات کو چھوڑ کر جنگل کی طرف بھاگ گیا۔

نواب صاحب اس عرصہ میں چینیوں سے ملے جلے بھی، ان کی دعوتیں بھی چین کے بعض امراء کی طرف سے ہوئیں، دعوت میں ان کا بیان ہے منجملہ اور چیزوں کے کتوں کے ایسے پلے جن کی آنکھیں نہ کھلی ہوں، گرم پانی ڈال کر جو مار ڈالے جاتے ہیں، اور قیمہ بنا کر ان ہی کے سموسے تیار کئے جاتے ہیں، یہ سموسے بھی پیش ہوئے اور سفید چوہوں کے گوشت کا کباب اور قیمہ بھی، چینی جسے گوشت کی تمام قسموں میں بڑی لذیذ ترین غذا قرار دیتے ہیں، گوشت کے معاملہ میں ہندوستان کی تفریط یعنی کلی پرہیز کا جو داعیہ ہے ٹھیک اسی کے مقابلہ میں چینیوں کی گوشت خوری میں افراط اور مطلق العنانی کے ان قصوں سے نواب صاحب چونکہ واقف تھے اس لئے ان سموسوں، اور قیمہ کی ٹکیوں کے استعمال کرنے سے وہ محروم رہے، دودھ کے بارے میں لکھا ہے کہ چین میں گویا ملتا ہی نہیں، شاہ رخی وفد والوں کی ڈائری میں صرف ایک موقعہ پر ذکر کیا گیا ہے کہ دراز دم تبت والی گائے جسے گاؤ قطا کہتے ہیں۔ اس کے دودھ کے استعمال کرنے کا موقعہ ان کو ملا تھا، نواب صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ چینی اپنے ناخن نہیں ترشواتے، اسی لئے انچ ڈیڑھ دو انچ کے ہو جاتے ہیں۔ (غالباً یورپ نے چین کی اس رسم کو بھی اب قبول کر لیا ہے کیونکہ اکثر یورپ زدہ حضرات اس زمانہ میں صاحب چنگال صاحب دکھائی دیتے ہیں۔ چین میں عورتوں کے پاؤں لوہے میں بچپن ہی سے کس دیئے جاتے ہیں اس مشہور افواہ کا نواب صاحب نے انکار کیا ہے اور لکھا ہے کہ بچپن میں چیتھڑے بچیوں کے پاؤں میں صرف باندھ دیئے جاتے ہیں تاکہ حد سے

زیادہ لمبے نہ ہو جائیں ۔ قدم کا اختصار ان کے ہاں حسن میں شمار ہوتا ہے ۔

اور یہ تھا وہ چین جسے شاہ رخ مرزا کے وفد نے کس حال میں دیکھا تھا، اور آخری انجام اس حکومت کا وہ تھا جس کا تماشا نواب شمس الملک کو کرایا گیا ۔ اس کے بعد کے واقعات تو خود ہمارے سامنے پیش آتے جانگی شانگ کے زمانہ تک جو درگت اس غریب ملک کی بنی اس سے کون ناواقف ہے ۔ اب اس نے پھر کروٹ لی ہے، خدا ہی جانتا ہے اس کا انجام کیا ہوگا ۔ "کوریا" چین کا ایک حصہ "ارض القفص" بنا ہوا ہے ۔ دنیا کی آنکھیں اس وقت اسی پر لگی ہوئی ہیں ۔

تذنیل ۔ چین کا ذکر چار کے تذکرہ کے بغیر شاید ناقابل تصور ہے ۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ شاہرخ تیموری بادشاہ کے وفد کی ڈائری میں جیسا کہ آپ دیکھ چکے، کھانے پینے کی چیزوں کا حالانکہ تفصیل و بسط سے تذکرہ کیا گیا ہے ۔ لیکن "چار" کا نام بھی نہیں لیا گیا ہے، حالانکہ اسلامی سیاحوں کی ایسی کتابیں جو دوسری صدی ہجری کے اختتام پر لکھی گئی ہیں ۔ ان میں "چار" کا ذکر پایا جاتا ہے ۔ یورپین سفراء کی یادداشتوں میں بھی یہ بات ملتی ہے کہ لکڑی کی پیالیوں میں ان کو چار شاہی دربار میں پلائی گئی تھی ۔ کاٹھ کی ان ہیزمی پیالیوں میں شاید "چار" کی حرارت کا احساس کچھ کم ہو جاتا ہوگا جہاں صندل کی لکڑیوں کے ہندوستان میں بڑے بڑے جنگل ہیں اگر چار کی پیالیوں کے بنانے کے کارخانے وہاں قائم کئے جائیں تو شاید ملک کی یہ ایک اچھی صنعت ہو سکتی ہے، اسی چار کے متعلق فارسی کی ایک کتاب زبدۃ الاخبار نامی میں بھی کچھ ذکر پایا جاتا ہے اس کے مصنف کشمیر کے ایک عالم فاضل ابو محمد حسن متخلص شعری ہیں انھوں نے اس کتاب میں لکھا ہے کہ چار چینی زبان میں دراصل کوے کو کہتے تھے کہتے ہیں کہ شاہ چین بیمار اپنے بالاخانے پر لیٹا ہوا تھا، اپنی چونچ میں ایک کوا کسی پودے کی شاخ کے پتے بالاخانے کی چھت پر گرا کر اڑ گیا ۔ شاہ نے اس شاخ کی چند پتیوں کو چبا کر عرق کو جوں ہی پیٹ میں اتارا اسی وقت مرض میں خفت محسوس ہوئی، اس کے بعد جنگل میں پودا تلاش کیا گیا اور اس کے پتوں کے جوشاندہ کو پی کر چنگا ہو گیا ۔ اسی تجربہ کے بعد لکھا ہے کہ

"برگ را چائے نام نہادہ چہ بزبان چینی زاغ را چائے گو یند" (زبدۃ الاخبار صفحہ ۴۴)

واللہ اعلم بالصواب ہمارے کشمیری فاضل کی یہ اچھوتی تحقیق کس حد تک درست ہے "مولانا شعری"

چار کا ذوق خاص رکھتے تھے بڑے ذوق شوق کے ساتھ چار کی پنجگانہ قسموں کا ذکر کیا ہے۔ ایک قسم کا انگریزی نام امپریل ٹی بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ

"در چین ہم وزن طلا رفروختہ می شود"

اور یہ کہ رنگ آبش زرد مائل سبز است" مولانا ابوالکلام آزاد کی جسمین ٹی شاید یہی ہو واللہ اعلم بالصواب

مولوی شعری نے چار کی قصیدہ خوانی نثر کے ان الفاظ میں کرتے ہوئے کہ

"معزح روح پرور ومنشط ومعطر کہ رائحہ آں بجنبہ عطر گلاب است وبخور بخار آں ریختہ کیفیت می تاب، محبوب صغیر وکبیر معشوق غنی وفقیر بیماراں را دواست وتندرستاں راغذا"

اسی کے ساتھ نظم میں بھی چار کے متعلق اپنے اس تجربہ کا جو اظہار کیا ہے کہ

زہے شراب حلالے کہ عقل افزاید شباب آورد و ضعف بزداید

تا آنکہ وہی فرماتے ہیں

شب زفاف چو عنین بخاطرش آرد بہ یک اشارت او فتح قلعہا آید

اطبا رہی جواب دے سکتے ہیں کہ شعری صاحب کی یہ صرف شاعری ہے یا واقعہ سے بھی اس کا کوئی تعلق ہے۔ شاید کشمیری چائے کی یہ کوئی خصوصی خاصیت ہو یا وہائٹ جسمین کا یہ اثر ہو جس کے دیدار سے بھی ہم غریب محروم ہیں کان تک اس کا نام غبار خاطر کی آندھیوں کے طفیل میں پہنچ گیا، ورنہ اس سے پہلے تو نام سے بھی اس کے ناواقف تھے۔

تاریخ الکیمیا

تقسیم علوم

مرسلہ

(جناب میجر خواجہ عبدالرشید صاحب)

اگر علوم جدیدہ کی کوئی تاریخ ترتیب اصلی کے ساتھ لکھی جائے تو اس میں سب سے پہلا باب تقسیم علوم کا ہوگا۔

(۱) قدما کی ایک بنیادی غلطی یہ تھی۔ کہ وہ علوم کی کوئی صحیح تقسیم اور تعیینِ حدود نہ کر سکے اور طبیعیات کو جسے فی الحقیقت تجربہ اور مشاہدات کا نتیجہ ہونا تھا ان چیزوں سے ملا دیا جو محض زمانہ قدیم کے ظنونِ مقصرہ اور قیاساتِ ابتدائیہ کا نتیجہ تھیں متاخرین کو نئی راہ کا سراغ مل گیا اور انھوں نے سب سے پہلے علوم کی تقسیم صحیح اور تعیینِ حدود میں کامیابی حاصل کی، دراصل یہی اولین کام حکمائے جدید کی اصلی مزیت اور شرف ہے۔

(۲) اب علوم کے اقسام کا نقشہ بالکل بدل دیا گیا ہے اور گو اعصارِ قدیمہ کے بہ نسبت بے شمار نئی نئی شاخیں پیدا ہو گئی ہیں۔ تاہم اصولاً ان کی تقسیم وحدود ایک صحیح بنیاد پر قایم اور اپنی مختصر تعداد میں بالکل غیر متغیر ہیں۔

(۳) چنانچہ موجودہ زمانے میں دس بارہ غیر اصولی قسموں کی جگہ صرف ان تین حصوں میں تمام علوم تقسیم کر دئے گئے ہیں۔

(۴)

موجود دور کا تخیل تقسیم

۱۔ علوم حیاتیہ

۲۔ علوم نفسیہ

۳۔ علوم طبیعیہ

۱۔ مذہب

۲۔ فلسفہ

۳۔ سائنس

(۵) ان تینوں قسموں میں سے ہمارا موضوعِ بحث آخر الذکر علم، اور سب سے پہلے صرف اس کی ایک ہی شاخ یعنی علم کیمیا ہے۔ امم قدیمہ میں سے جن جن قوموں کی تاریخ میں ہمیں علم کیمیا کا تذکرہ ملتا ہے۔ وہ مصری، فنیقی، یہودی، یونانی، رومی، اور عرب ہیں۔ ان قوموں میں سے مصری سب سے پہلے گذرے ہیں۔ اس لئے غالباً فنِ کیمیا کا اولین سرچشمہ مصری ہے

لفظ کیمیا

(۶) "کیمیا" کس زبان کا لفظ ہے اور اس کے کیا معنی ہیں۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض کا بیان ہے کہ کیمیا "کمی" سے مشتق ہے۔ جس کے معنی سیاہ زمین کے ہیں۔ قدیم زمانے میں مصر کا یہی نام تھا اور چونکہ اس فن کا گہوارہ مصر تھا اس لئے اس کا بھی یہی نام پڑ گیا اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ کیمیا کو فن مصری بھی کہتے ہیں۔

(۷) مگر بعض کا خیال ہے کہ یہ ایک عبرانی نژاد لفظ سے مشتق ہے جس کے معنی راز یا اخفاء کے ہیں۔ اصل میں یہ لفظ غالباً شاماں ہے۔ اہل یونان مصر کو سام بن نوح کی نسبت سے شامیا کہتے تھے۔

(۸) ایک تیسری جماعت کو ان دونوں رایوں سے اختلاف ہے۔ اس کے نزدیک یہ دراصل "سیمیا" تھا "سیمیا" کے معنی بھی اخفاء و پوشیدگی کے ہیں۔

(۹) بہر نوع لفظ کیمیا کا مشتق منہ خواہ کچھ ہی ہو اور اس کے معنی خواہ سیاہ زمین کے ہوں یا اخفاء کے اس قدر یقینی ہے کہ یہ ایک پوشیدہ فن تھا جسے صرف رؤسا مذہبی ہی جانتے تھے اور اسکی بڑی دلیل یہ ہے کہ خود ہیکلوں اور عبادت خانوں کے اندر یا ان کے قرب وجوار میں کیمیا دی دار العمل (لیبورٹری) ملتے ہیں۔

کیمیا کی ابتدا

(۱۰) جس طرح دنیا میں تمام علوم کی ابتدا افراد انسانیہ کی غیر منضبط اور توہمات آمیز معلومات سے ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ تمدن و عمران کی ترقی نے ان میں ترتیب اور انضباط پیدا کیا ہے۔ اسی طرح فن کیمیا کی بھی ابتدا ہوئی۔

(۱۱) البتہ اس کی ابتدا اس لحاظ سے ایک خاص اور غیر معمولی حالت بھی رکھتی ہے۔ شاید ہی کسی

علم کی ابتدا اس درجہ توہمات اور خلاف مقصد کوششوں سے آلودہ رہی ہوگی، جیسی کہ اس نہایت قیمتی اور ضروری فنِ شریف کی ہوئی ہے۔

(۱۲) آگے چل کر فنِ کیمیا کے مختلف دوروں کی سرگذشت آئے گی۔ یہاں ہم صرف اس قدر اشارہ کردینا چاہتے ہیں کہ اس کی ابتدا نہ صرف غلط فہمیوں اور غلط مقصد کے اعتماد کے ساتھ ہوئی جیسا کہ انقلابِ ماہیتِ معدنیات کی کوشش سے ظاہر ہوتا ہے۔ بلکہ بہت کچھ انسانی جرائم و معاصی کی ان افسوسناک سرگذشتوں سے بھی اس کا تعلق رہا ہے جو دنیا کے گذشتہ تاریخی زمانوں کی وحشت انگیز یادگاریں ہیں اور جن سے اس افسوس ناک صداقت کی تصدیق ہوتی ہے کہ بہتر سے بہتر اور اشرف سے اشرف آلہ و وسیلہ بھی انسان کے بہیمی جذبات کے دقیقہ میں آکر بدترین لعنت و عذاب بن جاسکتا ہے

(۱۳) فنِ کیمیا کے جس قدر ابتدائی تجارب ہیں۔ وہ دنیا نے صرف دو طریقوں سے حاصل کیے ہیں

(۱۴) ۱۔ بہت سے لوگوں کو خیال پیدا ہوا کہ ادنیٰ درجہ کی دھاتوں کو کسی خارجی ذریعے سے اعلیٰ درجہ کی دھاتوں میں منقلب کردیا جائے مثلاً تانبے کو سونا بنادیا جائے یا قلعی اور پارہ کو چاندی کی صورت اور خواص میں بدل دیا جائے اُس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے بڑی بڑی علمی اور تجارتی کوششیں شروع ہوئیں اور صدیوں تک بڑے بڑے حکما اور علمی حلقے اس مقصد کے تجربوں میں مشغول رہے۔ وہ اپنے مقصد میں تو کامیاب نہ ہوتے لیکن ان کے تجربوں سے ضمناً بہت سے قیمتی مسائل معلوم ہوگئے جو ایک عمدہ ابتدائی سرمایہ اصلی فنِ کیمیا کا ثابت ہوا!

(۱۵) ۲۔ پہلا ذریعہ تو یہ غلط فہمی اور غلط تلاش تھی۔ دوسرا ذریعہ انسانی وحشت و جرائم کے مقتدر اور مخفی حلقوں کا علمی وسائل سے مقصد براری کی کوشش کرنا ہے جو عصرِ قدیم سے لے کر ازمنۂ مظلمہ (ڈارک ایجز) کے بعد تک برابر جاری رہی۔ تاریخ کے مطالعہ سے ان شریر اور جرائم پیشہ اشخاص اور جماعتوں کا پتہ چلتا ہے جو اپنے علم و حکمت کو اس راہ میں صرف کرکے بڑے بڑے ذاتی فوائد حاصل کرنا چاہتی تھیں، یہ وہ لوگ تھے جو اپنے بعض ذاتی مقصد کے طاقتور دشمن رکھتے تھے اور ان کو مخفی اور ناقابلِ گرفت ذرائع سے ہلاک کرنے کے لئے نئے نئے زہروں اور قاتل ادویہ کے متلاشی تھے۔

(۱۶) بڑی بڑی اقتدار طلب اور حکومت خواہ جماعتیں تھیں۔ جو ایسی ادویات اور مرکبات طیار کرتی تھیں۔ جن کے ذریعہ ان تمام طاقتور اشخاص کو پوشیدہ ہلاک کر سکیں جن کا وجود ان کے مقاصد میں حارج ہے۔ متعددیت پرست اقوام کی مذہبی جماعتیں اور ان کے بعد قرونِ متوسطہ کے متعصب اور جرائم پیشہ مسیحی خانقاہیں بھی اس سلسلے کی ایک مشہور کڑی ہیں جنہوں نے اپنے گرجوں اور قلعہ نما خانقاہوں کے تہہ خانوں میں انسانی ہلاکت و وحشیانہ جرائم کو صدیوں تک قایم رکھا اور جن کے مظالم کی لعنت سے صرف چند صدی پیشتر ہی دنیا کو نجات ملی ہے!

(۱۷) زمانہ گذشتہ کی پُراسرار کہانت اور مذہبی پیشواؤں کی خوفناک قوتیں بھی بہت کچھ اسی فن کے پوشیدہ تجربوں کا نتیجہ تھیں۔ یہ لوگ پہاڑوں کی غاروں کے اندر اور قلعوں اور گرجوں کے تہہ خانوں میں اپنے علم و تلاش کو ان چیزوں کے لئے صرف کرتے تھے اور ایسے ایسے مرکبات اور ادویات دریافت کر لیتے تھے جن کے خواص اس زمانے میں علمی طور پر معلوم نہ تھے اور پھر ان کے ذریعہ اپنے تئیں غیر معمولی اور پُراسرار قوتوں کا مالک ظاہر کرتے تھے۔ روم اور جرمنی کے قدیم پادریوں اور رومن کیتھولک راہبوں کی خوفناک قوتوں کا تفصیلی تذکرہ تاریخ میں موجود ہے۔ ان کے پاس عجیب عجیب قسم کے قاتل زہر ہوتے تھے جو مختلف غیر محسوس طریقوں اور معین زمانوں کے اندر مقدس جماعت کے دشمنوں کو ہلاک کر دیتے تھے۔

(۱۸) روم میں کارڈینل پادریوں کا گروہ (جن میں سے نیا پوپ منتخب کیا جاتا ہے) عجیب الخواص ادویات و مہلک کے لحاظ سے پوشیدہ اور علمی جرائم کی ایک پوری تاریخ ہے ان میں سے جو لوگ اپنے تئیں پوپ اور روم کا تاجدار قرار دینا چاہتے تھے ان کے بڑے بڑے پوشیدہ حلقے موجود تھے اور انھوں نے اس عہد کے پوشیدہ علوم و حکمت کے جاننے والوں کی مدد حاصل کر کے ایسی مرکبات حاصل کر لی تھیں جن کے استعمال کے نتایج اس عہد میں بالکل غیر معلوم تھے۔ مسلمانوں کے بعد اسپین میں مسیحی حکومت قایم ہوئی اور اس نے مشہور و معروف عدالتِ روحانی کے ذریعہ انسانوں کے لئے سب سے بڑی مسیحی لعنت کا دحشتناک سلسلہ شروع کیا۔ اس عدالت کے خوفناک کارندے اور ممبر تمام مسیحی یورپ میں پھیل گئے تھے اور ان کے خوفناک اقتدار کا ذریعہ منجملہ دیگر مخفی اسباب و طاقت کے ایک فن کیمیا کے غیر معلوم تجارب بھی تھے۔

اس طرح چودہویں صدی مسیحی سے لے کر سولھویں صدی کے اواخر تک روم اور جرمنی میں پادریوں کی ایک مخفی اور خوفناک عدالت کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں اور اس کے ممبر اور کارندے پوشیدہ پوشیدہ تمام یورپ میں منتشر اور بادشاہوں سے لے کر عام باشندوں تک پر اقتدار رکھتے تھے۔ ان کی نسبت بے شمار شہادتیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی ہلاکت کے لئے بہت سے کیمیائی عرقیات کا انھیں علم تھا اور ان کی تجربہ گاہیں اس عہد کے ویران قلعوں اور بڑے بڑے گرجوں اور خانقاہوں کے اندر موجود تھیں۔ وہ طرح طرح کے خوفناک طریقوں سے مفردات و عناصر کی ترکیب و تجزیہ کا تجربہ کرتے تھے اور انھوں نے ایسے ایسے آلات بھی ایجاد کر لئے تھے جو آج کل کیمیائی تجارت میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ وہ زہریلے جانوروں کے اعضا سے زہر نکالتے اور درندوں کو زندہ لٹکا کر اور ان کے پیٹ چاک کر کے طرح طرح کے حیوانی مادے اور انتڑیوں کے عرق کھینچتے!

(۲۰) یہ ایک وحشیانہ اور خونخوارانہ تجربہ تھا۔ لیکن اس کی وجہ سے فن کیمیا کے بہت سے تجربے معلوم ہو گئے اور گو پوشیدہ علوم اور پر اسرار معلومات ہونے کی وجہ سے ان کا بڑا حصہ غیر معلوم ہی رہا تاہم جس قدر بھی معلوم ہو سکا وہ اس فن کی ابتدائی معلومات کا قیمتی ذخیرہ ہے۔

کیمیا کے مختلف دور

(۲۱) دنیا میں جب تک کوئی شے زندہ رہتی ہے۔ اس وقت تک برابر اس میں تغیر و انقلاب کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لیکن جب وہ مر جاتی ہے۔ تو یہ سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے یہی حالت علوم کی بھی ہے۔ علوم جب تک زندہ رہتے ہیں اس وقت تک ہمیشہ ان میں حذف و اضافہ اور ترمیم و اصلاح ہوتی رہتی ہے۔

(۲۲) یہ مضمون کیمیا کی مکمل تاریخ نہیں بلکہ صرف اس کی ایک صفحہ کا مطالعہ ہے اس لئے ہم مجبور ہیں کہ فن کیمیا کے صرف اہم دوروں کو لے لیں اور ان پر نہایت اختصار و اجمال کے ساتھ بحث کریں۔ کیمیا کے اہم دور چار ہیں۔

(۱) دور اول

(۲۳) اس دور میں لوگوں نے علمی یا کم از کم باقاعدہ تجارب کے ذریعہ کیمیاوی ظواہر و آثار کا مطالعہ

نہیں کیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے سب کے سب غلط نتائج نکالے اس دور میں لوگوں کا تمام تر مقصد یہ تھا کہ جس طرح ہو سکے کم قیمت دھاتوں کو قیمتی دھاتوں مثلاً چاندی یا سونے کی صورت میں منتقل کر دیا جائے یہ کوشش اہلِ مصر میں پہلی صدی عیسوی تک جاری رہی یہاں تک کہا جانے لگا کہ کیمیا اسی علم کا نام ہے۔ جس کے مطابق چاندی اور سونا بنایا جا سکے۔

(۲۴) اس کے بعد ہی مسلمانوں کا عہدِ علمی شروع ہوا اور ان میں بھی گو ابتدا میں اس غلط خیال کو اشاعت ہوتی اور اس کا سلسلہ برابر قایم رہا لیکن انہی کے حکماء محققین نے سب سے پہلے اس کی تغلیط بھی کی اور فنِ کیمیا کو اصلی مقاصد اور علمی شکل کے ساتھ مدون کرنا چاہا۔

(۲۵) مگر یورپ میں یہ دور سولہویں صدی عیسوی کے وسط تک برابر قایم رہا چاندی سونا بنانے کے مدعی شعبدہ باز ہزار ہا انسانوں کو دھوکا اور فریب دے کر لوٹتے رہے۔

(۲) دورِ دوئم

(۲۶) اس کو ہم دورِ طبی بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس میں حالات یکسر منقلب ہو گئے اور بجائے اس کے کہ اربابِ فن کا مقصد عملاً چاندی اور سونے کے ساتھ مخصوص ہوتا، اب ان کے پیشِ نظر صرف ادویہ کی تیاری آگئی اور اس دور میں طب اور کیمیا پہلو بہ پہلو تھے علمی طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ صحت و مرض، تغیراتِ کیمیاوی ہی کا کام ہے اس لئے جب کوئی شخص بیمار پڑ جائے تو اس کی صحت یابی کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بدن میں کوئی اثرِ کیمیاوی پیدا کیا جائے سبر اسلسس (Saracelsus) سب سے پہلا شخص ہے جس نے اس اصول کا ظہور ہوا تھا۔ اس زمانے کے لوگوں میں سے وین ہیل مینٹ (Van Helmant) جیسے زبردست عالم تک نے اس مذہب کو قبول کر لیا تھا۔ اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مرکبات کیمیائیہ خصوصاً فلزی مرکبات ایجاد ہوئے یہ دور سترھویں صدی کے وسط میں ختم ہو جاتا ہے اس میں سب سے زیادہ کامیاب اور علمی حصہ مسلمانوں کے عہدِ طبی و کیمیائی کا ہے۔

(۳) دورِ سوئم

(۲۷) اس کو ہم دورِ احتراق (Phlogistic Period) (عربی میں اس کا ترجمہ عصر السعید کیا گیا ہے) کہتے

ہیں یہ سترھویں صدی کے وسط سے شروع ہوتا اور اٹھارویں صدی کے آخیر میں ختم ہوجاتا ہے اس عرصے میں بہت سے علمار کیمیا نے ایک مستقل فن بنانے کی کوشش کی اس سعی کے لحاظ سے کیمیا کی تاریخ روبرٹ بول (Robert-Boyle) کے وقت سے شروع ہوتی ہے۔ روبرٹ بول کا یہ اصول تھا کہ اس فن کا مقصد ترکیبِ اجسام کا علم ہے۔ اور بس۔

(۲۸) اس دور میں اربابِ بحث و تحقیق کے خیالات پر چند خاص مسائل چھاگئے تھے جن میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ احتراق کا ہے۔ اور اسی لئے ہم نے اس دور کا نام "دورِ احتراق" رکھا ہے اس دور کے علما کیمیا کا یہ اعتقاد تھا۔ کہ جب کوئی چیز جلتی ہے۔ تو اس سے ایک عنصر نکلتا ہے جسے فلوجسٹن (Phlogiston) کہتے ہیں فلوجسٹن ایک فرضی عنصر ہے۔ جس کے متعلق فرض کیا گیا تھا۔ کہ وہ خالص آگ ہے اور آتش گیر مادوں میں ملا ہوا رہتا ہے۔ یہ اعتقاد عرصہ تک قایم رہا۔ یہاں تک کہ ایک مشہور عالم کیمیاوی (Lavoisier) نے اس خیال کو باطل ثابت کردیا اور اس وقت سے چوتھا یا موجودہ دور شروع ہوا

(۲۹) یہ دور لاوزدایر کے عظیم الشان و دقیق کارناموں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کیمیاوی فاضل جلیل نے اپنے تجارب سے ثابت کردیا کہ اشیار کے جلنے میں ہوا کو بہت بڑا دخل ہے۔ نیز یہ کہ احتراق اور فلوجسٹن کے متعلق قدما کے جو اعتقادات تھے وہ وہم محض سے زیادہ نہیں ہیں۔ اس ایک اصول کے دریافت ہوجانے سے دفعتاً نظریۂ احتراق کی بنیادیں اس طرح ہل گئیں کہ پھر قایم نہ رہ سکیں۔

(۳۰) جیسا کہ بعد کے مباحث سے آپ کو معلوم ہوگا۔ درحقیقت لاوزدایر نے وہ عظیم الشان خدمت اس فن کی انجام دی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا نام ہمیشہ تاریخِ کیمیا کے صفحات میں محفوظ رہے گا۔ اس کے اس کارنامہ کی عظمت کا اندازہ صرف اسی سے ہو سکتا ہے کہ اہلِ فن نے اسے "موجودہ فن کیمیا کے باپ" کا لقب دیا ہے!

مگر افسوس کہ قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ انقلاب فرانس کے عہد کشت و خون میں حکومت فرانس نے اسے قتل کرا دیا۔!

(۳۱) اس عہد کے اربابِ فضل میں ڈلٹن (Dalton) اور برزیلیوس (Berzelius)

بھی ہیں۔ اول الذکر ایک انگریز حکیم ہے جس نے ذرات کا وہ عظیم الشان نظریہ وضع کیا جو آج علوم کیمیا کا سب سے بڑا محور ہے۔ ثانی الذکر سویڈن کا باشندہ تھا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ مختلف عناصر کے اوزان ذری کا (یعنی اس وزن کا جو ذرات سے پیدا ہوتا ہے) اندازہ کرنا ہے۔

(۳۲) اس کے بعد عہد آخر کے ارباب کمال کی جماعت ہے جن میں سویڈن کا ارنی نس (Arrhenius) ہالینڈ کا وانٹ ہف (Vant-Haff) جرمنی کا برٹولٹ (Bertolet) اور استوالڈ (Ostwald) انگلستان کا فرینکلینڈ (Frankland) اور سر ولیم رامزے (Sir W. Ramsay) مشہور صنادید فن میں ہیں۔ ان میں سے چار اول الذکر علما نے کیمیا کی ایک نئی شاخ کی بنیاد رکھی جس کو کیمیائے طبعی کہتے ہیں۔ کیمیائے طبعی میں مرکبات کے خواص طبعی اور ترکیب کیمیاوی کے باہمی تعلق سے بحث ہوتی ہے

(۲)

(۳۳) فن کیمیا کے ان مختلف دوروں کی یہ ایک سرسری تقسیم تھی اب ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان پر نظر ڈالتے ہیں۔ تاکہ ہر دور کی ترقیات و انقلابات سامنے آجائیں۔

دور اول

قسم نظری

(۳۴) اس عہد کے لوگوں نے اپنے اعمال کیمیائیہ میں ہمیشہ نہایت سطحی اور نظری امور کے مطالعہ پر اکتفا کی۔ وہ کبھی بھی کسی صحیح اور علمی تجربہ میں مشغول نہ ہوئے ان کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ کلیات سے جزئیات مستنبط کرتے تھے۔ حالانکہ استنباط و اخذ نتائج کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ تجربے و مشاہدے سے جو جزئی واقعات نظر آئیں ان سے کلیات اور علم قوانین بنائے جائیں۔ اس لئے ان کی کوششوں کا ماحصل بجز ناکامی اور ضیاع عمر و محنت کے اور کچھ نہ ہوا۔

مسئلہ تخلیق عناصر

(۳۵) اس عہد کے علماء کے پیش نظر سب سے زیادہ اہم مسئلہ یہ تھا کہ عالم اور مافی العالم (یعنی دنیا میں جو کچھ ہے) اس کے عناصر اصلیہ کیا ہیں۔

(۳۶) ان کو یقین تھا۔ کہ عملِ کیمیادی کے ذریعہ بعض کم قیمت دھاتوں سے دوسری بیش بہا دھاتیں بنائی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے چاندی اور سونے کے بنانے کی بارہا کوشش کی۔

(۳۷) عناصرِ اصلیہ کیا ہیں؟ اس کے متعلق چھٹی صدی قبل مسیح کے علماء میں اختلاف تھا بعض کا مذہب یہ تھا کہ ہر شے کی اصل پانی ہے (فلاسفۂ اسلام میں سے ابن رشد کا مذہب بھی یہی تھا وہ اپنی تائید میں قرآن حکیم کی یہ آیت: وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ پیش کرتا تھا) اس جماعت کا سرگروہ طالیس تھا۔

(۳۸) ایک دوسری جماعت کہتی تھی کہ عناصر اصلی میں صرف دو ہیں: آگ اور ہوا

(۳۹) تیسرا گروہ ان دونوں پر خاک کا بھی اضافہ کرتا تھا۔

(۴۰) دیمقراطیس جو پانچویں صدی قبل مسیح میں تھا۔ کہتا تھا کہ عناصرِ اصلی صرف ایک مادہ خاکی ہی ہے۔ یہ مادۂ خاکی نہایت چھوٹے چھوٹے ذرات میں منقسم ہے یہ ذرات اگرچہ حجم میں باہم مختلف ہیں مگر ان کا مایۂ خمیر اور شکل ایک ہی ہے۔ یہ ذرات ہمیشہ گردش کرتے رہتے ہیں۔ جسم میں جس قدر تغیرات ہوتے ہیں وہ انہی ذرات کے اجتماع و افتراق کا (یعنی ملنے اور الگ ہونے کا) نتیجہ ہیں۔

(۴۱) دیمقراطیس کی یہ رائے ذرات کے موجودہ نظریہ سے فی الجملہ مشابہ ہے۔

(۴۲) اس کے بعد سنہ ۴۴۵ ق۔م میں امبیدکلیس آیا۔ اس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ عناصرِ اصلی چار ہیں۔ آب و آتش اور خاک و باد (یعنی) سے تمام اجسام مرکب ہوتے ہیں یہ خیال ارسطو کی طرف بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ بہرحال یہ مذہب خواہ ارسطو کا ہو یا کسی دوسرے حکیم کا، لیکن دونوں میں سے کسی نے بھی ان عناصرِ اربعہ کے مایۂ خمیر میں فرق نہیں کیا یعنی دونوں اپنی اپنی جگہ پر یہ تسلیم کرتے ہیں۔ کہ ان چاروں کا قوام ایک ہی مادے سے ہے اور تعدد واختلاف محض خاصیت کے اختلاف کا نتیجہ ہے۔

(۴۳) ان مختلف خواص میں سے جن اہم خاصیتوں تک قوتِ لامسہ کی دسترس ہے وہ چار ہیں۔ رطوبت۔ یبوست۔ حرارت۔ برودت ہر عنصرِ اصلی میں دو دو خاصیتیں ہیں۔ مثلاً آگ گرم و خشک ہے ہوا گرم و تر ہے۔ پانی سرد و تر ہے۔ خاک خشک و سرد ہے۔ اس تفصیل میں آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ہر خاصیت گویا دو عنصروں میں مشترک ہے۔

(۴۴) ہم نے ابھی بیان کیا ہے۔ کہ ہر عنصر میں دو خاصیتیں ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ دونوں مساوی نہیں ہیں کسی عنصر میں ایک خاصیت زیادہ ہے۔ کسی میں دوسری خاصیت چنانچہ ہوا میں رطوبت اور حرارت دونوں ہیں مگر حرارت کی مقدار رطوبت سے زیادہ ہے پانی میں رطوبت اور برودت دونوں ہیں لیکن برودت رطوبت پر غالب ہے۔ خاک یبوست و برودت کی جامع ہے مگر یبوست غالب ہے، آگ یبوست اور حرارت دونوں اپنے اندر رکھتی ہے لیکن غلبہ حرارت کو حاصل ہے۔

(۴۵) انھی خواص کی قلت و کثرت کے ساتھ عناصر کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔ مثلاً اگر پانی کی رطوبت پر آگ کی یبوست غالب آگئی تو اس سے ہوا پیدا ہو جائے گی یا اگر خاک کی برودت پر ہوا کی حرارت غالب آگئی تو اس سے پانی پیدا ہو جائے گا۔ یا اگر آگ کی یبوست پانی کی رطوبت پر غالب ہو گئی تو اس سے خاک پیدا ہو گی۔ اس طرح اگر پانی کی رطوبت آگ کی حرارت پر غالب ہو گئی تو اس سے ہوا پیدا ہو گی غرض جسم کے ہر قسم کے تغیرات انھی خواص کے تغیر کے ساتھ وابستہ ہیں۔

(۴۶) چونکہ بظاہر ان عناصر میں سے بعض عناصر کا بعض کی شکل میں منتقل ہو جانا ممکن تھا، اس لئے اگر قدما اس کے قائل تھے کہ بعض مادے دوسرے مادوں کی شکل میں منتقل ہو سکتے ہیں تو یہ کوئی تعجب انگیز امر نہیں ہے۔

(۴۷) مثلاً پانی اور ہوا رطوبت میں مشترک ہیں۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ حرارت کے ذریعہ اسے ہوا بنا دیا جائے۔

(۴۸) مگر ظاہر ہے کہ یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ پانی اور خاک رطوبت میں مشترک ہیں۔ مگر نہ تو خاک کو ہم کسی طرح پانی بنا سکتے ہیں اور نہ پانی کو خاک صرف ایک ہی مثال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ قدماء جزئیات سے کیوں کر کلیات بنایا کرتے تھے اور کس طرح غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے تھے۔

(۴۹) مگر ارسطو نے یہ محسوس کیا کہ عناصر اربعہ تمام عالم کے کیمیاوی و طبیعی ظواہر کی تفسیر کے لئے کافی نہیں ہیں۔ اس لئے اس نے ایک اور عنصر کا اضافہ کیا۔ ارسطو نے یہ پانچواں عنصر اثیر غالباً ہندوؤں سے اخذ کیا تھا۔

(۵۰) ارسطو کے بعد جو لوگ آئے انھوں نے اس پانچویں عنصر کو مادہ سے علیحدہ کر کے دیکھنا چاہا مگر ان کوششوں میں کامیابی نہ ہوئی اور کیونکر ہوتی جبکہ آثیر (اسیتھر) کوئی واقعی شے نہیں ہے بلکہ ایک وہمی وجود ہے۔ جو علماء طبیعیہ فرض کر لیتے ہیں محض اس لئے کہ اس کے فرض کرنے کے بعد ان بہت سے ظواہر و عملیات کی تفسیر آسان ہو جاتی ہے جو مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں۔

(۵۱) مثلاً تلغراف لاسلکی میں کہربائیت ایک جسم سے دوسرے جسم میں جاتی ہے۔ مگر ان دونوں جسموں کے درمیان کوئی مادی واسطہ نظر نہیں آتا اور یہ مسلم ہے کہ کوئی مادی طاقت ایک جسم سے دوسرے جسم تک بغیر واسطہ کے نہیں جا سکتی لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قوتِ کہربائی کو الگ کر کے بطور ایک عنصر کے دیکھا جا سکے۔

(۵۲) دوسرے دور میں بھی ایک جماعت کا ایسا ہی خیال تھا۔ کہ اصلی عنصر پانی ہے اس خیال کی بنیاد وان ہلمنٹ کے تجارب تھے۔ جن میں سے ایک تجربے کا تذکرہ ہم یہاں کریں گے۔

(۵۳) ہلمنٹ کا بیان ہے کہ اس نے ایک پودہ جس کا وزن پندرہ پونڈ تھا تھوڑی سی مٹی میں بویا اس مٹی کو پہلے ایک تنور میں اس خیال سے خشک کر لیا گیا تھا۔ کہ جب اس میں کوئی شے بوئی جائے تو خالص مٹی کا وزن معلوم ہو سکے اگر مٹی گیلی ہوتی تو ظاہر ہے۔ کہ اس میں مٹی کے ساتھ پانی کا وزن بھی شامل ہوگا، خشک کرنے کے بعد مٹی کا وزن دو سو پونڈ تھا پانچ سال تک وہ اس پودے کو پانی دیتا رہا اس کے بعد جب تولا گیا تو اس کا وزن ۱۶۹ پونڈ اور ۳۰ اونس ہو گیا تھا پھر جب مٹی کو خشک کر کے تولا تو اس کا وزن دو اونس کم تھا۔

(۵۴) اس تجربے سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس درخت میں جس قدر ترقی ہوئی۔ تمام تر پانی ہی سے ہوئی اس لئے عرصہ تک ایک جماعت اس کی قائل رہی کہ عنصرِ اصلی پانی ہے لیکن جب انجنسو ( ) اور لاوو زیہ پیدا ہوئے تو انھوں نے اپنے قاطع و مسکت تجارب سے اس خیال کو بالکل باطل کر دیا۔

(۵۵) اہلِ یونان میں بعض لوگ صرف آگ کو ہی عنصرِ اصلی مانتے تھے۔ مگر یہ خیال غالباً کلدانی، ایرانی

اور قدیم ہندوں کی آفتاب پرستی کی راہ سے آیا ہوگا ایک گروہ صرف خاک کو عنصرِ اصلی کہتا تھا اور اپنے اس خیال کی تائید میں یہ دلیل پیش کرتا تھا کہ تمام اشیاء جب مٹ جاتی ہیں۔ تو خاک ہو جاتی ہیں ایک اور جماعت صرف ہوا کو اصلی عنصر مانتی تھی۔ اس کے مذہب کی بنیاد اناکسمینیس کے اس قول پر تھی کہ پانی ابر کے تکاثف سے پیدا ہوتا ہے اور ابر ہوا کے تکاثف سے نیز یہ کہ پانی کو چونکہ ہوا بنایا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہر شے کی اصل ہوا ہی ہے۔

(۵۶) ان فرقوں میں سے ہر ایک کسی ایک عنصر کو عنصرِ اصلی سمجھتا رہا یہاں تک کہ ارسطو آیا اور اس نے عناصرِ اربعہ کا اصول روشناس کیا۔

فلسفہ

مبادیات کا ایک سرسری مطالعہ

(۱)

فلسفہ کی حقیقت

(۵۷) عام خیال ہے کہ فلسفہ نہایت دقیق اور مشکل مضمون ہے۔ جو صرف بعض بعض دماغوں ہی کے لئے موزوں ہے۔ یا ایک ایسا غیر مفید اور بے نتیجہ علم ہے جس سے صرف انہی لوگوں کو سروکار ہونا چاہیے جو کاروباری دنیا کے لائق نہ ہوں اور جو ہر وقت اپنے خیالات میں محو اور اپنے توہمات میں غرق رہتے ہوں۔

(۵۸) مگر ایسا خیال کرنا سخت غلطی ہے۔

(۵۹) انسان اشرف المخلوقات ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ عقل یا قوتِ ممیزہ اس میں ودیعت کی گئی ہے۔ جس کا وجود اور جانداروں میں نہیں پایا جاتا۔ بے شک دیگر حیوان سنتے دیکھتے اور یاد بھی رکھتے ہیں مگر ان کی قوتیں صرف عین ضرورت کے وقت ہی استعمال میں آتی ہیں۔ برخلاف اس کے انسان مشاہداتِ عالم کا مطالعہ کرتا ہے۔ ان کی نسبت اپنے خیالات قائم کرتا ہے۔ پھر ان خیالات کا ایک دوسرے سے مقابلہ کر کے ان میں ایک باہمی ربط اور نسبت دریافت کرتا ہے۔ تاکہ ان پر من حیث الکل نظر ڈالے اور حقایقِ اشیا سے روشناس ہو۔ یہی فلسفیانہ عمل ہے۔

(۶۰) ہم جب کسی چیز کی نسبت خیال قایم کرتے ہیں عام اس سے کہ وہ چیز مادی ہو یا غیر مادی تو ذیل کے سوال ہمارے ذہن میں ضرور پیدا ہوتے ہیں۔

(۶۱) اول یہ کہ وہ چیز جو ہمارے ذہن میں ہے کیا ہے؟ دوسرے یہ کہ اس کی ابتدا کب سے ہے، تیسرے یہ کہ اس کا تعلق دیگر اشیاء یا خیالات کے ساتھ کس قسم کا ہے یعنی ہم اشیاء یا خیالات کی کیفیت اور ان کی ابتدا اور ان کا باہمی اتحاد و تناسب دریافت کرنا چاہتے ہیں۔

(فلسفی)

(۶۲) ہر شخص کو اپنی عمر میں اس قسم کے تفکر کا کبھی نہ کبھی ضرور موقع ملا ہو گا لہذا کہا جا سکتا ہے۔ کہ ہر شخص کم و بیش ایک فلسفی فکر ضرور رکھتا ہے۔

(۶۳) لیکن ساتھ ہی اس کے ہر ذی عقل جو صرف کبھی کبھی غور و فکر اور تجسس و تلاش کا عادی ہو اور اپنی رائے بھی قایم کرے، صحیح معنوں میں فلسفی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ جس طرح کہ اس شخص کو جو لوہے کے اوزار کو درست کرنا جانتا ہے ایک باقاعدہ لوہار نہیں کہہ سکتے یا اس شخص کو جو شیشوں کی عارضی مرمت کر سکتا ہے، شیشہ گر نہیں کہا جا سکتا۔ پیشہ ور شیشہ گر یا لوہار وہی ہے۔ جس نے اپنے کام کو اپنا پیشہ ٹھہرا لیا ہو۔ جس نے باقاعدہ تربیت کے علاوہ اپنی دائمی جد و جہد اور مزاولت سے اس کام میں کمال حاصل کیا ہو۔ اور جو بہ نسبت ایک نوبکار آدمی کے اپنا کام کم وقت میں مگر زیادہ خوبی کے ساتھ انجام دے سکتا ہے۔

(۶۴) یہی مثال ایک باقاعدہ فلسفہ داں کی ہے جس نے حقایق اشیاء کو مطالعہ کرنا اور ان کی تلاش و تفتیش کرنا اور ان کے اسباب و علل دریافت کرنا اپنا منشاء زندگی قرار دے لیا ہو جس طرح ایک لوہار کو آلات کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح فلسفی کو بھی ہوتی ہے۔ اس کے آلات اس کے خیالات ہیں محض مشق اور عمل کے ذریعہ اس کو تفحصِ اشیا میں بہت جلد دستگاہ حاصل ہو جاتی ہے۔ جس طرح مختلف پیشہ وروں اور دستکاروں کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہ اپنے کام کی جزئیات سے کما حقہ واقف ہوں۔ نیز ان کے پیشہ کے متعلق جدید انکشافات و ایجادات ان کے پیش نظر ہیں اسی طرح ایک باقاعدہ فلسفی کے واسطے بھی اشد ضروری ہے کہ ان چیزوں کے متعلق جو اس کے ذہن میں گذری ہیں۔ دریافت کرے کہ اس کے

پیشواؤں نے ان کے متعلق کیا خیالات قایم کئے ہیں۔

فلسفہ کی غرض

(۶۵) فلسفہ کی غرض کیا ہے؟ اور اس سے ہم کو کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے؟ ارسطو کے نزدیک فلسفہ کی ابتدا صرف تعجب و تحیر سے ہوئی۔ جب انسان اس عالم میں آتا ہے تو تغیرات سے دوچار ہوتا ہے زندگی کی نیرنگیاں اور کائنات کے عجائبات اس کو محو حیرت کر دیتے ہیں۔ بس یہ تقاضائے فطرت ہے کہ وہ ہر چیز کو دیکھے اور اپنے دل سے سوال کرے کہ یہ کیوں ہے؟ کب سے ہے؟ اور کب تک ہے؟ یہ عالم مع اپنے تمام کائنات کے انسان کے واسطے ایک معما ہے۔ اس کے حل کرنے کی کوشش ہی کا نام فلسفہ ہے۔

(۶۶) پہلی چیز جو انسان کو دریافت حقایق کی طرف مائل کرتی ہے۔ مفاد اور نفع ہے کہا جاتا ہے کہ علم ہیئت کی ابتدا قدیم مصریوں میں اس وجہ سے ہوئی کہ ان کو دریائے نیل کی طغیانی کے بعد اپنی زمینیں ناپنا پڑتیں پیمایش نور دکلدانیوں نے ستارہ شناسی اس واسطے سیکھی کہ اپنے ملکوں میں رہنمائی کر سکیں۔

(۶۷) انسان زندگی کے معمے کو حل کرنے کی کوشش بھی اس وجہ سے کرتا ہے۔ تاکہ اپنے فائدوں اور حقوق کی حفاظت کر سکے۔ عام اس سے کہ وہ مادی ہوں یا غیر مادی مگر ان پیچیدہ مسائل کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک سب انہی سے مملو ہے۔ انسان ہر وقت اس فکر میں رہتا ہے۔ کہ وہ فطری راز جو مدت سے سربستہ چلے آتے ہیں انکو یکے بعد دیگرے دریافت کرتا جائے اور یہ عجیب بات ہے۔ کہ گو وہ دریائے علم سے سیراب ہوتا ہے۔ پھر بھی اس کی پیاس نہیں بجھتی بلکہ اور زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔

(۶۸) یہ تلاش و تفتیش کی عادت انسان میں فطری ہے۔ یہ کسی طرح اس سے الگ نہیں ہو سکتی اور نہ ہی مٹ سکتی ہے۔ اس کی ترقی عقل کی ترقی کے ساتھ وابستہ ہے۔ جوں جوں عقل ترقی کرتی جاتی ہے اسی قدر حقائق اشیا کی تلاش بھی بڑھتی جاتی ہے اس کو اپنی لاعلمی کا علم ہوتا ہے اپنی ناواقفیت سے واقف ہوتا ہے اور حقائق کو صرف جاننا ہی نہیں چاہتا بلکہ ان پر عمل بھی کرنا چاہتا ہے۔

(۶۹) پس فلسفہ کی مختصر تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے۔ کہ وہ اشیا کے اسباب مخفیہ کے تجسس کا علم ہے جس سے غرض یہ ہے کہ ہمارے افکار اور اعمال میں ایک کامل ربط و اتحاد پیدا ہو، اور جس طرح

ہمارے خیالات ہوں اسی طور کے ہمارے افعال بھی ہو جائیں جہل سے گریز کرنا۔ حقایق دریافت کرنا اور غلطیوں سے مطلع ہونا وہ غلطیاں جو شاید حقیقت کے چہرہ پر نقاب بنی ہوتی ہیں۔ یہی اصلی غرض زندگی کی ہے۔ اور یہی غرض فلسفہ کی ہو سکتی ہے۔

لفظی تشریح

خود لفظ فلسفہ کی ابتدا اور تاریخ ہمارے اس دعویٰ کی دلیل ہے یونانی مورخ ہیروڈوٹس رقمطراز ہے کہ کریسس نے سولن سے کہا تھا

"میں نے سنا ہے کہ تو ملکوں ملکوں فیلسوف کی طرح (یعنی تلاش علم میں) پھرا ہے"

پریکلز فلسفہ کے یہ معنی بتلاتا ہے

"تہذیب نفس کے واسطے کوشش کرنا"

بہر صورت اس لفظ کے ابتدائی معنی اعترافِ جہل اور تحصیلِ علم کے ہیں۔ حکیم فیثا غورث کا (بعض کا خیال ہے کہ سقراط کا) مقولہ ہے۔

"عقل صرف خدا وند جل وعلیٰ کے واسطے ہے۔ انسان صرف جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ البتہ وہ عقل کا عاشق اور علم حق کا جویا ہے"

(۷۱) یہی لفظی معنی "فلاسفی" اور "فلاسفر" کے بھی ہیں۔ جو یونانی لفظ "فیلوس" (عاشق) اور "سوفیا" (عقل) سے مرکب ہے۔ یہ عجیب بات ہے۔ کہ ابتدا میں "سوفاس" (عاقل) اس شخص کو کہتے تھے جو کسی ہنر یا دستکاری کا ماہر ہو۔ مثلاً ایک گویا یا باورچی یا ملاح یا بڑھئی، مگر رفتہ رفتہ یہ لفظ علوم عقلیہ کے ماہروں کے واسطے استعمال ہونے لگا۔ اسی کا دوسرا مشتق "سوفسٹ" (سوفسطائی) ہے جو ان لوگوں کے واسطے استعمال ہوتا ہے۔ جو مثل بازاری سودا بیچنے والوں کے مختلف علوم وفنون کو بھی بقیمت بیچتے تھے۔ چنانچہ سقراط نے اپنے تئیں فلسفی کہا ہے نہ کہ سوفسطائی۔

تقسیم

(۷۲) یوں تو فلسفہ تمام عالم کے مسائل پر حاوی ہے۔ مگر آسانیِ ترتیب کے خیال سے یہ تمام مسائل بلحاظ

اپنے موضوع کے تین اقسام پر تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) مسئلہ وحدت یعنی اصل اصول وہ قادر اور مبدع قوت جو تمام عالم کی روح ہے۔ اس کے مباحث کو مسائل مابعد الطبیعہ کہتے ہیں۔

(۲) مسئلہ کثرت یا تنوع مشاہدات عالم اس کو فلسفہ طبیعی کہتے ہیں۔ (نامکمل)

روشنی کی کہانی

(جناب پروفیسر محمد نصیر احمد صاحب عثمانی ایم۔اے۔ بی۔ ایس۔ سی)

انسان نے جب اس عالم آب وگل میں قدم رکھا ہے تو وہ آنکھیں لے کر آیا۔ بلی کے بچوں کی طرح اس کی آنکھیں بند نہ تھیں۔ بس اس نے دیکھا جو کچھ کہ روشنی نے اس کو دکھایا۔ اگرچہ وہ پورے طور پر نہ سمجھ سکا کہ کیا دیکھ رہا ہے؟ کس طرح دیکھ رہا ہے اور کون دیکھ رہا ہے تاہم اس نے آنکھیں بند نہیں کیں بلکہ ہمیشہ دیکھتا ہی رہا۔ کیا، کس طرح اور کون کے تینوں سوالوں کے جوابوں سے ہی روشنی کی کہانی مرتب ہوتی ہے۔ لہذا اس بیان میں بھی یہی ترتیب ملحوظ رہے گی۔

انسان نے جب چاروں طرف اپنی نظر ڈالی تو ایک ہی وقت میں کہیں اس کو روشنی نظر آئی اور کہیں اس کو اندھیرا نظر آیا۔ کہیں اس نے رنگارنگی دیکھی اور کہیں بے رنگی اور یہ سب سورج کے کرشمے تھے۔ رات کے پردے میں کچھ نہ تھا۔ صرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے سے انسان گھبرایا۔ روشنی کی قدر ہوئی۔ جستجو کی فکر ہوئی۔ تاکہ اس اندھیرے میں روشنی پیدا کی جا سکے۔

شعور انسانی بیدار ہو رہا تھا۔ نظر باریک تر ہو رہی تھی۔ یہ دکھائی دینے لگا کہ نصف النہار کے مقابلے میں افق پر سورج بڑا نظر آتا ہے۔ یہ جلد ہی معلوم ہو گیا کہ روشنی خط مستقیم میں چلتی ہے روشنی میں سایہ کا احساس ہونے لگا۔ پانی اور چکنے پتھروں سے روشنی کی چمک نے انعکاس کی طرف رہبری کی۔ انعطاف (Refraction) سے بھی لوگ واقف ہو چلے تھے۔

اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ مصر میں یونانیوں کی ایک دستاویز ملی ہے جس میں مختلف فریب نظر بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً سورج کا ایک وقت بڑا دکھائی دینا ایک وقت چھوٹا۔ نینوا کے کھنڈروں میں ایک عدسہ (Lens) بلور کا ملا ہے۔ اور آتشی شیشے کا استعمال تو قدیم یونانیوں سے چلا آتا ہے۔ چنانچہ ۴۲۴ ق م میں ارسطوفانس نامی (Aristophenes) ایک ڈراما نویس نے ایک ڈراما کیا تھا جس کے مکالموں میں وہ عمدہ شفاف شیشے کا ذکر کرتا ہے جس سے آگ پیدا کی جاتی ہے؛

اور جس سے موم پر لکھی ہوئی تحریر ایک فاصلے سے مٹائی جا سکتی ہے۔

افلاطون اور اس کے پیرو روشنی کی اشاعت مستقیم اور انعکاس میں زاویہ وقوع اور زاویہ انعکاس کے مساوی ہونے کو جانتے تھے۔ قلادیوس بطلیموس (Claudius Ptolemy) نے جو اسکندریہ میں دوسری صدی عیسوی کے اوائل میں رہتا تھا، انعطاف کی صورت میں زاویۂ وقوع اور زاویہ انعکاس کی پیمائش کی اور جدولیں تیار کیں۔ یونانی آئینے دھات کے بناتے تھے اور کروی اور شلجمی (Paraabolic) آئینوں سے واقف تھے۔

روشنی کی نوعیت کے متعلق فیثاغورس، دیمقراطیس وغیرہ اس نظریے کے حامی تھے کہ شے سے ذرات نکل کر آنکھ میں داخل ہوتے ہیں تو رویت کا احساس ہوتا ہے اس کے برخلاف افلاطون اور اقلیدس وغیرہ کا یہ کہنا تھا کہ آنکھ سے شعاعیں نکلتی ہیں اور جب شے سے نکلنے والی شعاعوں سے ٹکراتی ہیں تو رویت کا احساس ہوتا ہے۔

یہ یونانیوں کی داستان تھی۔ ان کے بعد روما والے آئے مگر ان کی رام کہانی بہت مختصر ہے انھوں نے اس میدان میں گھوڑے نہیں دوڑائے۔ لہذا ہم عربوں کے زمانے کو لیتے ہیں، ان لوگوں کی نگاہیں تیز تھیں، عقل رسا تھی، فکر عمیق تھی، لہذا ہر میدان میں جولانیاں دکھلائیں۔ چنانچہ علم مناظر میں ہم ایک ہی نام پر اکتفا کریں گے وہ نام ابو علی الحسن ابن الحسن ابن الہیثم ہے۔ انگریزی میں یہ (Al Hazen) ہو گیا۔ اس کا زمانہ تقریباً ۹۶۵ء - ۱۰۳۸ء ہے

فلکیات، ریاضی اور مناظر پر اس نے کتابیں لکھیں۔ اس کی کتاب المناظر کا ترجمہ لاطینی میں ۱۵۷۲ء میں شائع ہوا۔ یونانیوں نے بتلایا تھا کہ زاویۂ وقوع اور زاویۂ انعکاس مساوی ہوتے ہیں۔ اس نے یہ اضافہ کیا کہ دونوں ایک ہی مستوی یا سطح میں ہوتے ہیں، انعطاف میں بطلیموسی جدولوں کی تصحیح کی۔ سورج اور چاند کے قطروں میں ظاہری کمی بیشی کی توجیہ کی۔ آنکھ کی اس نے صحیح تشریح کی۔

اس نے اور دیگر عربوں نے اقلیدس اور افلاطون کے نظریے کی سخت مخالفت کی، ارسطو اور دیمقراطیس کے اس نظریے کی حمایت کی کہ رویت کا سبب شے مرئی ہے

عربوں کے بعد ان کا ورثہ یورپ کو پہنچا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں یورپ والے عربوں کے پڑھائے ہوئے سبق کو یاد کر رہے تھے۔ چنانچہ راجر بیکن (Roger Bacon) نامی ایک انگریز (۱۲۱۴ء - ۱۲۹۴) نے مناظر پر ایک کتاب لکھی۔ اس کے بعد صدیوں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ یہاں تک ہم سترھویں صدی میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس زمانے میں دوربین اور خوردبین کی ایجاد نے سائنس کی دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔

۱۶۰۸ء میں ہانس لیپرشے (Hans Lippershey) نامی ایک ولندیزی عینک فروش نے سب سے پہلی دوربین تیار کی۔ ۲ اکتوبر ۱۶۰۸ء کو اس نے پیٹنٹ کی درخواست دی۔ جواب ملا دوربین صرف ایک آنکھ کے لئے ہے ایسی تبدیلی کی جائے کہ دونوں آنکھوں سے بیک وقت دیکھا جا سکے۔ چنانچہ اس سال اس نے تکمیل کر دی۔ اسی زمانے میں زکریاس یونادس (Zacharias Jonnides) نے خوردبین ایجاد کی۔

ان آلوں کی ایجاد نے انسان کی نظر کو بہت وسیع کر دیا۔ ایک طرف اس نے دوربین سے آسمانوں کی سیر کی تو دوسری طرف خوردبین کی بدولت عالم صغیر سے واقف ہو گیا۔ ہر دو آلے خالی آنکھ کے لئے بہت بڑے معین و مددگار ثابت ہوئے۔

لیڈن کے پروفیسر اسنل (Snell) نے انعطاف کا کلیہ (Law) دریافت کیا۔ اس کی موجودہ تشکیل میں اس کلیہ کو سب سے پہلے دیکارت (Decartes) نے ۱۶۳۷ء میں پیش کیا تھا۔

۱۶۷۶ء میں ڈنمارک کے اولاف رومر (Olaf Romer) نے روشنی کی رفتار فلکی مشاہدات سے دریافت کر لی۔ انگلستان میں آکسفورڈ کے پروفیسر جیمس بریڈلے (James Bradley) نے بھی فلکی مشاہدات سے روشنی کی رفتار دریافت کی۔ رومر نے مشتری کے چاندوں کے گہن کے اوقات میں مشاہدے اور حساب میں فرق پایا۔ اس سے روشنی کی رفتار اخذ کی۔ بریڈلے نے ستارے کے اختلاف منظر (Parallax) کی بناء پر رفتار حاصل کی۔

یہ زمانہ نیوٹن اعظم کا تھا۔ اس نے بھی روشنی پر بہت سے تجربے کئے۔ روشنی کو شیشے کے

ایک منشور (Prism) میں سے گزارا تو روشنی سات رنگوں میں بٹ گئی۔ ایک رنگین فیتہ نظر آیا جس کے ایک سرے پر بنفشی رنگ ہوتا ہے اور دوسرے سرے پر سرخ اس رنگین فیتے کو طیف (Spectrum) کہتے ہیں۔ اس طیف پر مزید تحقیق ہوتی رہی یہاں تک کہ آج طیف نمائی (Spectroscopy) طبیعیات کی ایک شاندار شاخ بن گئی ہے، آسمانوں میں ستاروں کی ماہیت، ان کی حرکت، ان کے رنگ، ان کی رفتار، ان کا ہم سے قریب یا دور ہونا سب طیف کی بدولت معلوم ہوتا ہے زمین پر اشیاء کے طیف دیکھنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ کون کون سے اجزا اس میں شامل ہیں۔ لطف یہ کہ شے کی مقدار قلیل سے قلیل کیوں نہ ہو طیف سے اس کے اجزا کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔

۱۶۷۸ء میں کرسچین ہوئگنس (Christian Huygens) باشندہ ہیگ نے نور کے متعلق موجی نظریہ قائم کیا یعنی یہ کہ نور یا روشنی کی نوعیت موجی ہے۔ نیوٹن نے نظریہ پیش کیا تھا کہ روشنی ذرات پر مشتمل ہے۔ اس واسطے اس نظریے کو جسیمی نظریہ (Corpuscular Theory) کہتے ہیں ان دونوں نظریوں میں کشمکش شروع ہوئی۔ نیوٹن نے ان تمام معلومہ واقعات کی بنا پر ایک محاکمہ کیا اور فیصلہ جسیمی نظریے کے حق میں دیا۔ اس لئے اٹھارھویں صدی میں اسی نظریے کا دور دورہ رہا۔

۱۸۰۱ء میں انگلستان میں ٹامس ینگ (Thomas Young) نے جو رائل سوسائٹی کا معتمد خارجہ تھا، سوسائٹی کے سامنے ایک مقالہ پڑھا جس میں تداخل (Interference) کے اصول کی تشریح کی اور موجی نظریے کی تائید کی۔ تداخل سے مطلب یہ ہے کہ اگر ۲ دو موجیں ایک دوسرے سے ملیں اور ایک دوسرے کے موافق ہوں تو ایک تیسری موج حاصل ہوگی جو دونوں سے زوردار ہوگی۔ اگر موجیں ایک دوسرے کے مخالف ہوں اور مساوی بھی ہوں تو موجیں بالکل زائل ہو جائیں گی اور نتیجہ سکون ہوگا۔ پس روشنی اگر موجی حرکت ہے تو دو روشنیوں سے تاریکی پیدا ہو سکتی ہے اس کو ینگ نے تجربے سے ثابت کیا۔

۱۸۱۵ء میں ایک فرانسیسی ژاں فرنیل (Jean Fresnel) نے ایک مقالہ میں انکسار (Diffraction) کو واضح کیا۔ یہ بھی تداخل ہے لیکن ایک ہی موج کے ۲ دو حصوں میں۔

اس کو بھی تجربوں سے واضح کیا گیا۔ روشنی کی خطِ مستقیم میں اشاعت کی توجیہ موجی نظریے سے پہلے ممکن نہ تھی لیکن تداخل کے اصول سے واقفیت ہونے کے بعد یہ توجیہ بھی کر دی گئی لہذا جسمی نظریہ ترک کیا گیا اور موجی نظریہ اختیار کیا گیا۔ زمانے نے پھر پلٹا کھایا۔ بیسویں صدی میں جو مزید معلومات حاصل ہوئیں ان کی بنا پر نظریہ قدریہ (Quantum theory) وجود میں آیا۔ اس نے روشنی کی ذاتی حیثیت نمایاں کی جو موجی نظریہ کے خلاف ہے۔ دونوں نظریوں کے دلائل قوی نظر آتے لیکن دونوں میں تطبیق ابھی پورے طور پر نہیں دی جا سکی ہے۔

انیسویں صدی کے وسط میں روشنی کی رفتار زمین پر دریافت کی گئی۔ فوکول (Foucault) اور فیزو (Fizeau) دو سائنس دانوں نے یہ تجربے انجام دئے جو آج تک ان کے نام سے موسوم ہیں سابق میں روشنی کی رفتار فلکی مشاہدات سے دریافت کی گئی تھی۔

طیف پر بھی بہت کام ہوا۔ اس میں عکاسی (Photography) کی ایجاد سے بہت مدد ملی۔ ۱۸۲۷ء میں یوسف نیپسے (Joseph Niepse) نے اس کا انکشاف کیا تھا۔ اس کی مدد سے طیف کو پڑھنے یعنی اس کا مطلب سمجھنے میں بہت آسانی ہو گئی۔ سورج کا طیف حاصل کیا گیا۔ اس کا مطالعہ کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ بہت سی مادی اشیاء جو سورج میں موجود ہیں زمین پر بھی پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح دوسرے ستاروں اور سیاروں کا بھی حال معلوم ہوا۔

اس کے علاوہ رنگ کی عکاسی کی صورتیں بھی نکل آئیں۔ اور اب تو سینما کی بدولت ہر شخص اس سے واقف ہو گیا ہوگا۔ خود سینما بھی روشنی کا رہینِ منت ہے۔

موجی نظریے میں سب سے زیادہ دلچسپ وجود اثیر (Aether) کا ہے۔ جب روشنی کی رفتار معلوم ہو گئی کہ وہ سب سے بڑی رفتار ہے یعنی ۱۸۶۰۰۰ میل فی ثانیہ اور موجی نظریے نے یہ بتایا کہ نور موجی ہے تو ضروری ہو گیا کہ اس موجی حرکت کے لئے کوئی واسطہ (medium) بھی ہو۔ کسی شیشے کے برتن سے ہوا نکال لینے پر بھی روشنی آتی رہتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ہوا روشنی کے لئے واسطہ نہیں ہے۔ چونکہ رفتار بہت ہی زبردست ہے اس لئے اس واسطہ کی کثافت (Density) بہت ہی کم ہونا چاہئے

یعنی وہ واسطہ نہایت لطیف ہو۔ چنانچہ موجی نظریے کے استحکام کے لئے اثیر تمام فضا میں جاری وساری مانا گیا۔ لیکن بیسویں صدی میں آکر آئنسٹائن نے نظریہ اضافیت (Theory of Relativity) پیش کیا تو بتلایا کہ اثیر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ با ایں ہمہ اثیر ابھی باقی ہے۔

یوں تو روشنی کی ساری کہانی بہت روشن ہے لیکن ساتھ ہی طویل بھی ہے اس لئے یہاں ہم اس کے کارناموں کے ایک خاکے پر اکتفا کریں گے۔

روشنی نے گھروں کو روشن کیا، سڑکوں کو روشن کیا، شہروں کو روشن کیا، میدانوں کو روشن کیا اور آسمانوں کو روشن کیا۔ یہ سب بجلی کی وجہ سے ممکن ہوا جیسا کہ آج کل تقریباً سب لوگ اس سے واقف ہیں۔

روشنی کے محسوس کرنے کا آلہ ہمارے پاس آنکھ ہے۔ آنکھ کی مدد کے لئے عینکیں ایجاد ہوئیں۔ وہ بھی طرح طرح کی جس سے اکثر لوگ واقف ہیں۔ عینک کی آخری صورت یہ ایجاد ہو چکی ہے کہ ہر شخص کی آنکھ کی کمزوری کے مطابق ایک عدسہ خود آنکھ کے اندر پتلی پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ گویا یہ داخلی عینک ہوئی۔

آنکھ کو ایک اور طریقے سے مدد پہنچی یعنی متحرک اشیاء کی عکاسی یا فوٹو گرافی میں، تیز رفتار جسموں کی صحیح کیفیت خالی آنکھ سے معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے لئے عکاسی کے ایسے طریقے ایجاد ہوئے کہ اب رائفل کی گولی کا بھی فوٹو لیا جا سکتا ہے۔ ہوائی جہاز میں بھی کیمرا لگا دیا جاتا ہے اور نیچے کا سارا نقشہ اتر آتا ہے۔ دوربین میں کیمرہ لگا جاتا ہے اور آسمان کا نقشہ اتر آتا ہے۔ سنیما میں مائکی ماؤس (Mickey Mouse) کی قسم کی فلمیں تو گویا عکاسی کا کمال ہیں کہ تصویر میں حرکت نہیں ہوتی اور حرکت نظر آتی ہے۔ جاندار کوئی نہیں ہوتا اور تصویریں سب جاندار۔

ایسے آلے ایجاد ہوتے کہ آنکھ کے ساتوں پردوں کی کیفیت آئینہ ہو جاتی ہے۔ آنکھوں کا اس طرح کا امتحان آج روزمرہ کی بات ہے۔ لاشعاعوں (X-ray) کی ایجاد نے آدمی کا اندرونی بدن آئینہ کر دیا۔

ان تمام باتوں کے باوجود لطف یہ ہے کہ روشنی خود غیر مرئی ہے یعنی وہ آپ کو دکھائی نہیں دیتی۔ جو کچھ آپ دیکھتے ہیں وہ اس کے اثرات ہیں اب موقع نہیں ہے کہ پردہ اٹھا کر روشنی آپ کو دکھلا دی جائے لہٰذا پھر کسی وقت۔

التقریظ والانتقاد

"جامع المجددین"

از

(سعید احمد)

(۷)

ذرا غور فرمائیے بات کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے۔ ایک طرف دین میں وسعت، ہمہ گیری اور لچک کا عالم یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسوۂ حسنہ ہیں، آپ کی پیروی سرتاسر خیر و برکت اور موجب فلاح وسعادت ہے لیکن جہاں تک دین ہونے کا تعلق ہے تو آپ کے صرف وہ اقوال وافعال دین ہیں جو آپ نے بحیثیت پیغمبر کے وحی الٰہی کی روشنی میں کئی بار ارشاد فرمائے ہیں، ان کے علاوہ آپ کے وہ ارشادات اور معمولات جو پیغمبرانہ حیثیت سے تعلق نہیں رکھتے اور جن کو شریعت کی اصطلاح میں "سنن عادیہ" کہتے ہیں وہ دین یا کم از کم عین دین نہیں ہیں۔ ان کی خلاف ورزی کرنے والا گمراہ اور مستحق ملامت نہیں اور اس کے لئے کوئی وعید اُخروی نہیں ہے۔ پھر آپ کے ارشادات واعمال کا وہ حصہ جو دین کی حیثیت رکھتا ہے ان کی بھی کوئی ایک متعین اور مشخص تشریح وتعبیر عین دین نہیں ہیں بلکہ ائمہ مجتہدین نے مختلف بنیادوں پر ان کی جو مختلف توجیہیں اور تاویلیں کی ہیں جن کے باعث فقہ کے متعدد اسکول اور مسلک پیدا ہوئے اور جن پر اسلامی احکام کے تنوع کا دار ومدار ہے ان میں سے کوئی ایک مخصوص تاویل وتوجیہ نہیں بلکہ سب ہی دین ہیں چنانچہ فقہ حنفی جس طرح دین ہے۔ فقہ شافعی، فقہ مالکی اور فقہ حنبلی اور ان کے علاوہ اور متعدد فقہی مسالک جو امام اوزاعی حضرت سفیان ثوری۔ ابن جریر اور ابن عیینہ وغیرہم رحمہم اللہ کی جانب منسوب ہیں اور جن کو قبول عام حاصل نہ ہونے کی وجہ سے فروغ نہ ہو سکا یہ سب دین ہیں اور ان میں سے کسی ایک مسلک کے عامل کو گم کردہ راہ

اور دین سے منحرف نہیں کہا جا سکتا یہ تنوع اور یہ رنگا رنگی اسلام کا عیب نہیں ہنر ہے۔ اس کا نقص نہیں بلکہ کمال ہے۔ چنانچہ ارشاد گرامی " اختلاف امتی رحمۃ" میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اس اختلاف اور تنوعِ احکام کے باعث اسلام میں کبھی بھی اور زندگی کے کسی مرحلے پر بھی جمود پیدا نہیں ہو سکتا اور وہ انسانی تمدن و تہذیب کی تاریخ ارتقا کے ہر دور میں۔ ہر ملک اور ہر زمانہ کے بدلے ہوتے حالات میں اپنے پیروؤں کے لئے ایک صحیح۔ ترقی پذیر، اور معتدل راہِ عمل پیدا کر سکتا ہے چنانچہ جن حضرات نے فقہ کے مختلف مسالک و مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ تمام مذاہبِ فقہ میں سے فقہ حنفی کو ہی عجمی ممالک اور ان میں سے بھی متمدن ممالک میں کیوں قبول عام حاصل ہوا اور نیز یہ کہ اس مذہبِ فقہ نے اسلام کے لئے کس طرح ان حالات سے عہدہ برآ ہونے کی سبیل پیدا کی جو عربی اور عجمی اقوام کے اختلاط و ارتباط سے پیدا ہو گئے تھے، آج ہم بنو عباس کے جس دور کو " دور زریں " کہتے ہیں اور جس کے سامنے یورپ کے موجودہ دورِ ترقی علوم و فنون کا سر بھی بار منتِ احسان سے خم ہے۔ یہ سب فقہ حنفی کا صدقہ اور طفیل ہے۔ ورنہ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے امام مالک نے تو صاف طور پر خلیفۂ عباسی سے کہہ ہی دیا تھا کہ ہم علمائے حجاز کے احکام حجاز کے لوگوں کے لئے ہیں جو اپنے وطن اور ملک میں تصادم و تزاحم اقوام کے بکھیڑوں سے آشنا نہیں ہوتے۔

لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ ان تمام حقائق کے برخلاف آج ہمارے مکرم مولانا عبد الباری ندوی کا دعویٰ ہے کہ عین دین وہی ہے جو حضرت مولانا تھانوی نے فرمایا یا کیا، اس کے علاوہ جو کچھ ہے گمراہی اور بے دینی ہے۔ ص ۱۰۱ پر فرماتے ہیں۔

"جس طرح انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امتوں کے لئے اس احسن عمل کا اکمل اسوہ ہوتے ہیں اسی طرح نبی الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دین کے تھانوی مجدد کی زندگی تجدیدی درجہ میں امت محمدیہ کے لئے اسلام کی عملی تعلیمات کا ہر شعبہ میں کامل و جامع نمونہ تھی۔

اس کے بعد صفحہ ۱۰۷ پر " ذالک الکتاب کے مناسب حضرت کی تجدیدی کرامت " کے زیر عنوان ارشاد فرماتے ہیں:۔

"یہی اصلاح و تجدیدی جامعیت ہے جو ذالک الکتاب والے دین کے جامع المجددین کی سینکڑوں کتابوں کے

ہزاروں صفحات پر اصلاحی و تجدیدی صورت میں پھیلی ہوئی ہے اور جس طرح ذلک الکتاب اس دین کے پیغمبر کا سب سے بڑا معجزہ یا سب سے بڑی برہان و آیت تھی۔ اسی کے اتباع میں اس کے تھانوی مجدد وقت کی کتابیں اپنی کمیت و کیفیت ہر اعتبار سے اس کی تجدیدی جامعیت کی سب سے بڑی کرامت ہیں۔ آج جو شخص بھی دین اسلام کے چہرہ کو پورے جمال و کمال کے ساتھ بالکل صاف و بے غبار جامع و کامل صورت میں از سر نو تجدید یافتہ اور تر و تازہ دیکھنا اور پانا چاہتا ہے وہ عہد حاضر کے جامع المجددین کی کتابی آیتوں کی طرف علماً و عملاً رجوع کر کے خود مشاہدہ کر سکتا ہے۔ عجیب بات ہے جس طرح ذالک الکتاب کا معجزہ رکھنے والے نے دوسرے غیر متعلق معجزات کے مطالبہ کی نسبت یہ فرمایا کہ "قُلْ لَا اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ" اسی طرح نبی کامل کے متبع کامل کے کلام میں بھی کثرت سے جا بجا کشف و تصرفات سے اپنی قطعاً تبری فرمائی گئی ہے اور سارا زور بس وحی یا شریعت کے احکام و اتباع پر ہے"

آپ نے دیکھا! بھلا اس جوش عقیدت کی کوئی انتہا بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قرآن پاک کا ارشاد ہے "هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا" تو یہاں حضرت جامع المجددین کے لئے بھی جگہ جگہ مجدد و مبعوث کا خطاب" وہاں "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" تو یہاں بھی لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" کا عکس (ص ۵۴) وہاں قرآن مجید آنحضرت کا معجزہ تو یہاں بھی مولانا تھانوی کی کتابیں تجدیدی کرامت" وہاں ذالک الکتاب آیات بینات تو یہاں بھی مولانا تھانوی کی کتابوں کے مباحث "کتابی آیتیں" عقیدت و ارادت کا کتنا ہی جوش اور زور ہو آخر یہ تو سوچنا چاہئے تھا کہ آفتاب بہر حال آفتاب ہے اور ایک ذرہ خواہ کیسا ہی چمکیلا اور درخشاں ہو بہر حال ذرہ ہے اس بنا پر یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ ذرہ کے صفات کو آفتاب کے صفات پر منطبق کرنے کی کوشش کی جائے اور دوراعنوان بدل کر یہ باور کرایا جائے کہ اب آفتاب غروب ہو گیا ہے تو ذروں سے ہی کسب ضیا کرنا چاہئے!

اب ہم ذیل میں چند ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہو گا کہ کسی حکم میں اصل اسلامی تعلیم کی رو سے کتنی لچک تھی لیکن فاضل مصنف نے محض جامد عقیدت کے باعث اس میں کتنی جکڑ بند کر دی ہے اور

اس بنا پر وہ حکم یک طرفہ ہو کر رہ گیا ہے۔

(۱) مثلاً مولانا تھانوی کی یہ خصوصیت بے شبہ لائق ستائش و تحسین ہے کہ وہ امراسے ملنے جلنے میں استغنا اور بے نیازی برتتے تھے۔ ان سے کوئی غرض نہیں رکھتے تھے اور عالمانہ خودداری کو قائم رکھتے تھے، اور جہاں تک کہ راقم الحروف کی افتادِ طبع اور مزاج کا تعلق ہے احباب اچھی طرح جانتے ہیں وہ خود بھی اسی روش کو پسند کرتا اور اس پر عامل ہے لیکن مولانا تھانوی کے اس عمل کو آڑ بنا کر ان تمام علما اور مشائخ پر تبرا کرنا جو امرا سے میل جول رکھتے ہیں اور ان کو مطلقاً برا بھلا سنانا اسلام کی تعلیمات کا مقتضا نہیں ہے مگر افسوس کہ مولانا عبدالباری نے ایسا ہی کیا ہے۔ چنانچہ حیدرآباد کا ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یہ سوالات ہی بے چارے کے خواب و خیال میں کیا گذرے ہوں گے کہ جواب دیتے۔ ان کو سابقہ اب تک ایسے علما، مشائخ سے پڑا تھا جو خود ہی طرح طرح کے ظاہر و مخفی وسائل و ذرائع سے باریابی کے طالب و ساعی ہو کر آتے تھے"[۱]

اس کے بعد یہ واقعہ ختم کر کے اس پر ریمارک کرتے ہیں۔

"ضرورت ہے کہ دین کے علما و مشائخ کی آنکھیں کھلیں اور ان کی نظر ان باتوں تک پہنچے ورنہ امرا کے درباروں میں حاضری اور درباری داری سے دنیا تو شاید کچھ مل جاتی ہو لیکن دین اپنا ان کا اور دوسروں سب کا کھو دیتے ہیں راقم احقر کو حیدرآباد ہی میں بارہا اس کے تجربات ہوئے کہ جو اہل علم و دین خود طالب اور امراء کو کسی اعتبار سے بھی مطلوب بنا کر جاتے ہیں۔ خواہ کسی کی سفارش ہی کے لئے ہو وہ کچھ نہ کچھ مروت و مداہنت اور تملق پر لازماً مضطر ہوتے ہیں اور حس ہو تو علم و دین ہی کی نہیں۔ خود اپنی بھی خاصی ذلت تو آدمی ضرور محسوس کرتا ہے مگر اکثر بے حسی کا یہ عالم دیکھا کہ اس ذلت کو الٹے فخر و مباہات جان کر گاتے پھرتے ہیں"

اس سلسلہ میں یہ بات دلچسپی سے سنی جائے گی کہ انھیں سطور کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت مولانا تھانوی کے قلب میں امارت و دولت کی بنا پر امرا کی کوئی عظمت نہیں تھی" سوال یہ ہے کہ عظمت کیوں تھی جب کہ قرآن مجید نے دولت کو متعدد مواقع پر "خیر"، "فضل اللہ" اور "نعمت" کہا ہے اور جب کہ یہ ظاہر

---

[۱] مولانا عبدالباری ندوی سینہ پر ہاتھ رکھ کر فرمائیں کہ ان سطور میں ان کا گوشۂ نظر حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف تو نہیں ہے؟

ہے کہ سینکڑوں اہم اور ضروری عبادتیں اور کارہائے ثواب ایسے ہیں جو دولت و ثروت کے ذریعہ ہی انجام پا سکتے ہیں۔ دولت کا بے محل صرف بے شک گناہ اور لایقِ مذمت ہے۔ لیکن دولت بنفسہا تو اللہ کی ایسی ہی نعمت ہے جیسا کہ علم۔ حسن۔ تندرستی۔ طاقت و قوت۔ بادشاہت اور اقتدار ہے اور اللہ کی ان نعمتوں کی عظمت کا دل میں احساس نہ ہونا مقتضائے اسلام نہیں بلکہ نامردی۔ بزدلی اور بدذوقی و کم سوادی ہے

چنانچہ دیکھو مذکورہ بالا نعمتوں میں سے کون سی نعمت ہے جو بکمالِ افراط و بہتات آنحضرتؐ کو عطا نہیں فرمائی گئی، کہا جاتا ہے کہ آپ کے پاس دولت تو نہ تھی تو یاد رکھنا چاہئے کہ یہ کہنا بالکل غلط ہے جن ذاتِ اقدس کے وجود سے ہی عالم آب و گل کی رونق و بہار ہو اور قیصر و کسریٰ کی حکومتیں جس کے غلامانِ غلام کے قدموں پر جھکی ہوئی ہوں ان کے لئے دولت کی کیا کمی ہو سکتی تھی لیکن اس کی شانِ بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ گھر میں بسا اوقات چولھے میں دو دو وقت آگ بھی نہیں جلتی تھی جو کچھ تھا قوم و ملت کے لئے تھا اور دوسروں کے لئے تھا اس نے ایک غریب و مفلوک الحال قوم کو خاکِ مذلت سے اٹھا کر خزائن السمٰوٰت والارض کا مالک بنا دیا۔ اور خود ایک کمبل پر قانع رہا۔ اس نے اونٹ چرانے والے اور ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ میں مارے مارے پھرنے والوں کے گھروں میں سونے چاندی کی نہریں بہا دیں، کلاہِ خسرو اور تختِ جمشید کو ان کے قدموں پر لاڈالا لیکن خود اس کا اثاثہ بیت چند معمولی چیزوں کے علاوہ کسی اور چیز پر مشتمل نہ تھا، یہ ہی شانِ شانِ فقر تھی جس کے معنی بے نیازی کے ہیں اور اسی کو آپ نے "الفقر فخری" فرمایا۔

خیر! یہ نکتہ تو بہ طور جملہ معترضہ کے تھا۔ اب ذرا ایک اور عبارت ملاحظہ فرمایئے۔

"حیدرآباد جانے والے علماء و مشائخ میں بہت ہی کم کوئی ہوگا جو اعلیٰ حضرت کی خدمت میں باریابی کی آرزو اور وظیفہ و منصب وغیرہ کی طمع دل میں نہ رکھتا ہو اور اس کے لئے کھلی چھپی کوشش نہ کرتا ہو۔" (ص ۵۴)

اول تو سب کو ایک لکڑی سے ہی ہانک دینا قرینِ انصاف نہیں ہے۔ کیونکہ ان میں کچھ ایسے بھی ضرور ہوں گے جو یہ سمجھتے ہوں گے کہ اگر اعلیٰ حضرت کی اصلاح کر دی جائے تو اس کے ذریعہ دین کے نہایت اہم اور عظیم الشان کام انجام پا سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ نظام خود کسی کے پاس جاتے نہیں ہیں اس لئے انھوں نے اپنا مذہبی اور دینی فریضہ سمجھا کہ وہ خود نظام کے پاس جائیں اور کلمۂ حق سنائیں اور پھر اگر بالفرض

وظیفہ یا منصب کے لئے بھی کسی نے کوشش کی تو ممکن ہے کہ اس کی نیت یہ ہو کہ وظیفہ یا منصب پانے کے بعد وہ معاشی ضروریات سے بالکل مطمئن ہو جائے گا اور اپنا سارا وقت علم اور دین کی خدمت کے لئے وقف کر دے گا۔ اگر واقعی ایسا ہے تو یہ اچھی بات ہے اس میں برائی کون سی ہے۔ تاریخ اسلام کا مطالعہ کیجئے آپ کو ہر دور میں علماء اور مشائخ میں دو قسم کے لوگ ملیں گے ایک وہ جو دربار سے اور امرا سے الگ رہے اور دوسرے وہ جو محض اصلاح اور دین کی خاطر دربار سے بھی تعلق رکھتے تھے اور امرا سے بھی۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ بعض دنیا دار علماء کا حال وہی ہے اور وہی رہا ہے جو مولانا عبد الباری نے لکھا ہے۔ لیکن "انما الاعمال بالنیات" اور "ان بعض الظن اثم" کے پیش نظر ہر اس شخص کو جس کا عمل مولانا تھانوی کے عمل سے مختلف ہے ملعون و مطرود کر دینا اسلامی تعلیمات کی ہمہ گیری اور وسعت کے خلاف ہے۔

(۲) ڈاڑھی رکھنا بلاشبہ سنت ہے، لیکن ہمارے نزدیک آج کل اس کا حکم "عموم بلویٰ" کے ماتحت آتا ہے یعنی ایک زمانہ میں ڈاڑھی منڈانا فسق جلی تھا اس بنا پر ایسے شخص کی شہادت معتبر نہ تھی لیکن اب جب کہ گھر گھر اور تمام عالم اسلام میں اس کا رواج ہو گیا ہے اور یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اچھے اچھے نماز روزہ کے پابند یہاں تک کہ تہجد اور اشراق کے پابند۔ زکوٰۃ دینے والے اور حلال و حرام کا فرق رکھنے والے بھی ڈاڑھی منڈانے لگے ہیں تو اب اس کا حکم وہی ہو گا جو ترک جماعت وغیرہ کا ہے یعنی اپنی جگہ پر یہ فعل غیر مستحسن اور مذموم رہے گا لیکن کم از کم سماجی معاملات اور معاشرتی علائق میں اب یہ اس درجہ قابل نکیر نہ ہو گا جتنا کہ پہلے تھا ایک فقیہ کا فرض ہے کہ اس طرح کے مسائل پر گفتگو کرتے وقت گرد و پیش اور زمانہ اور سوسائٹی کے احوال کا لحاظ رکھے۔ اسی بنا پر فقہ کی عام کتابوں میں اور خود قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منقول ہے کہ "من لم یکن عالما باحوال زمانہ لم یجز لہ الفتیا"، لیکن ہمارے لائق مولف سے اس معاملہ میں بھی ذرا بے اعتدالی ہوئی ہے۔ وہ اس پر سخت خفا ہیں کہ علماء و مشائخ ڈاڑھی منڈے چھو کروں کو کیوں داماد بنا لیتے ہیں حالانکہ ہو سکتا ہے کہ جس کی ڈاڑھی منڈی ہے اس کا باطن سینکڑوں ارباب ریش سے زیادہ صاف اور اُجلا ہو، اور وہ بیوی کے لئے ایک بہتر شوہر بننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ شعر

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے   آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

اس موقع پر مولانا نے علماء اور مشائخ کو جو جلی کٹی باتیں سنائی ہیں آپ بھی ان سے لطف اٹھائیے فرماتے ہیں:۔

"بخلاف مسلمانوں کے کہ ان کی ڈاڑھی بھی ایک دینی شعار ہے لیکن جماعت میں چونکہ اس پر کوئی نکیر و نفرت نہیں رہی بلکہ الٹے منڈانا ہی فیشن بن گیا ہے اس لئے علماء و مشائخ سب کے گھروں میں بے دھڑک استرا چلتا رہتا ہے اور باپ بیٹے تک کو نہیں ٹوکتا۔ ڈاڑھی کس شمار میں ہے۔ نماز روزہ تک کے لئے نکیر نہیں ہوتی۔ بلکہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ نام نہاد علماء و مشائخ کو تو فیشن ایبل اور اپ ٹو ڈیٹ داماد ہی کی فکر میں دیکھا" (ص ۱۶۲)

لائق مؤلف کو اس کا خیال رکھنا ضروری تھا کہ مولانا تھانویؒ مسلکاً حنفی تھے اور پھر بعض مسائل مجتہد فیہا میں اپنی ایک خاص رائے رکھتے تھے۔ اس بنا پر مسائلِ فقہیہ میں کلام کرتے ہوئے مولانا جو کچھ فرمائیں گے وہ اسی ایک خاص مسلک کی پابندی اور اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے ہی ماتحت ہوگا آپ اس کو حق اور درست جو چاہیں کہیں کہہ سکتے ہیں لیکن اسی کو عین دین کہنا تو درست نہ ہوگا مثلاً مولانا کسی مریض کی طرف سے بکرا ذبح کرنے اور جان کے بدلہ میں جان دینے کا خیال کرنے کو تقول علی اللہ اور ناجائز فرماتے ہیں حالانکہ علمائے دیوبند میں ہم نے اپنے اکابر کو دیکھا ہے وہ اس قسم کے مواقع پر خود بکرا ذبح کرتے تھے مولانا فرماتے ہیں "عقیقہ پر قیاس درست نہیں کیونکہ وہ خود قیاسی نہیں اور غیر قیاسی حکم صرف نص تک ہی منحصر رہتا ہے" (ص ۵،۳) گذارش یہ ہے کہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے واقعہ اور حکم عقیقہ کے پیش نظر جب اسلام نے ایک مرتبہ اس بات کا اعتبار کر لیا کہ ایک انسان کی جان کا بدلہ بکرے کی جان ہو سکتی ہے تو اب یہ امر شرعاً غیر قیاسی نہیں رہا۔ بلکہ قیاسی ہو گیا علاوہ بریں یہ معلوم ہے کہ بکرا ذبح کرنا قربۃً من قرباتِ اللہ ہے اور عند اللہ ایک عمل مشروع ہے تو اب اس اساس پر اس کو بے تکلف اختیار کیا جا سکتا ہے اور بے شبہ اس کا ثواب ملے گا۔

(باقی آئندہ)

حالات حاضرہ

مشرقِ وسطیٰ کی انقلابی جدوجہد کا پس منظر

از

(اسرار احمد صاحب آزاد)

ٹیونس، مصر، ایران اور مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے ممالک میں آج سیاسی اعتبار سے جو صورتِ حال رونما ہو رہی ہے دنیا اس کے انھیں گوشوں سے واقف ہے جو شاہ فاروق کی تخت حکومت سے دستبرداری ٹیونس میں فرانسیسی اثر و اقتدار کے خلاف عوام کی سرفروشانہ جدوجہد اور ایران میں غیر ملکی اجارہ داری سے عوام کی روز افزوں بیزاری کی صورت میں نمایاں ہو رہے ہیں لیکن اس تمام تر سیاسی جدوجہد اور تغیرات کے پس پردہ جو عوامل و اسباب کارفرما ہیں وہ دراصل اقتصادی اور معاشی ہیں اور اگرچہ مشرقِ وسطیٰ کے تقریباً تمام ممالک آزاد اور خود مختار کہلاتے ہیں لیکن اس آزادی اور خود مختاری کے باوجود ان میں سے کوئی ایک ملک بھی مغربی سرمایہ داروں کی گرفت سے آزاد نہیں اور مغربی سرمایہ پرستوں کی یہی گرفت اور اجارہ داری آج اس خطۂ ارض کے کروڑوں باشندوں کے لئے تباہ حالی کا موجب بنی ہوئی ہے۔

آج کی بین الاقوامی صورتِ حالات کو سمجھنے کے لئے اس امر کا ذہن نشین کر لینا بے حد ضروری ہے کہ "سرمایہ دار" اور "شہنشاہیت پسند" ممالک ہمیشہ ایسے چند خطوں پر مسلط اور متصرف رہنے کے خواہشمند ہوا کرتے ہیں جہاں سے انھیں خام اشیاء دستیاب ہو سکیں اور وہ ان خام اشیاء سے جو سامان تیار کریں وہاں اسے فروخت کیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال کے پیش نظر ایسے علاقوں میں قومی صنعتوں کو فروغ حاصل نہیں ہو سکتا ان علاقوں کے تمام تر قدرتی وسائلِ آمدنی ان علاقوں کے باشندوں کے لئے بے کار ہو کر رہ جاتے ہیں اور اس طرح ان پر جو اقتصادی بدحالی طاری ہوتی ہے وہ ان کی سیاسی آزادی کو بھی عملاً ختم کر دیتی ہے۔ اور آج مشرقِ وسطیٰ ایک آزاد اور خود مختار خطۂ ارض

ہونے کے باوجود رجعت اور پسماندگی کے اسی دور سے گذر رہا ہے اور ایک امریکی ماہر اقتصادیات ڈکٹر پرلو نے بیرونی ممالک سے امریکہ کو حاصل ہونے والے مالی منافع کے جو اعداد و شمار شائع کئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ـــــــ امریکہ نے مارشل پلان کے ماتحت مختلف ممالک کو جو مالی امداد دی ہے اس پر اسے یورپی ممالک سے ۵ر۱۴ ، لاطینی امریکی ممالک سے ۷ر۱۴ ، اس پلان کے ماتحت امداد حاصل کرنے والے ممالک کی نو آبادیات سے ۲۰ اور مشرق وسطیٰ کے ممالک سے ۳ر۳۱ فیصد منافع حاصل ہو رہا ہے اور اسی لئے مغربی سرمایہ دار اس خطہ کو زرعی خطہ باقی رکھنے کے خواہشمند ہیں اور آج بھی اس خطہ کے ۸۵ فیصد باشندے محض زراعت پر زندگی گذارنے کے لئے مجبور ہیں اور یہ زراعت بھی قومی اعتبار سے خود ان کے لئے زیادہ سود مند ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس سے بھی مغربی سرمایہ داروں ہی کو فائدہ پہنچتا ہے۔

مثال کے طور پر مصر، ترکی، عراق اور ایران کو پیش نظر رکھئے۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ مصر ہمیشہ سے کپاس کی پیداوار کے لئے مشہور رہا ہے ترکی میں اعلیٰ قسم کا تمباکو بکثرت پیدا ہوتا ہے، عراق کھجوروں کی پیداوار کے لئے مشہور ہے اور ایران کی زرعی آراضی دھان اور کپاس کی پیداوار کے لئے بے حد سازگار ہے اور یہ امر بھی ایک مسلّم حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے کہ دوسری عالمگیر جنگ سے قبل یہ تمام ممالک بالواسطہ یا بلاواسطہ برطانیہ کے زیر اثر تھے چنانچہ برطانوی سرمایہ داروں نے ان ممالک میں جو زرعی حکمت عملی اختیار کی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے ان ممالک کے باشندوں کی ضرورتوں کو نظر انداز کر کے مصر میں کپاس، ترکی میں تمباکو، عراق میں کھجوروں اور ایران میں دھان اور کپاس کی کاشت کو ترقی دی جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہاں غلہ کی کاشت برائے نام رہ گئی چنانچہ سال رواں کے آغاز میں مصر کے ایک جریدہ "الاساس" نے مصر میں گندم کی درآمد کے جو اعداد و شمار شائع کئے تھے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۴۸ء میں مصر نے ۲۶۰۰ ۲۳ ٹن گندم درآمد کیا تھا لیکن ۱۹۴۹ء میں یہ مقدار ۵۷۹۰۰ ٹن اور ۱۹۵۱ء میں ۱۰۲۷۸۰۰ ٹن تک پہنچ گئی تھی اور اگرچہ ایران دوسری عالمگیر جنگ سے قبل غلہ کے سلسلہ میں ایک خود مکتفی ملک رہا تھا لیکن ۱۹۴۹ء میں اسے بھی دو لاکھ ٹن گندم درآمد کرنے پر مجبور ہو جانا پڑا تھا

پھر اسی قدر نہیں بلکہ غیر ملکی سرمایہ داروں کی حکمت عملی کے ماتحت مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں جو کاشت کی جاتی ہے کاشت کار خود اس کاشت سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ ان فصلوں کو بھی غیر ملکی اجارہ دار ہی کم قیمت خرید لیتے ہیں اور اجناس کو غیر ممالک میں فروخت کر کے عظیم منافع حاصل کرتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ برطانیہ اور امریکہ کی سیاسی، اقتصادی اور تجارتی رقابت بھی مشرق وسطیٰ کے ممالک اور ان کے باشندوں کو شدید نقصان پہنچا رہی ہے مثال کے طور پر ترکی کے تمباکو کی تجارت ہی پر غور کیجئے۔ ترکی کا بیشتر تمباکو مغربی جرمنی میں درآمد کیا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ درآمد سرعت کے ساتھ زوال پذیر ہو رہی ہے چنانچہ ۱۹۴۹ء میں ترکی نے مغربی جرمنی کو ۲۵۹ ملین لیرا کا تمباکو مہیا کیا تھا لیکن ۱۹۵۱ء میں مغربی جرمنی نے ۱۰۷ ملین لیرا سے زیادہ کا ترکی تمباکو درآمد نہیں کیا اس طرح مشرق وسطیٰ پر غیر ملکی سرمایہ داروں کا اثر و اقتدار اس خطہ کی زراعت کی تباہی کا موجب ثابت ہو رہا ہے آراضی سے محروم کاشتکاروں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے، زراعت کے فرسودہ طریقوں اور زرعی آراضی کو تقویت بہم پہنچانے کے جدید زین وسائل کے فقدان کی بدولت زرعی آراضی کی قوتِ نمو کم ہو رہی ہے اور ان اسباب کی بناء پر کاشت کے اوسط میں بھی کمی رونما ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں ۱۹۵۰ء کی نسبت ایران میں گندم ۱۱ فیصد کم پیدا ہوا تھا اور جو نیز وہاں کی پیداوار میں علی الترتیب ۵ ر ۷ نیز ۱۲ فیصد کی کمی رونما ہوئی تھی اور اسی طرح مصر میں ۱۹۴۹ء کی نسبت ۱۹۵۰ء میں جو ۵۲ فی صد کم پیدا ہوئے تھے۔ یہ ہے مشرق وسطیٰ کی زرعی صورت حالات جو بحیثیت مجموعی اس خطہ ارض ۸۵ فی صد باشندوں پر اثر انداز ہو رہی ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ خطہ ارض قومی صنعتوں سے مطلقاً محروم نہیں اور کم از کم قومی صنعتوں کے ساتھ وابستہ طبقہ کے اقتصادی حالات بہتر ہونے چاہئیں . . . .

. . . . لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے اور صنعتوں کے ساتھ وابستہ ۱۵ فیصد لوگوں کا بھی وہی حال ہے جو زراعت پیشہ افراد کے سلسلہ میں بیان کیا جا چکا ہے

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مشرقِ وسطیٰ کے تمام تر ممالک صنعتی اعتبار سے بے حد پسماندہ واقع ہوئے ہیں اور ان ممالک کے ملکی سرمایہ دار اب تک جو کچھ کر سکے ہیں، وہ پارچہ بافی نیز چمڑے کا سامان

اور شیشہ کے برتن بنانے یا پھر خوراک سے متعلق بعض اشیاء کو محفوظ کرنے یا بنانے کے کارخانے قائم کرنے ہی تک محدود ہے اس کے برعکس اس خطۂ ارض میں معدنیات اور خصوصاً تیل برآمد کرنے کی جو عظیم صنعت قائم ہے اور روز بروز ترقی کرتی جارہی ہے اس پر عموماً غیر ملکی سرمایہ دار مسلط ہیں، اور سعودی عرب، کویت اور بحرین میں جہاں جہاں تیل کے بڑے بڑے چشمے موجود ہیں اور جن سے غیر ملکی سرمایہ دار مالامال ہو رہے ہیں مقامی باشندے محض دستکاری کی بدولت زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔ پھر چونکہ حال ہی میں سرمایہ دار مغربی تاجروں نے مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں تیار شدہ مال بکثرت درآمد کیا ہے اس لئے ان ممالک کی صنعتوں کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے کارخانے بند ہوتے جارہے ہیں۔ بے کار صنعتی مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے "مصر کی صنعتی ایربک" سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۴۷ء کی نسبت ۱۹۵۰ء میں اونی پارچہ جات ۵۰ فی صد کم تیار کئے گئے تھے۔

ایران میں ہر سال ۹۰ اور ایک سو ملین میٹرس تک سوتی پارچہ درکار ہوتا ہے اور ملک میں اس کا ایک تہائی کپڑا تیار ہو سکتا ہے لیکن بحری محاصل کی یادداشتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۰ء میں برطانیہ اور امریکہ سے اس ملک میں ۲۰۴ ملین سوتی پارچہ جات آئے اور بازار میں غیر ملکی پارچہ جات کی اس کثرت کے باعث پارچہ بافی کے بہت سے ملکی کارخانوں کو بند کر دینا پڑا۔ پھر اس غیر ملکی تجارتی مقابلہ کے باعث مشرقِ وسطیٰ کی دوسری صنعتیں بھی متاثر ہو رہی ہیں چنانچہ ۱۹۴۷ء میں مصر نے ۲۲۵۵۰۰ ٹن شکر تیار کی تھی مگر ۱۹۵۰ء میں مصر کی تیار کردہ شکر محض ۱۷۴۰۰۰ ٹن تھی اسی لئے مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں بے کاری اور بے روزگاری بڑھتی جارہی ہے اور اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۵۱ء میں ترکی میں ۲۰ لاکھ ایران میں تین لاکھ سے زیادہ اور لبنان میں ۶۰ ہزار افراد بے کاری کی مصیبت میں مبتلا تھے اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے اس کے برعکس جنگی اور فوجی سامان کی تیاری میں غیر معمولی ترقی رونما ہو رہی ہے مشرقِ وسطیٰ کے طول و عرض میں ہوائی مستقروں کی تعمیر جاری ہے اور اسی لئے گذشتہ سال ۱۹۴۷ء کی نسبت لبنان میں دوگنا سمنٹ تیار کیا گیا تھا اور مصر میں

اس میں شک نہیں کہ مشرقِ وسطیٰ کے بیشتر ممالک میں کان کنی کی صنعت غیر متوقع سرعت کے ساتھ ترقی کر رہی ہے لیکن صرف اس لئے کہ اس صنعت کی بدولت جنگ باز ممالک اور گروہوں کو سامانِ جنگ تیار کرنے کے لئے خام اشیاء دستیاب ہوتی ہیں چنانچہ ۱۹۳۶ء سے قبل ترکی ۳۶ ہزار ٹن

خام کردمیم برآمد کیا کرتا تھا لیکن ۱۹۳۶ء اور ۱۹۵۱ء کے درمیان کی مختصر سی مدت میں ترکی سے برآمد ہونے والے خام کردمیم کی مقدار چار لاکھ ٹن سالانہ تک پہنچ گئی ہے لیکن کان کنی کی صنعت خود اس خطہ کے باشندوں کے لئے سودمند اور نفع بخش ثابت نہیں ہو رہی اور اس کا تمام تر منافع غیر ملکی سرمایہ دار حاصل کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر تیل کے مسئلہ ہی پر غور کیجئے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد مشرق وسطیٰ کے ممالک میں تیل کی برآمدگی کی رفتار بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ ان ممالک میں ۱۹۵۱ء میں بحیثیت مجموعی جس قدر تیل برآمد ہوا تھا وہ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۳۷ء میں برآمد ہونے والے تیل کی مقدار کے مقابلہ میں علی الترتیب ۲۶۰ اور ۵۲۰ فیصد زیادہ تھا۔ سعودی عرب میں ۱۹۳۷ء میں صرف ۸ ہزار ٹن تیل برآمد ہوا تھا مگر ۱۹۵۱ء میں اس کی مقدار ۳۷۵۰۰۰۰۰ تک پہنچ گئی تھی۔ ایک ٹن تیل کو برآمد اور صاف کرنے پر ۲۳ء۱ ڈالر کی رقم صرف ہوتی ہے لیکن ۱۹۵۰ء میں تیل کو ۵۰ء۱۲ ڈالر فی ٹن کے حساب سے فروخت کیا جا رہا ہے اور یہ تمام گراں قدر منافع صرف غیر ملکی سرمایہ داروں کا حصہ بن رہا ہے اور یہ غیر ملکی سرمایہ دار عرب اور ایرانی مزدوروں سے چودہ چودہ اور سولہ سولہ گھنٹے کام لے کر انھیں تیس چالیس سینٹ سے زیادہ اجرتِ کار نہیں دیتے۔ حالانکہ جنوبی امریکہ کی ریاستوں میں تیل برآمد کرنے کے کارخانوں میں کام کرنے والے وہ مزدور جنہیں کم اجرتِ کار دی جاتی ہے عرب اور ایرانی مزدوروں کے مقابلہ میں چھ اور سات گنی زیادہ اجرتِ کار پاتے ہیں۔ پھر اسی قدر نہیں بلکہ غیر ملکی سرمایہ دار چونکہ مشرق وسطیٰ کی خام پیداوار کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں ان ممالک سے باہر لے جاتے ہیں اس نے قومی صنعتیں معطل ہی نہیں بلکہ تباہ ہوتی جا رہی ہیں اور اس طرح اس خطہ ارض کے کروڑوں باشندے اقتصادی اور سماجی انتشار اور بدحالی میں مبتلا ہیں۔

لیکن عام اقتصادی بدحالی، افلاس اور نکبت مشرق وسطیٰ کے باشندوں میں اس نظام کے خلاف نفرت اور غصہ کے جذبات پیدا کرنے کی موجب بھی ثابت ہو رہی ہے جس کے ماتحت انھیں حیوانوں سے بدتر زندگی گذارنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور اسی احساس کے ماتحت وہ صرف غیر ملکی اثر و اقتدار اور اجارہ داری کے خلاف صف آرا ہوتے جا رہے ہیں بلکہ ان ملکی شہنشاہیت پسندوں، جاگیرداروں اور سرمایہ پرستوں کی گرفت سے بھی نجات حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں جو اپنے ہی جیسے غیر ملکی سرمایہ داروں کے ساتھ وابستہ رہ کر نہ صرف خود ہی عوام کا خون چوستے ہیں بلکہ غیر ملکی سرمایہ داروں کو بھی ان کا خون چوسنے میں مدد دیتے ہیں اور آج مشرق وسطیٰ میں جو اہم سیاسی انقلابات رونما ہو رہے ہیں ان کی محرک سرمایہ داروں کی تحصیل بالجبر اور عوام کی اقتصادی تباہ حالی کی بدولت ان میں پیدا شدہ بیداری ہی ہے۔

غزل

از

(جناب الم مظفر نگری)

نگاہوں میں جو تو پیدا مذاقِ گفتگو کر لے
تو پھر ہر جلوۂ خلوت نشیں کو روبرو کر لے

سمجھنا چاہئے اس وقت دل کو دل حقیقت میں
مذاقِ درد جب پیدا یہ اک قطرہ لہو کر لے

یوں ہی بے چارگی میں ہو گی تسکینِ دلِ وحشی
سرشکِ غم سے ٹھنڈی اور خاکِ آرزو کر لے

نہ آئے راس دم بھر عالمِ آوارگی جس کو
وہ اپنے دل کو پابندِ مآلِ جستجو کر لے

پہنچ جاتا ہے مثلِ شبنمِ تر اپنی منزل پر
وہ ہر ذرہ گلستاں کا جو آہنگِ نمو کر لے

حقیقت نوبہارِ گل کی کھل جائے گی دم بھر میں
ذرا نظروں کو اپنی بے نیازِ رنگ و بو کر لے

عوض تسکینِ باطل کے متاعِ درد کھو بیٹھا
کہا تھا کس نے تجھ سے چاکِ زخمِ دل رفو کر لے

بڑھا کرتی ہے ہمت جس کی ناکامیِ پیہم سے
کہاں ممکن وہ احساسِ شکستِ آرزو کر لے

حریمِ ناز میں تجھ کو نمازِ عشق پڑھنی ہے
ہر اک قطرے سے خونِ دل کے تکمیلِ وضو کر لے

حریفِ غم تجھے رہنا ہے گر دورِ خزاں میں بھی
بہاروں میں مہیا مثلِ گل جام و سبو کر لے

وہ ہر عالم میں بے پردہ نظر آ جائیں گے تجھ کو
الم اپنی نگاہوں کو خرابِ جستجو کر لے

غزل

اسنا

(جناب بسمل شاہجہاں پوری)

موت کتنی مبارک آئی ہے — ان کا پیغام ساتھ لائی ہے
آہ جب دل سے لب پہ آئی ہے — روح کونین تھرتھرائی ہے
مجھ سے ملنا رقیب کے ہمراہ — یہ بھی اک مستقل جدائی ہے
پھر کوئی انقلاب آئے گا — پھر مرے دل نے چوٹ کھائی ہے
مجھ کو اپنے بھی دے گئے دھوکا — آج دنیا سمجھ میں آئی ہے
بے کسی میری اشکِ غم بن کر — نوکِ مژگاں پہ تھرتھرائی ہے
دل دہلنے لگے کناروں کے — جب مری ناؤ ڈگمگائی ہے
حسن اور اس پہ بے پناہ شباب — بے تکلف قیامت آئی ہے
ہر کلی ہے مرے چمن کی اداس — ہائے کیسی بہار آئی ہے
(قطعہ) اک برہمن ہے ایک شیخِ حرم — دو بزرگوں میں ہاتا پائی ہے
میں تو ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں — دوستو اس میں جگ ہنسائی ہے
(قطعہ) تیرے جلووں کے اذنِ بیجا پر — کائناتِ نظر لٹائی ہے
ان وفاؤں کے باوجود اے دوست — مجھ پہ الزامِ بے وفائی ہے
اپنے ہاتھوں سے میں نے اے بسملؔ
نقشِ انسانیت اٹھائی ہے

"نغمہ و ناوک"

(ترجمہ)

(شمس نوید)

(۱)

فضا میں چھوڑ دیا میں نے اک ناوکِ تیر
کہیں زمیں پہ گرا وہ — مگر سجھا نے کہاں؟
کچھ اتنی تند تھی پروازِ برق رو اس کی
نہ پا سکی نگہِ تیز بھی سراغ و نشاں

(۲)

خلا کی سمت کیا میں نے ایک شعر بلند
دلِ زمیں پہ گرا وہ — مگر سجھا نے کہاں؟
جو ایک شعر تعاقب کی زد میں لے آئے
کہاں کسی کی نظر اس قدر لطیف و رواں

(۳)

بہت دنوں میں مگر تیر سالم و محفوظ
مجھے بلوط میں پیوستِ شاخسار ملا!
مرا وہ نغمۂ گم گشتہ با تمام و کمال
دلِ رفیق میں "محفوظ یادگار" ملا!

(لونگ فیلو)

تبصرے

تجلیات مدینہ | مرتبہ مولانا محمد احتشام الحسن صاحب کاندھلوی تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۵۶ قیمت عہ ملنے کا پتہ۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی۔ اور مکتبہ برہان دہلی

مولانا محمد احتشام الحسن صاحب کم وبیش دو سال سے ہچکیوں کے نہایت تکلیف دہ مرض میں مبتلا ہیں، دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ظاہری سکون کے چند لمحے بھی ان کو مشکل سے میسر ہوتے ہوں گے لیکن مرض کی اس مسلسل یورش کے باوجود حیرت انگیز طریقے پر لکھنے پڑھنے کے کام میں منہمک رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ امتدادِ علالت کے ان دنوں میں بھی ان کے قلم سے متعدد ضخیم اور مفید کتابیں نکل چکی ہیں زیر نظر کتاب "تجلیات کعبہ" کے بعد ان کی دوسری متبرک تالیف ہے جس کے مطالعہ سے پڑھنے والا فی الحقیقت "تجلیات مدینہ" میں گم ہو جاتا ہے، یوں تو حج وزیارت اور فضائل حرمین پر بے شمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور آئے دن ہوتی رہتی ہیں لیکن "تجلیات مدینہ" مختلف وجوہ سے ان میں امتیازی شان رکھتی ہے، یہ دیارِ محبوب کی ایک مختصر اور جامع تاریخ بھی ہے اور کیفیات وتاثرات کا ایک وجد آفریں مرقع بھی، جس کو پڑھ کر مسجد نبوی اور روضۂ اطہر کی زیارت کا ایک شوقِ بے تاب قلب میں چٹکیاں لینے لگتا ہے۔

کتاب ۸۴ عنوانوں پر مشتمل ہے، ہر عنوان کے نیچے مدینہ منورہ اور اس کے مقامات مقدس کے متعلق بکھری ہوئی معلومات جمع کی گئی ہیں انداز بیان بھی سادگی کے باوجود دل پذیر ہے نمونہ ملاحظہ فرمائیے شوق کے وجوہ لکھتے، لکھتے، لکھتے ہیں۔

"جب اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو بنانے کا ارادہ کیا تو اس "نور محمدی" کے چار حصے کئے، پہلے حصے سے قلم بنایا اور دوسرے حصے سے لوح بنائی اور تیسرے حصے سے عرش بنایا اور چوتھے حصے کے پھر چار حصے کئے، پہلے

حصے سے حاملین عرش بنائے اور دوسرے حصے سے کرسی بنائی اور تیسرے حصے سے باقی تمام فرشتے بنائے اور چوتھے حصے سے نورِ بصیرت اور نورِ معرفت اور نورِ توحید بنائے۔ (بحوالہ مواہب لدنیہ)

"اب جن نفوس قدسیہ کو نورِ بصیرت اور نورِ معرفت اور نورِ توحید کا کوئی حصہ عطا ہوا ہے وہ نورِ محمدی کا جزو اور حصہ ہے جو ہمیشہ اپنے کل اور اصل کی جانب مائل اور مشتاق رہتا ہے اور یہ شوق و اشتیاق اس وقت تک کم نہیں ہو سکتا جب تک کہ نورِ محمدی کے ساتھ وصال نصیب نہ ہو جائے"

اتنی اچھی اور جذباتِ محبت و شوق میں ڈوبی ہوئی کتاب میں اگر کہیں کہیں ترتیب کی کچھ خامیاں نظر آتی ہیں تو وہ بے شبہ نظر انداز کر دینے کے لائق ہیں۔

فضائل و مناقب اور ترغیب و ترہیب کے باب میں چونکہ ہمارے علماء نے ایک ایسا اصول وضع کر دیا ہے جس کے تسلیم کر لینے کے بعد کمزور اور ضعیف احادیث و آثار سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے اس لئے اگر مولف نے خال خال اس اصول کی پیروی کی ہے تو اس میں ان کو معذور سمجھنا چاہیے (ع)

موج کوثر

از جناب محمد اکرام صاحب ایم۔ اے تقطیع متوسط ضخامت ۴۶۴ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت درج نہیں۔ پتہ:۔ اردو بک سٹال۔ بیرون لاہوری دروازہ لاہور

جناب محمد اکرام صاحب۔ اردو زبان کے ان سنجیدہ ارباب قلم میں ہیں جو جو کچھ لکھتے ہیں کافی مطالعہ اور غور و فکر کے بعد متانت و سنجیدگی کے ساتھ لکھتے ہیں موصوف چند سال سے ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی اور علمی تاریخ قلمبند کر رہے ہیں اس سلسلہ کی دو کتابیں "چشمۂ کوثر" اور "رودِ کوثر" وہ پہلے شائع کر چکے ہیں جن میں انیسویں صدی سے پہلے تک کی تاریخ قلمبند کی تھی، اب انھوں نے تیسری کتاب شائع کی ہے جو اس وقت زیرِ تبصرہ ہے اس میں انیسویں صدی کے آغاز سے لے کر زمانۂ حال تک کی تاریخ لکھی ہے، چنانچہ حضرت سید احمد صاحب بریلوی اور آپ کے رفقاء کے کارنامے۔ علی گڑھ۔ دیوبند ندوہ۔ جامعہ ان سب اداروں اور ان اداروں کی نامور شخصیتوں کے حالات و واقعات تنقیدی پیرایہ میں لکھے ہیں جہاں تک معلومات ان کی ترتیب اور ان پر ایک خاص زاویہ نگاہ سے تبصرہ و تنقید کا تعلق ہے اس کتاب کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ ظاہر ہے کہ لائق مولف نے

جس دور کی تاریخ لکھی ہے وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی زندگی کا ایک نہایت پرآشوب دور تھا اس دور میں مسلمانوں کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جو تیز و تند بادہائے مخالف کے جھونکوں سے متاثر نہ ہوا اس بنا پر ان کی اصلاح کے لئے متعدد ادارے پیدا ہوئے اور انھوں نے مختلف عظیم المرتبت شخصیتوں کی قیادت میں اپنے اپنے مخصوص نقطہ نظر کے ماتحت کام کرنے شروع کئے اگرچہ بنیادی طور پر مقصد سب کا ایک تھا لیکن کام چونکہ مختلف نوعیت کے تھے اور ان کے طریقہائے کار بھی الگ الگ تھے اور پھر ان کارکنوں کے مزاج کی ساخت اور طبیعت کی افتاد بھی جدا جدا تھی اس بنا پر قومی نشاۃ ثانیہ کے اسٹیج پر ان میں باہمی ٹکراؤ اور تصادم ناگزیر تھا۔ چنانچہ وہ ہوا اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج برصغیر ہند و پاک کے مسلمان مذہبی اور علمی اور ذہنی و دماغی حیثیت سے جس سطح پر ہیں اس کی تعمیر و تاسیس میں کسی ایک کا نہیں بلکہ سب کا ہی حصہ ہے۔ اس بنا پر اس دور کی تاریخ قلمبند کرنا اور ان تمام اداروں اور ان اداروں کی نامور شخصیتوں کی نفسیاتی تحلیل کرکے مشترک اور متضاد عناصر کی قدریں مقرر کرنا ایک وادی پرخار میں قدم رکھنے سے کم نہیں ہے ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ محمد اکرام صاحب نے حتی الوسع کانٹوں سے اپنا دامن بچا کر گذر جانے کی کوشش کی ہے اور نکتہ چینی کے ساتھ اعتراف خدمات کرکے غیر جانبداری کی لاج رکھنی چاہی ہے لیکن افسوس ہے کہ پھر بھی وہ بالکل صاف نہیں نکل سکے ہیں علی الخصوص ندوۃ العلماء اور اس کے اکابر و زعماء پر ان کی تنقید اور اس کا لہجہ بجائے علمی کے ذاتی و شخصی تنقید کا رنگ اختیار کر گیا ہے جس کو کتاب کے موضوع کی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے بآسانی نظر انداز کیا جا سکتا تھا یوں تو اس دور کی تاریخ کا ہر ادارہ اور اس ادارہ کی ہر ممتاز شخصیت اس قابل ہے کہ اس پر ایک مستقل کتاب لکھی جائے اور اس بنا پر یہ کتاب مجموعی حیثیت سے تشنہ اور نامکمل ہے تاہم جہاں تک دیوبند کے تذکرہ کا تعلق ہے تو وہ بہت ہی مختصر ہے پھر یہ امر بھی تعجب انگیز ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی اصلاح کا تذکرہ اور اس میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی اور مولانا محمد علی صاحب مونگیری کا ذکر تک نہ ہو، ہمیں امید ہے کہ لائق مولف کتاب کے آئندہ اڈیشن میں ان باتوں کا خیال رکھیں گے تاکہ کتاب زیادہ جامع اور ایک خالص علمی کارنامہ ہو۔ (س)

برہان

جلد بست و نہم — شمارہ نمبر ۳

ستمبر ۵۲ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

یوپی میں اردو کے دستخطوں کی مہم جس زور شور سے اٹھی۔ اور یہ تحریک جس جوش وخروش کے ساتھ چلی تھی اس کو دیکھکر توقع ہوتی تھی کہ معینہ تاریخ سے بہت پہلے ہی یہ کام ختم ہوجائیگا۔ لیکن حال کی اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس کام نے اپنی آدھی منزل بھی طے نہیں کی ہے۔ اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو آپ خود سمجھ لیجئے کہ جس قضیہ کی مبتدا یہ ہو اس کی خبر کیا ہو گی۔ ایک طرف اردو کے حامیوں کی سست گامی کا حال یہ ہے اور دوسری جانب اسکولوں میں ہندی کی تیز رفتاری کا یہ عالم ہے کہ ابھی پچھلے دنوں راقم الحروف کو تین سال کے بعد اپنے وطن میں دو ڈھائی مہینہ قیام کرنے کا اتفاق ہوا تو یہ دیکھکر سخت حیرت ہوئی کہ خود میرے خاندان کے بچے جو اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں ان کا اوڑھنا بچھونا ہندی بن گئی ہے۔ ہندی ہی پڑھتے ہیں۔ اسی زبان میں لکھتے ہیں اور اردو کی معمولی شد بد بھی ان کو نہیں ہے۔

ہندی میں مہارت بہم پہونچانا اور اس میں اعلیٰ قابلیت پیدا کرنا کوئی بری بات نہیں۔ بلکہ اس کے ریاستی زبان ہو جانے کے بعد نہایت ضروری ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہی بچے جب اردو سے بیگانہ ہوں گے تو آئندہ ان سے تو اس کی توقع ہرگز نہیں ہوسکتی کہ یہ اردو کی حفاظت و بقا یا اس کو ترقی دینے کا بندوبست کریں اور اس سے کوئی دلچسپی لیں۔ بس اب رہ گئے صرف ہم اور آپ یعنی بقیۃ السلف۔ جنہوں نے اردو زبان کے ماحول اور فضا میں تربیت پائی ہے اور اس لئے ان کو اس زبان کی عظمت کا احساس ہے اور اس کے ساتھ دلچسپی وشفقت بھی ہے لیکن جب خود ہمارا حال یہ ہے کہ اسکولوں میں نہ سہی۔ پرائیویٹ طور پر بھی اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کا بندوبست نہیں کرتے۔ اور جب کہ ہم نے بھی مقصد صرف یہ ہی بنالیا ہے کہ ملک کے عام نظامِ تعلیم کے مطابق ہمارے بچے تعلیم پاجائیں اور بس!

تو پھر ظاہر ہے کہ اردو کے لئے یہ ساری ہنگامہ آرائی اور اس کے غم میں یہ توجہ گری واشک فشانی آخر کیا فائدہ پہونچا سکتی ہے۔ زبانیں صرف حکومت کے سہارے اور اسکولوں اور کالجوں کے نصابِ تعلیم میں شامل ہونے کے بل بوتہ پر ہی زندہ نہیں رہتی ہیں۔ اہلِ زبان کا عزم اور ان کی ہمت واستقلال اس زبان کی بقا کی سب سے بڑی ضمانت ہوتا ہے۔ لیکن یہاں تو ہماری پست ہمتی اور شکست خوردگی کا عالم یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں اور بچیوں کے لئے پرائیویٹ طور پر یا کسی ایک محلہ دار اسکیم کے ماتحت اردو کی تعلیم کا بھی انتظام نہیں کر سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ اردو کی کتابیں روز بروز بازار سے غائب ہوتی جا رہی ہیں۔ ایک کتاب کا اڈیشن ختم ہو جاتا ہے تو ناشر خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور پھر اس کو دوسرا اڈیشن چھاپنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ مشاہیر شعرائے اردو کے دواوین بلند پایہ مصنفین کی قلمی یادگاریں۔ یہ سب ہمارا بیش قیمت قومی اور ثقافتی سرمایہ ہیں۔ اگر یہ ہی کبریتِ احمر بن گیا تو آئندہ نسلوں کے لئے غالب اور ذوق۔ مومن اور داغ حالی اور اقبال وغیرہم ایسے سینکڑوں اکابرِ علم وفن کے نام ایسے ہی متبرک ہو جائیں گے جیسے کہ آج ہمارے لئے امیر خسرو، سعدی وحافظ۔ اور فیضی وعرفی اور نظیری وآملی کے ہیں۔"

جس زبان کو آپ عوامی زبان کہتے ہیں یعنی آسان ہندی۔ یا آسان اردو۔ یا ہندوستانی، ہاں بیشک یہ عام بول چال کی زبان ہے اور وہ جلد مٹنے والی نہیں! لیکن سوال یہ ہے کہ آپ جس زبان کو یوپی کی ایک علاقائی زبان منوانا چاہتے ہیں یا جس کے ادبی سرمایہ پر آپ کو ناز وافتخار ہے وہ ہندوستانی زبان ہے یا اردو! اگر اردو ہے تو آپ یقین کیجئے کہ یہ صرف ہندوستانی کے عوامی زبان ہونے کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کے لئے تو آپ کو باقاعدہ اپنے بچوں اور بچیوں کو اس کی تعلیم دینی ہوگی! اور اس میں نشر واشاعت کا سامان کرنا ہوگا!!

بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ ہماری قوم سے تعمیری کام کرنے کا ذوق بالکل مفقود ہو گیا ہے ہم صرف نعرہ بازی اور ہنگامہ آرائی کے اور اپنے اوپر بھروسہ کرنے کے بجائے دوسروں سے درخواستیں کرنے اور ان کی شکائتیں کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ تمام اسکولوں اور

کالجوں کے دروازے اردو زبان پر بند کر دئیے گئے ہیں تو اب سوال یہ ہے کہ کیا آپ اس صورت حال پر قائم ہو کر بیٹھ جائیں گے، آخر اسکولوں میں قرآن مجید بھی تو نہیں پڑھایا جاتا۔ پھر آپ مکتب میں یا گھروں پر بچوں کے لئے قرآن مجید کی تعلیم کا انتظام کرتے ہیں یا نہیں، پس کیا اسی طرح آپ یہ نہیں کر سکتے کہ محلہ محلہ اردو کا ایک مدرسہ شبینہ کھول دیں اور معقول تنخواہ پر اس طرح کے مدارس کے لئے آپ ایسے اساتذہ کی خدمات حاصل کریں جن کو واقعی اردو زبان کے ساتھ شغف و گرویدگی ہو اور جو بچوں کے دلوں میں اس زبان کی محبت اور عظمت چند روز میں ہی پیدا کر دیں! اسکولوں اور کالجوں میں باقاعدہ (ریگولر) کلاسوں کے علاوہ ایک دو کلاسیں بے قاعدہ بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً یو۔ ٹی۔ سی۔ سوشل سروس۔ مڈیکل فرسٹ ایڈ۔ وغیرہ! تو اگر طالب علم ان کلاسوں کے لئے وقت نکال سکتے ہیں اور ان کی وجہ سے ان کی اصل تعلیم کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا تو روزانہ یا کم از کم ہفتہ میں پانچ دن ایک گھنٹہ یومیہ کے حساب سے اردو کی تعلیم پر وقت صرف کرنا ان کی اصلی تعلیم کو کس طرح نقصان پہونچا سکتا ہے!

حالات جو کچھ ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں۔ لوگوں کے جو جذبات و خیالات ہیں اور جو ذہنیتیں ہیں اور جس طرح آجکل سرکاری احکام پر عمل درآمد ہوتا ہے وہ بھی سب آپ کو معلوم ہے۔ پھر ذرا سوچیئے کہ ان حالات میں محض شکوہ شکایت کرتے رہنا۔ محضرنامے بھیجنا۔ داد فریاد کرنا۔ داویلا مچانا کیا اثر پیدا کر سکتا ہے۔ اب وقت ہے کہ آپ خود خدا پر توکل کر کے اپنے بل بوتہ پر زندگی بسر کرنے کی خو پیدا کریں اور جس کام کو اپنے لئے ضروری اور مفید سمجھتے ہیں اس کا انتظام خود کریں۔ کوئی قوم محض گداگری کے ذریعہ اپنی تعمیری مشکلات کو حل نہیں کر سکتی ہے ——

والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی وفات پر جن بزرگوں اور دوستوں نے تعزیتی خطوط ارسال کئے تھے۔ میں فرداً فرداً ہر ایک کو اس کا جواب لکھ چکا ہوں۔ تاہم برہان کے ذریعہ ان سب حضرات کی دلی ہمدردی و غمگساری کا یکجائی طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ میں ان کی محبت و خلوص کا بدلہ دینے سے عاجز ہوں اللہ تعالیٰ ان سب کو مجھ گنہگار کی طرف سے انکے اس خلوص کا اجر جزیل عطا فرمائے آمین۔ ساتھ ہی ان دوستوں سے معذرت خواہ ہوں جنہوں نے بربنائے تعلق قطعات تاریخ وفات لکھکر بھیجے۔ مگر میں برہان میں انکی اشاعت پسند نہیں کرتا۔

اِسلام کا نظام عفت و عصمت

از

(جناب مولانا محمد ظفیر الدین صاحب دار العلوم معینیہ بنخم)

"اس عنوان سے ایک باب چار قسطوں میں آپ ملاحظہ فرما چکے، جس کی آخری قسط جون ۵۲ء میں تمام ہوئی تھی آج ناظرین کرام کی خدمت میں اس کا دوسرا باب پیش کیا جا رہا ہے، دعا ہے اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو مفید بنائیں، یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ پیش کیا گیا یا اس وقت پیش کیا جا رہا ہے، یہ گذشتہ جاڑے کی راتوں میں سرسری طور پر لکھا گیا تھا، انشاء اللہ اگر زندگی نے وفا کی تو آئندہ موسم سرما میں اس موضوع پر جو خامی اور کمی رہ گئی ہے اس کی تکمیل کی سعی کی جائے گی۔ اپنی صحت کی نامساعدت کی وجہ سے گرمی میں کوئی کام اس سلسلہ کا نہیں کر پایا۔ واللہ الموفق ۔ظفیر صدیقی)

عفت و عصمت کے تحفظ کے لئے اسلام نے جو قوانین و اصول مرتب کئے ہیں، ان کا ایک حصہ آپ پڑھ چکے اب بتانا ہے کہ نکاح کے بعد بھی اسلام نے کچھ ضروری ہدایتیں اور ضوابط مقرر کئے ہیں جن کا لحاظ اور پاس انسانی زندگی کے لئے لازمی ہے کیونکہ خلقت انسانی میں شہوت کی جو قوت رکھی گئی ہے، اس میں کچھ ایسی بربریت و درندگی ہے جو موقع پاکر انسان کو معاف نہیں کرتی، بلکہ ہلاکت میں ڈالنے کے درپے ہو جاتی ہے، پھر شیطان جس نے بنی آدم کی عداوت پر قسم کھا رکھی ہے، وہ الگ تاک جھانک میں رہتا ہے، اور راستہ پاکر جذبات کو غلط طور پر ابھارتا ہے، جس سے بسا اوقات انسان ہدایت کی شاہراہ سے بھٹک کر ضلالت کی وادی میں گم ہو جاتا ہے اس لئے اسلام نے نکاح کے بعد یا پہلے جو لوازمات عفت ہیں ان کی صرف نشان دہی ہی نہیں کی ہے بلکہ ان پر عمل پیرا ہو کر ان تمام شیطانی راستوں سے محفوظ رہنے کی تاکید بھی کی ہے جن سے غفلت کے موقع پر شیطانی حملے ممکن ہیں۔

بیباک نگاہ اور اس کے متعلق ہدایات	ان میں بدنظری کو ام الخبائث کی حیثیت حاصل ہے، کہ یہ تمام فواحش کی بنیاد ہے، لہذا اسلام نے اس سوراخ کو پہلے بند کیا ہے، اور "نظر" کو آنکھوں کا زنا قرار دیا، اور یہ نگاہ

کا تیر مشہور ہے، اور تجربہ کی دنیا میں مسلّم بھی، عشق و محبت کی تعریف کرنے والوں کی تعریف ہے کہ محبت ایک نادیدہ شئی ہے جو آنکھوں کے راستہ دل میں اتر پڑتی ہے، بعض علماء نے لکھا ہے کہ نگاہیں شہوت کے قاصد اور اس کے پیامبر ہیں، شعراء نے اس مسئلہ پر سب سے زیادہ روشنی ڈالی ہے، اور بتایا ہے کہ کتنی نگاہیں ہیں جو تیر کی طرح دل میں پیوست ہو جاتی ہیں، اسلام کے پہلے کے شعراء نے بھی اقرار کیا ہے کہ دل کے زخمی کرنے میں آنکھوں کا بڑا قصور ہے اور اسلام کے بعد کے شعراء نے بھی بتایا ہے کہ نگاہوں سے دل چھلنی ہوتا ہے، پھر اس مسئلہ میں ہر مذہب و ملت کے شعراء متفق ہیں، کوئی اختلاف نہیں۔ نگاہ کی اسی تاثیر کے باعث اسلام جب آیا تو اس نے اعلان کیا۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا	ایمان والوں کو کہہ دیجئے کہ ذرا اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اور
فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ	اور اپنے ستر کو بچائے رکھیں، اس میں ان کے لئے
خَبِیْرٌۢ بِمَا یَصْنَعُوْنَ (نور-۴)	پاکیزگی ہے، اللہ تعالیٰ کو جو کچھ وہ کرتے ہیں اس کی خبر ہے

فتنہ کا چشمہ جہاں سے ابلتا تھا اور اخلاق اور سوسائٹی پر جہاں سے ضرب پڑتی تھی ان سوتوں اور سوراخوں ہی کو بند کر ڈالا اور حد تک اجازت دی اور اس کے بعد پہرہ بٹھا دیا، کہ کوئی شخص قصداً یا بغیر قصد ایسا کوئی کام نہ کرے جو برائی کا زینہ بن جائے، نگاہ جس کو سلف صالحین نے برید العشق (عشق کا پیامبر) سے تعبیر کیا ہے، اسلام نے اس پر قانون کی مہر لگا دی، اور اس کے نتیجہ اور فائدہ کو بتایا کہ اس سے شہوت کی جگہوں کی صیانت و حفاظت ہوگی نیز یہ چیز تزکیۂ قلوب میں بھی معاون ہوگی،

اوپر کی آیت میں جس چیز کا حکم فرمایا گیا ہے وہ ایک ایک مسلمان کے لئے لازمی ہے، نگاہ نیچی رکھنا فطرت اور حکمتِ الٰہی کے تقاضا کے مطابق ہے، اس لئے کہ عورتوں کی محبت اور دل میں ا[illegible] کی طرف خواہش فطرت کا تقاضا ہے، ارشاد ربانی ہے ۔

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ	مرغوب چیزوں کی محبت پر لوگ فریفتہ کئے گئے ہیں

النِّسَاءِ (آل عمران ۴) جیسے عورتوں پر،

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

ماترکت بعدی فتنۃ اضر علی الرجال من النساء متفق علیہ (مشکوٰۃ کتاب النکاح)

میں نے اپنے بعد عورتوں سے بڑھ کر اور کوئی فتنہ مردوں کے لئے ضرر رساں نہیں چھوڑا،

ایک موقع سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

فاتقوا الدنیا واتقوا النساء فان اول فتنۃ بنی اسرائیل کانت فی النساء رواہ مسلم (مشکوٰۃ کتاب النکاح)

دنیا اور عورتوں سے ڈرو کیونکہ بنی اسرائیل میں پہلا فتنہ جو پیدا ہوا وہ عورتوں میں تھا۔

اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کا لحاظ فرمایا، اور شہوت کی رعایت سے نکاح کی اجازت ہی نہیں دی بلکہ حکم فرمایا، اور پھر اس کے بعد انسانی طبیعت پر کنٹرول کیا، اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کے طریقے بیان کئے، حد سے بڑھتی ہوئی حرص جو حریص انسان کی طبعی خواہش ہے، اس پر پہرہ بٹھایا، اور کائنات انسانی کو فتنہ و فساد سے محفوظ کر دیا۔

عورتوں کو ہدایت | اگر اسلام نے صراحتاً مردوں کو عفت کی تعلیم دی، تو عورتوں کو بھی فراموش نہیں کیا، کیونکہ مرد اور عورت دونوں کا خمیر ایک ہی ہے، کم وبیش کا فرق ہے عورت کی فطرت بھی شہوت اور اس کے دواعی سے خالی نہیں، اس لئے رب العالمین نے فرمایا۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (نور ۴)

ایمان والیوں کو کہہ دے کہ ذرا اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور اپنی شہوت کی جگہوں کو تھامے رکھیں اور اپنی زیبائش نہ دکھلائیں مگر جو ان میں سے کھلی چیز ہے

ان آیتوں کا لب ولہجہ بتا رہا ہے کہ آنکھوں کی بیباکی اور ان کی آزادی شہوت میں انتشار اور شرمگاہ میں ابھار پیدا کرتی ہے، عقلی طور پر سنجیدگی سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ آنکھوں میں ایک ایسا پوشیدہ زہر ہے جو موقع پا کر انسانی دل و دماغ میں تیزی سے سرایت کرنے کی سعی پیہم کرتا ہے، اور جب سرایت کر جاتا

ہے تو دل ودماغ کو ماؤف کر ڈالتا ہے، چنانچہ آپ نے دیکھا اور سنا ہوگا کہ اجنبی مرد نے جب کسی اجنبی عورت کو زینت میں دیکھا اور بار بار دیکھا اس کی دبی دبائی چنگاری انگارہ میں تبدیل ہوگئی۔

شہوت کے معاملہ میں جو حال مردوں کا ہے، کم وبیش یہی حال عورتوں کا بھی ہے، بلکہ ان کی نگاہ تو اور بھی فتنے جگاتی ہے، جذبات میں عورتیں عموماً آگے ہوتی ہیں اور جلد متاثر ہونا تو ان کے لئے مستقل مرض ہے، واقعات شاہد ہیں کہ بات کی بات میں عورت بدلتی رہتی ہے اس لئے ان کو اپنی آنکھوں کی حفاظت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے ایسا نہ ہو کہ کسی خوبرو، تنومند جوان کی ادا بھا جائے اور ظاہر نہ سہی باطن ہی گندہ کر ڈالے، اور یہ بھی نہیں تو یہ ہو کہ دوسری طرف مرغ بسمل بن کر تڑپنے لگے، اور اس کو خبر بھی نہ ہو۔ چنانچہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خود عورت کے دل میں تو کوئی خطرہ نہیں گذرتا، مگر ان کی بے احتیاطی سے کسی مرد کا سکون دل جاتا رہتا ہے اور وہ مرد اپنی غرض کے سلسلہ میں اندھا بن جاتا ہے اور پھر سیکڑوں تدبیریں عمل میں لاتا ہے بیسیوں جال بچھاتا ہے، اور کبھی کبھی زبردستی کسی معصومہ کی عصمت دری کے در پے ہو جاتا ہے۔

"صدق جدید لکھنؤ" میں ایک لڑکی کا خط شائع ہوا ہے وہ لکھتی ہے۔

".. کہ اسکول جاتے میں پانچ چھ نوجوان مرا پیچھا کرتے ہیں" (۲۱ مارچ ۱۹۵۱ء)

نگاہ کی حفاظت کا حکم | اس آیت اور قرآن پاک کی دوسری آیتوں کو سامنے رکھ کر علماء کی ایک بڑی جماعت کہتی ہے کہ عورت کے لئے جائز نہیں ہے، کہ یہ کسی اجنبی مرد کو دیکھے، اس کا یہ دیکھنا شہوت سے ہو یا بغیر شہوت کے

عہ کالج، یونیورسٹی اور اسکول کے کچھ نوجوان کہتے ہیں کہ چونکہ ہمارے یہاں بے پردگی عام نہیں ہے اس لئے کبھی کبھی ایسی بات ہوتی ہے، پردہ یورپ کی طرح بالکل اٹھا دیا جائے تو پھر بدکاری ختم ہو جائے گی اور مخلوط سوسائٹی مردوں اور عورتوں کے احساس کو ماؤف کر ڈالے گی، مگر اپنا خیال اس کے بالکل برعکس ہے، دلیل میں صرف امریکہ کے صدر مسٹر ٹرومین کی میڈم کی وہ تقریر پیش کروں گا جو انھوں نے "اخلاقی پستی" کے عنوان پر کی تھی، فرماتی ہیں۔

"یہ لڑکیاں نہ بازاری ہیں اور نہ حسن فروش، بیندرہ بیس برس کی کمسن اور بھولی بھالی لڑکیاں ہیں، اکثر یونیورسٹی، کالج اور ہائی اسکول کی طالبات ہیں.... اس وقت حکومت امریکہ اور امریکن قوم کے سامنے نامعلوم باپ کے بچوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا اہم مسئلہ ہے، کنواری ماؤں کے ان بچوں کی تعداد گزشتہ سال "سوا لاکھ" سے زیادہ تھی، ان میں سے ایک لاکھ بچوں کی مائیں یونیورسٹی کی طالبات ہیں، نیز تربیت وتعلیم کے تحقیقاتی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں بیان کیا ہے کہ ان بچوں کے باپ کالج ہی کے ہونہار طلبہ ہیں..... اصل یہ ہے کہ امریکہ میں تمام خاندانوں نے اپنی لڑکیوں کو کامل آزادی دے رکھی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک نوجوان لڑکی جو اپنی گھریلو زندگی میں محبت وشفقت سے محروم رہتی ہے کالج میں قدم رکھتے ہی کسی طالب علم سے مل کر عشق ومحبت کے تجربہ ...

دونوں ہی صورتیں ناجائز ہیں، حدیث سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے چنانچہ حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ میں اور حضرت میمونہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تھی، ابن ام مکتومؓ نابینا کسی ضرورت سے خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے، ابن ام مکتومؓ کو دیکھ کر آپ نے ہم سے فرمایا، تم دونوں پردہ میں چلی جاؤ، ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رحمت عالم صلعم سے کہا، یارسول اللہ! کیوں یہ (ابن ام مکتوم) نابینا نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا

افعمیاوان انتما، الستما تبصرانه کیا تم دونوں بھی اندھی ہو، ان کو نہیں دیکھتیں

(مشکوۃ ص۲۶۹ عن ابی داؤد)

یہ واقعہ نزولِ حجاب کے بعد کا ہے، اس حدیث سے عورتوں کے متعلق کیا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی کسی مرد کو نہ دیکھیں "یحفظن فروجهن" کے متعلق سعید بن جبیرؓ کہتے ہیں کہ اس میں فواحش سے بچنے کا حکم ہے قتادہؒ اور سفیانؒ کہتے ہیں ان تمام چیزوں سے عورتوں کو حفاظت کا حکم ہے جو ان کے لئے حلال نہیں ہے[1]

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

"عورت کو شہوت کے ساتھ کسی طرف قصداً نظر کرنا جائز نہیں، بجز زوج (شوہر) کے بلا شہوت نظر کرنے میں تفصیل ہے کہ عورت کا دوسری عورت کے بدن کو بجز ناف سے زانو تک دیکھنا درست ہے، اور مرد کے بدن کو ناف اور زانو کے درمیان تو بالاتفاق حرام ہے، اور اس کے ماسوا کا دیکھنا مختلف فیہ ہے، شافعیہ کے نزدیک حرام ہے، اور حنفیہ کے نزدیک بلا شہوت گو حرام نہیں، مگر خلافِ اولیٰ ہے، چنانچہ ابو داؤد و ترمذی و نسائی و بیہقی میں حدیث ہے کہ ابن ام مکتومؓ صحابی نابینا نے حضور کی خدمت میں آنا چاہا تو آپ نے ام سلمہؓ اور میمونہؓ سے فرمایا، پردہ میں ہو جاؤ، انھوں نے عرض کیا کہ وہ تو نابینا ہیں، ہم کو نہ دیکھیں گے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کیا تم بھی نابینا ہو، کیا تم ان کو نہ دیکھو گی؟ اور شرعی ضرورت سے اجازت ہے، اسی طرح بلا قصد نظر پڑنے سے جبکہ فوراً ہٹالی جائے، گناہ نہیں جب کہ اوپر بیان ہوا، یہ تفصیل ہے یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ کی، اور اس میں من تبعیضیہ کی یہی توجیہ ہے۔۔۔۔۔ کہ بعض جگہ اجازت ہے اور بعض جگہ نہیں"[2]

نگاہ کے فتنے | حافظ ابن القیمؒ تحریر فرماتے ہیں۔

[1] ابن کثیر ص۲۸۳ ج۳ ۱۲ [2] بیان القرآن جلد ہشتم ص۱۶

"نگاہ شہوت کی قاصد اور پیامبر ہوتی ہے اور نگاہ کی حفاظت دراصل شرمگاہ اور شہوت کی جگہ کی حفاظت ہے جس نے نظر کو آزاد کر دیا، اس نے اس کو ہلاکت میں ڈال دیا ...... اور نظر ہی ان تمام آفتوں کی بنیاد ہے، جن میں انسان مبتلا ہوتا ہے، کیونکہ نظر کھٹک پیدا کرتی ہے، پھر کھٹک فکر کو وجود بخشتی ہے، اور فکر شہوت کو ابھارتی ہے، شہوت ارادہ کو جنم دیتی ہے، ارادہ قوی ہو کر عزیمت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور عزیمت میں مزید پختگی ہو کر فعل واقع ہوتا ہے، جس سے اس منزل پر پہنچکر اس وقت کوئی چارۂ کار نہیں رہتا جب کوئی مانع حائل نہ ہو۔"[1]

اسی وجہ سے کہا گیا ہے

الصبر علی غض البصر ایسر علی الصبر علی الم بعدہ (الجواب الکافی صفحہ ۲۰۴)

آنکھ بند کرنا آسان ہے مگر بعد کی تکلیف پر صبر مشکل

کیونکہ نظر کا تیر اگر پیوست ہو گیا تو پھر اس سے حسرت، سوزشِ قلب، جگر کی ٹیسیں اور آہ وفغاں ہی پیدا ہوتی ہے، آدمی اس وقت بے قابو ہو جاتا ہے اور اس کے لئے یارائے ضبط باقی نہیں رہتا، اور یہ ایک مستقل عذابِ جان بن جاتا ہے

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس فتنہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے، کہ

النظرۃ سہم مسموم من سہام ابلیس (الجواب الکافی صفحہ ۲۰۵)

نظر ابلیس کے تیروں میں سے ایک زہر آلود تیر ہے

ایک لمبی حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا

العینان زناھما النظر والاذنان زناھما الاستماع واللسان زناھا الکلام والید زناھا البطش والرجل زناھا الخطا والقلب یھوی ویتمنی ویصدق ذالک الفرج او یکذبہ رواہ مسلم (مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر)

آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے، کانوں کا زنا سننا ہے، زبان کا زنا بات کرنا ہے، ہاتھ کا زنا پکڑنا ہے اور پیر کا زنا چلنا ہے اور دل وہ آرزو اور تمنا کرتا ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے۔

---

[1] الجواب الکافی صفحہ ۲۰۴

بعض سلف نے کہا ہے

النظر سہم سم الی القلب (ابن کثیر ج۳ ص۲۸۲) نگاہ ایک تیر ہے جو قلب میں زہر ڈال دیتی ہے۔

نظر کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اس کی حفاظت بہت ضروری ہے، ورنہ اس سے بڑے بڑے فتنے پیدا ہوتے ہیں، قوم اور ملک کا امن و امان خطرہ میں گھر جاتا ہے، اخلاق و اعمال کی مٹی پلید ہو جاتی ہے اور عفت و عصمت دم توڑ دیتی ہے

پست نگاہی کی تاکید: یہی وجہ ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے غض بصر کی تاکید فرمائی ہے، اور مختلف پہلوؤں سے اس مسئلہ کو دل نشین فرمایا ہے، حضرت علیؓ سے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

یا علی لا تتبع النظرۃ النظرۃ فان لک الاولی ولیست لک الاخرۃ (مشکوۃ ص۲۶۹) اے علی! ایک بار نظر پڑ جانے کے بعد پھر دوبارہ نہ دیکھو کیونکہ تمہارے لئے صرف پہلی نظر معاف ہے، دوسری نہیں،

پہلی نظر جو بغیر قصد پڑتی ہے، اس میں انسان بڑی حد تک بے بس ہوتا ہے، اس لئے یہ معاف ہے مگر پھر دوبارہ نگاہ نہیں ڈالی جاسکتی، یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ پہلی نظر ڈالنے کی اجازت ہے، حضرت جریر بن عبد اللہ البجلی کہتے ہیں کہ میں نے رحمت عالم صلعم سے پوچھا کہ جو نظر دفعتاً پڑ جاتی ہے اس کے متعلق کیا ارشاد ہے، آپ نے مجھ سے فرمایا کہ میں اپنی نگاہ پھیر لوں،

فامرنی اصرف بصری (ابن کثیر و مشکوۃ باب النظر الی المخطوبہ) مجھے حکم فرمایا کہ میں اپنی نگاہ پھیر لوں

اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فرمایا

اطرق بصرک (ابن کثیر) تو اپنی نگاہ جھکالے،

نگاہ پھیرنا مختلف طور پر ہوتا ہے، مقصد یہ ہے کہ کسی طرح اپنے آپ کو اس فتنہ سے جو سامنے ہے بچالیا جائے نظر پھیر لی جائے یا نیچی کر لی جائے یا اور کسی دوسری چیز پر نگاہ جما دے تاکہ نظر اس فتنہ سے محفوظ ہو جائے، ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے فرمایا

غضوا ابصارکم واحفظوا فروجکم (الجواب الکافی ص۲۰۳) اپنی نگاہوں کو پست کرو اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرو

راستہ پر مجلس جما کر بیٹھنے سے اسی وجہ سے منع کیا گیا ہے کہ وہ عام گذرگاہ ہے، ہر طرح کے آدمی گذرتے ہیں نظر بے باک ہوتی ہے، ایسا نہ ہو کہ کسی پر نظر پڑ جائے اور وہ برائی کا باعث بن جائے، صحابۂ کرام سے ایک دفعہ رحمت عالم صلعم نے فرمایا کہ راستوں پر بیٹھنے سے پرہیز کرو، صحابۂ کرام نے اپنی مجبوری پیش کی اور بتایا کہ اس سے کبھی چارۂ کار نہیں ہوتا، یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ تم کو جب ایسی مجبوری ہی ہو تو پھر راستہ کا حق ادا کرو، صحابۂ کرام نے پوچھا کہ راستہ کا کیا حق ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

غض البصر وکف الاذیٰ ورد السلام	نگاہ نیچی رکھنا، اذیت کا رد کنا، سلام کا جواب دینا اور بھلی بات
والامر بالمعروف والنھی عن المنکر	کا حکم دینا، بری بات سے منع کرنا۔

(ابن کثیر ص ۲۸۲/۳ و مشکوۃ باب)

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اکفلوا لی ستا اکفل لکم الجنۃ اذا حدث	تم چھ چیزوں کی کفالت کرو میں تمہارے لئے جنت کا کفیل
احدکم فلا یکذب واذا اؤتمن فلا	بنتا ہوں، جب کسی سے بات بیان کرو تو جھوٹ نہ بولو۔
یخن واذا وعد فلا تخلف وغضوا	جب تمہارے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت نہ کرو اور
ابصارکم وکفوا ایدیکم واحفظوا فروجکم	وعدہ خلافی نہ کرو اور اپنی نگاہوں کو پست رکھو اپنے ہاتھوں
(ابن کثیر ص ۲۸۲/۳)	کو روکو اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرو

اس حدیث میں جن چھ چیزوں کی ذمہ داری پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنت کی کفالت فرما رہے ہیں ان میں غض بصر (نگاہ پست کرنا) اور حفظ فروج (شہوت کی جگہ کی حفاظت) بھی ہے اس سے نظر کی اہمیت بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے، مسند احمد میں ایک روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ما من مسلم ینظر الی محاسن المرأۃ	کوئی مسلمان جب پہلی مرتبہ کسی عورت کی خوبصورتی دیکھے
اول مرۃ ثم یغض بصرہ الا احدث اللہ	پھر وہ اپنی نگاہ پست کرلے، تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے
لہ عبادۃ یجد حلاوتھا (مشکوۃ ص ۲۷)	اس کی عبادت میں شیرینی پیدا کرتا ہے۔

طبرانی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لتغضن ابصارکم ولتحفظن فروجکم — تم ضرور اپنی نگاہیں پست رکھو اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرو

(ابن کثیر صفحہ ۲۸۲/۳)

نگاہ پست رکھنے کے فائدے — ایک دفعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابلیس کے زہر میں بجھائے ہوئے تیروں میں سے نظر بھی ایک تیر ہے جو شخص اللہ تعالیٰ کے خوف سے اس کی حفاظت کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو ایمان کی شیرینی میں بدل دے گا، جس کی لذت وہ اپنے قلب میں پائے گا۔[1]

صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شہوت کی جگہوں سے بچنے کا عہد کرے اس کے لئے جنت کی بشارت ہے۔

من یکفل لی مابین لحییہ ومابین رجلیہ اکفل لہ الجنۃ (ابن کثیر صفحہ ۲۸۲/۳) — جو شخص اس چیز کا کفیل بن جائے جو اس کی ڈاڑھیوں اور پاؤں کے درمیان ہے تو میں اس کے لئے جنت کا کفیل بنتا ہوں۔

ابن کثیر نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن تمام آنکھیں رو رہی ہوں گی مگر ان میں کچھ آنکھیں خوش ہوں گی ایک وہ آنکھ جس کو محارم اللہ سے محفوظ رکھا گیا ہے اور دوسری وہ آنکھ جس نے اللہ کے راستہ میں جاگنے کی صعوبت برداشت کی ہے اور تیسری وہ آنکھ جس نے خشیت الٰہی سے آنسو بہایا ہے۔[2]

اس ساری تفصیل کے بعد آسانی سے یہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ رب العالمین نے حفظ ما تقدم کے طور پر جن بہت سی باتوں کا حکم دیا ہے ان میں نگاہ بھی ہے، اور شہوت کی جگہ سے مکمل اجتناب بھی، اور مقصد یہ ہے کہ عفت وعصمت جو انسان کے لئے نیز پوری قوم اور ملک کے لئے ایک بیش قیمت ہوتی ہے اس کی حفاظت کے تمام جائز طریقے برتنا ضروری اور انسانی فریضہ ہے، تاکہ انسانی سوسائٹی فتنہ وفساد کی آماجگاہ نہ بن سکے، اور ملک اور شہر کا امن وامان خطرہ میں نہ گھرے،

اس سلسلہ میں عورتوں کو خصوصی خطاب بھی کیا گیا ہے کیونکہ صیغہ مذکر میں اصولی طور پر عورتیں بھی

---

[1] ابن کثیر صفحہ ۲۸۲/۳ [2] ایضاً

مخاطب تھیں، مگر بہ صیغۂ مؤنث لاکر ان کو مزید تاکید شدید کی گئی ہے خصوصی خطاب کی وجہ ظاہر ہے کہ ان کے متعلق خود قرآن نے کہا

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ (آل عمران - ۲)
مرغوب چیزوں کی محبت نے لوگوں کو فریفتہ کیا ہے جیسے عورتیں۔

جاہلی بے پردگی سے ممانعت | اور یہی وجہ ہے کہ عورتیں حدود و قیود میں گھری نظر آتی ہیں، شریعتِ مطہرہ نے ان پر ہر جگہ پہرہ لگا دیا ہے اور ان تمام خطرات کی حفاظت کی ہے جو ان کی ذات سے وابستہ ہیں، رات دن کے تجربات ہیں کہ عورتوں کی بے باکانہ چہل پہل مردوں کی جماعت میں ایک شورش پیدا کر دیتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ (احزاب - ۴)
اپنے گھروں میں قرار پکڑو اور جاہلیت کے وقت میں دکھانے کا جو دستور تھا اس طرح دکھلاتی نہ پھرو

اس آیت کا شانِ نزول گو خاص ہے مگر حکم عام ہے، اس آیت میں رب العزت نے عورتوں کو ہدایت فرمائی ہے، کہ وہ حدودِ شرعی کے اندر رہیں، جاہلیت کی رسم ترک کر ڈالیں۔

جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ عورتیں بن سنور کر مردوں میں بے باک گھومتی تھیں، زینت کی عجیب و غریب تدبیریں عمل میں لائی جاتی تھیں، دوپٹہ کو اس طرح ڈالتی تھیں کہ سینہ کا ابھار، گلے کے زیورات، کانوں کی بالیاں اور ان کی ھیئت فتنہ ساماں ہوتیں، مرد اس ادا کو دیکھ کر مسحور ہو جاتے، پھر جاہلیت میں عورتیں مٹکتی چلتی تھیں اور ان کا بانکپن اور ان کی ادائیں غضب ڈھاتی تھیں، اس لئے اسلام جب آیا تو اس نے اصلاح کی، عورتوں کو پہلے رسم و رواج سے روکا، اور پاک زندگی کا سلیقہ بتایا، پہلی بات یہ ہے کہ عورتیں گھر ہی میں رہیں اور ضرورتاً نکلیں تو جاہلیت کے طریقہ پر بن سنور کر نہ نکلیں۔

نزول حجاب | یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے، کہ اول اسلام میں پردہ کا حکم نازل نہیں ہوا، بلکہ ہجرت کے بعد پانچویں سال میں یہ حکم نازل ہوا، حضرت فاروق اعظمؓ کو اس کی بڑی فکر تھی، اور ان کی دلی خواہش تھی کہ پردہ کا حکم نازل ہو، انھوں نے مختلف طریقہ پر اپنی اس خواہش کا اظہار کیا، حضرت عمر بن الخطابؓ کی جن قلبی خواہشوں

کو رب العزت نے شرف قبولیت بخشتا، ان میں سے ایک یہ حجاب کا مسئلہ بھی ہے، صحیحین میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی۔

یا رسول اللہ ان نساءک یدخل علیھن البر والفاجر فلو حجبتھن فانزل اللہ تعالی آیۃ الحجاب (ابن کثیر ص۳۴۳) — آپ کی ازواج مطہرات کے پاس نیک و بد ہر طرح کے لوگ آتے رہتے ہیں کاش آپ ان کو پردہ میں رکھتے اس پر آیت حجاب اتری،

اور ان کی اسی درخواست کے بعد یہ آیت نازل ہوئی

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّآ اَنْ یُّؤْذَنَ لَکُمْ (احزاب ۔۔) — اے ایمان والو، تم نبی کے گھروں میں بغیر حکم نہ جاؤ،

عورتوں سے استفادہ پردہ کے پیچھے سے ہو

یہ واقعہ حضرت زینب بنت حجشؓ کی شادی کے موقع پر پیش آیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سے جب شادی ہوئی، تو لوگوں کو کھانے کی دعوت دی گئی، کھانے کے بعد تمام لوگوں کو چل دینا چاہیے تھا، مگر تین آدمی بات چیت کرتے رہ گئے اور اس موقع پر ان بیٹھنے والوں کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچی، خود تو آپ حیا اور شرم کی وجہ سے نہ فرما سکے مگر اللہ تعالیٰ نے اس موقع سے حجاب کے متعلق پوری ہدایت نازل فرمادی، عورتوں سے ضروری استفادہ کی راہ بھی بند نہ کی گئی بلکہ اس کا ایک معقول اور پاکیزہ تر راستہ باقی رکھا، ارشاد فرمایا گیا۔

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْھُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْھُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِکُمْ اَطْھَرُ لِقُلُوْبِکُمْ وَقُلُوْبِھِنَّ (احزاب ۔۔) — اور تم جب بیبیوں سے کوئی کام کی چیز مانگنے جاؤ، تو پردہ کے باہر سے مانگ لو، اس میں تمہارے اور ان کے دلوں کے لئے خوب ستھرائی ہے۔

یہ آیتیں گو شان نزول میں خاص ہیں، مگر حکم میں عام ہیں، تمام مسلمانوں کے لئے یہ حکم ہے، کہ وہ عورتوں سے جو کچھ لینا ہو، پردہ سے لیں، مواجہہ نہ ہونے پائے، تاکہ طرفین خود بھی محفوظ رہ سکیں اور دوسروں کو بھی غلط فہمی میں پڑنے نہ دیں،

عام طور پر مخلوط سوسائٹی مضر ہے

کوئی شبہ نہیں کہ عورت اور مرد کے میل جول کی حالت میں نفس انسانی کو بہکنے

کا موقع ملتا ہے اور شیطان کے لئے دوسروں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا غنیمت راستہ ہاتھ آجاتا ہے،
ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمیں عورتوں پر اعتماد نہیں ہے، اور مردوں کو ہم شیطان سمجھتے ہیں، بلکہ ہم عورت اور
مرد دونوں ہی کو قابلِ اعتماد اور لائقِ وثوق یقین کرتے ہیں، مگر ساتھ ہی ہم اس کے بھی قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ
نے انسان کی سرشت میں شہوت ودیعت کی ہے، مرد اور عورت کی اس میں کوئی تفریق نہیں، اور تاریخ
کی روشنی میں ہم جانتے ہیں کہ دشمنوں اور بدباطنوں نے پاکدامن عورت و مرد پر تہمت ڈالی ہے اور اس سے
پیدا شدہ شر وفتن بھی ہمیں معلوم ہیں، اس لئے عقل کی روشنی میں بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایسی تدبیر اختیار
کی جائے، جس سے وہ راستے بند ہو جائیں جن سے ہو کر فتنہ و فساد کے چشمے ابلتے رہتے ہیں۔

تاریخِ اخلاق یورپ نے مرد و عورت کے باہمی میل جول کے نتائج جو سامنے پیش کر دئے ہیں
اور خود ہمارے ملک میں کالج و یونیورسٹی کی ملی جلی زندگی نے جو تجربات فراہم کر دیئے ہیں، ان کو سامنے
رکھ کر عقلاً بھی پردہ کا شرعی حکم بغیر افراط و تفریط سراپا رحمت ہے۔ (باقی آئندہ)

غلامانِ اسلام

مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ

از

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی)

(سلسلہ کے لئے برہان بابتہ جون ۵۲ء دیکھئے)

جیسا کہ عرض کرتا چلا آرہا ہوں کہ ایسے اختلافات جنہیں صحیح معنوں میں ہم اصولی اختلافات کہہ سکتے ہیں زیادہ تر ان کی پیدائش میں سیاسی اختلافات کو ہم دخیل پاتے ہیں، یا پھر باہر سے مسلمانوں کے اندر چیزیں مختلف راہوں سے داخل ہوتی ہیں، خیالات پر وہ بھی اثر انداز ہوتیں، ابتداء اسلام میں مختلف دینی قوموں کے افراد مسلمان ہو ہو کر اسلامی دائرہ میں داخل ہو رہے تھے، اپنے ساتھ اپنے آبائی عواطف موروثی رجحانات کو بھی وہ لائے بجائے تصحیح کے یعنی دین کی قدرتی کتاب کا آخری اڈیشن قرار دے کر قرآن سے تصحیح کا کام لیتے۔ بعضوں نے تطبیق کا ارادہ کیا۔ چاہا کہ خاندانی روایات و احساسات میں تھوڑی بہت ترمیم کرکے ان کو قرآنی نصوص کے مطابق بنالیں۔ یا قرآنی تعلیمات کو کھینچ تان کر اپنے آبائی خیالات پر منطبق کرکے دونوں ہی سے اپنا تعلق باقی رکھیں۔ کرنے والے جان بوجھ کر ایسا کرتے تھے اس بدگمانی سے بچتے ہوئے زیادہ سے زیادہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ غیر شعوری طور پر اپنے آبائی مالوفات سے قطعی بے گانگی ان کے لئے آسان بھی نہ تھی۔ بہر حال دانستہ ہو، یا نادانستہ، مگر ہوا یہی کہ تاویل و تعبیر یا کھینچ تان کی اس نکوہیدہ و ناپسندیدہ کوشش نے مسلمانوں میں ایسے خیالات پیدا کر دئے جنہیں صحیح معنوں میں نہ تو اسلامی تعلیمات ہی کا صحیح نتیجہ قرار دیا جا سکتا تھا، اور سچ پوچھئے تو ان کے موروثی عقائد بھی، اپنے اصلی رنگ کو کھو کر نئے قالب میں جلوہ گر ہوتے۔ یہی قدر کا مسئلہ ہے۔ تاریخی شواہد کی روشنی میں آپ پڑھ چکے کہ قدر کا یہ نظریہ جو آج کل ہماری کتابوں میں مسلمانوں کے فرقہ معتزلہ کی طرف منسوب ہے یعنی اپنے اختیاری اعمال و افعال کے خالق خود بندے ہیں، خدا کی تخلیقی کارفرمائیوں

کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قدر کے اس عقیدے کی بنیاد تو ڈالی مسلمانوں میں ایک پارسی نو مسلم منسوبہ نامی نے جو ایرانی فوج کے اسواریوں سے تعلق رکھتا تھا بات وہی تھی کہ کائنات میں شر یا برائی کا پہلو جن چیزوں میں پایا جاتا ہے۔ ایرانی ذہنیت قرنہا قرن سے عادی تھی کہ ان کی آفرینش اور خلق سے حق تعالٰے کی ذات کو پاک قرار دے۔ ساری برائیوں کی پیدائش کا الزام اہرمن کے سر تھوپ دیا جاتا تھا۔ اس باب میں ایران کے باشندوں کی حسی نزاکت اس درجہ تک ترقی کر کے پہنچ چکی تھی کہ "اہرمن" کے لفظ لکھنے کی ضرورت ہوتی، تو بیان کیا جاتا ہے، کہ الٹ کر ~~اہرمن~~ کی شکل میں اسے لکھتے تھے[1]۔ مقصود اور مطلب یہی تھا کہ خدا جسے وہ اہرمزدا کہتے تھے اس کے دامن کو شرور اور برائیوں کے انتساب سے پاک رکھا جائے، گویا ان کے نزدیک خدا کی تقدیس و تسبیح کی شکل ہی یہ تھی کہ شرور اور برائیوں کو اس کے دائرۂ تخلیق سے خارج کر دیا جائے[2]۔

ظاہر ہے کہ خلق شر کے متعلق جن کی ذہنی نزاکتوں کا یہ حال ہو قبولِ اسلام کے بعد اگر بندوں کے برے اعمال و افعال کا خالق بجائے خدا کے بندوں ہی کو وہ ٹھہرانے لگے، اور برے اعمال و افعال کے بعد لازمی طور پر نیک اعمال کے خلق و آفرینش کو بھی بندوں ہی کی طرف منسوب کرنا ناگزیر تھا، یہی خلق افعال کا

---

[1] دیکھو اے مینول آف بائیبل ہسٹری بلکی ص۳۱۲ ترجمہ اردو، اس موقعہ پر بے ساختہ اپنے ایک مرحوم استاذ غفر اللہ لہ کا خیال آرہا ہے، مولینا نصیر احمد ان کا نام تھا وطن بھلت تھا ٹونک کے مدرسہ خلیلیہ کے صدر مدرس تھے منطق و اصول فقہ وغیرہ کی بعض ابتدائی کتابیں خاکسار نے ان سے پڑھی تھیں، ان کا دستور تھا کہ پوسٹ کارڈ یا لفافے پر پتہ بجائے سیدھے طریقے کے الٹ کر لکھتے، کارڈ اور لفافے کی تصویر نیچے پڑ جاتی، دریافت پر بولے کہ انگریزوں کی توہین و تحقیر کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ اس کے بادشاہ کی منڈی کی تصویر اوندھی کر دی جاتے ۱۲ [2] یہاں تفصیل کا تو موقعہ نہیں ہے لیکن خیر و شر کے الفاظ تو بیشک جدا جدا ہیں مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ الفاظ سے ہٹ کر دیکھنا چاہئے کہ واقعہ کی نوعیت کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی چیز ہوتی ہے جو استعمال سے کبھی خیر کبھی شر بن جاتی ہے آگ ہی کو لیجئے کھانا پکانے روشنی حاصل کرنے کا کام اس سے لیا جائے تو بہترین شے ہے لیکن اسی آگ سے گھر جلا دئے جائیں۔ کھیتیاں جھلسا دی جائیں تو شر بن جاتی ہے ایسی صورت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ ایران کے ارباب دانش نے ایک ہی مخلوق کے لئے دو خالق کے نظریہ کو بنا لیا کیسے استعمال کی صحت سے ہر بری شے بھلی بن جاتی ہے اور استعمالی غلطی سے بھلی چیز بھی بری بن جاتی ہے گویا اس لحاظ سے مشکل ہی سے ایسی کوئی چیز رہ جاتی ہے جو خدا کی مخلوق بننے کی مستحق ہو تفصیل کے لئے عربی کتاب الدین القیم کا مطالعہ کیا جائے ۱۲

مسئلہ ہے جس کی اصطلاحی تعبیر قدر کے لفظ سے کی جاتی ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ اختیاری اعمال و افعال کی جزا و سزا کے قانون کی تصحیح کے لئے ناگزیر ہے کہ بندوں کو بھی ان کے افعال کی پیدائش میں اس حد تک دخیل مانا جائے کہ فعل کی ذمہ داری کرنے والوں کے سر عاید ہو سکے۔

لیکن اسی کے ساتھ خالق قیوم کا اپنے کن فیکونی مخلوقات[1] سے جو تعلق ہوتا ہے، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے عقل اس کو بھی سوچ نہیں سکتی کہ بندے جو خدا کی کن فیکونی مخلوقات ہیں، اپنے اعمال و افعال کی تخلیق و آفرینش میں کلیتہً استقلالی اقتدار کے مالک ہیں، بلکہ نصوص کا اقتضاء بھی یہی ہے اور عقل بھی حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد اسی فیصلہ پر مجبور ہے کہ اپنے وجود میں، صفات میں، بندے جیسے ہر لمحہ خالق تعالیٰ کی تخلیقی کارفرمائیوں کے دست نگر ہیں، اسی طرح اعمال و افعال جو بندوں سے صادر ہوتے ہیں، ان کی تخلیق و آفرینش کا تعلق بھی براہ راست خالقِ کائنات ہی کے مسلسل تخلیقی فیض اور ارادے کے ساتھ وابستہ تسلیم کیا جائے،

الغرض بندوں کے اعمال و افعالِ اختیاری کی تخلیق میں خدا کے ساتھ کچھ نہ کچھ کسی نہ کسی حیثیت سے بندوں کو بھی دخل ہے، واقعہ کی اصل حقیقت یہی ہے اور اسلامی وثائق میں نصوص جو پائے جاتے ہیں، ان میں واقعہ کے دونوں پہلوؤں کی طرف اشارے کئے گئے ہیں، مسئلہ کو اسی اجمالی رنگ میں لوگ مانتے چلے آرہے تھے۔ لیکن یہی منسوبہ ایرانی پہلا آدمی تھا جس نے مسلمانوں میں بجائے اجمال کے چاہا کہ بندوں

---

[1] کن فیکونی مخلوقات کی اصطلاح کو سمجھنے کے لئے چاہیے کہ ہم میں ہر شخص خود اپنے اندر غور کرے، اپنے معلومات کو خیالی قوت سے ہم جو پیدا کرتے ہیں، سوچئے کہ اس وقت کیا ہوتا ہے، دلی کی جامع مسجد کو آپ جانتے ہیں پلنگ پر لیٹے لیٹے خیالی قوت سے اپنے اسی معلوم یعنی جامع مسجد کو اپنے سامنے آپ کھڑی کر لیتے ہیں۔ یہ آپ کی تخلیقی کارفرمائی ہے غور کیجئے کہ یہ خیالی جامع مسجد جو آپ کے ذہن کے سامنے کھڑی ہے صرف پیدا ہونے ہی میں آپ کے ارادے کی محتاج نہیں ہے بلکہ باقی رہنا اس کا یہ بھی آپ کی توجہ کے ساتھ وابستہ ہے، اسی کو کن فیکونی مخلوق کہتے ہیں کہ ارادے کے ساتھ آپ کا معلوم آپ کی مخلوق بن جاتا ہے اسی طرح زید جسے آپ جانتے ہیں اور آپ کا معلوم ہے خیالی قوت سے اسی معلوم کو اپنی مخلوق بنا کر دیکھئے وہ اپنی پیدائش میں بھی بقا میں بھی آپ کے تخلیقی ارادے کا محتاج نظر آئے گا، وہ بھی اس کا وجود بھی، اس کے صفات بھی اس کے افعال بھی سب کی حالت یہی نظر آئے گی آپ اٹھائیں گے تو اٹھے گا، بٹھا دیجئے گا تو بیٹھے گا، رو دیں گے فوراً ... ہنسائیں گے تو ہنسے گا یہی مطلب ہے کہ کن فیکونی مخلوق وہ ہے جو وجوداً صفاتاً و فعلاً اپنے خالق کی ... تخلیقی فیض ... اور ہر لمحہ محتاج ہوتی ہے ۱۲

کے اعمال و افعال کے تخلیقی عمل سے خدائی ارادے کو قطعاً بے تعلق ٹھہرا دیا جاتے۔ اسی کے مقابلہ میں ایک دوسرا فرقہ اٹھ کھڑا ہوا، جو جبرِ محض کے خیال کو مسلمانوں میں پھیلانے لگا، حاصل جس کا وہی ہے کہ بندہ مجبورِ محض ہے، نیک و بد اعمال جو بھی بندوں سے صادر ہوتے ہیں، ان کو براہِ راست خدا پیدا کرتا ہے، بندے کے ارادہ اور اختیار کو ان میں کسی قسم کا کوئی دخل نہیں ہے۔

کہتے ہیں کہ تابعین (یعنی صحابہ کے تعلیم یافتہ طبقہ) ہی کے زمانہ میں جبر کے اس نظریہ سے مسلمانوں کو سب سے پہلے ایک شخص جہم نامی نے آشنا کیا تھا۔ اسی کی طرف منسوب ہو کر جہمیہ نامی فرقہ پیدا ہوا۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں کو جہم اور جہمیہ کے چرچوں سے ہم معمور پاتے ہیں۔

مگر جہم کون تھا کن لوگوں سے متاثر ہوا جبر کے سوا اور بھی کس کس قسم کے اعتقادی اختلافات کی مسلمانوں میں اس کی وجہ سے بنیاد پڑی۔ یہی سننے کی بات ہے۔

واقعہ یہ ہے، کہ ہندوستانی تاجروں کا جو قافلہ بلخ ہوتا ہوا سمرقند جایا کرتا تھا، اس کو راستہ میں مشہور خراسانی شہر ترمذ کے قریب نوبذہ نامی مقام پر دریائے زامل کو عبور کرنا پڑتا تھا، جو جیحوں کا معاون دریا ہے، یہ نوبذہ ہمارے یاں کی تاریخوں میں قربِ مکانی کی وجہ سے معبر ترمذ کے نام سے موسوم تھا یعنی ترمذ کی گذر گاہ یا گھاٹ اس کو کہتے ہیں، اسی معبر ترمذ پر محصول وصول کرنے والوں کی ایک چوکی تھی، بنی امیہ کا زمانہ تھا ہشام[1] بن عبدالملک کی حکومت کے ایام میں معبر ترمذ (نوبذہ) کی چوکی کا داروغہ جہم بن صفوان نامی ایک آدمی تھا حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں لکھا ہے کہ

کان جهم من موالی بنی راسب

بنی راسب عربی قبیلہ کے غلاموں کے خاندان سے اس کا تعلق تھا۔

۱۴۲ ج ۲

---

[1] ہشام بن عبدالملک پہلی صدی ہجری کے اختتام اور دوسری کی ابتدا یعنی ۱۰۵ھ میں گدی نشین ہوا، امام احمد بن حنبل کے حوالہ سے حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے کہ ہشام بن عبدالملک کے زمانہ کے دواوین (سرکاری کاغذات) میں جہم کا ذکر میں نے پایا (فتح الباری ص ۲۹۵ ج ۲) اسی سے سمجھا جاتا ہے کہ ہشام کے عہدِ حکومت میں جہم سرکاری ملازم تھا کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی ملازمت کا سلسلہ کب سے شروع ہوا تھا بہرحال پہلی صدی ہجری میں اس کا وجود یقینی ہے ۱۲

اب خواہ غلاموں کے جس خاندان سے بھی جہم کا تعلق تھا، وہ آزاد ہو گیا ہو، یا آزاد نہ ہوا ہو، بہرحال تھا اس کا نسلی تعلق موالی ہی سے۔ اسی لئے صحیح طور پر یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ عربی نژاد تھا بھی یا نہیں کچھ بھی ہو لکھنے والوں نے اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ ابتدائی زندگی جہم کی کوفہ میں گذری تھی، فصیح عربی زبان بولتا تھا۔ فتح الباری میں حافظ نے نقل کیا ہے کہ

کان جھم من اھل الکوفہ وکان فصیحا صـ۲۹۵ جـ۱۳ — جہم کوفے کا رہنے والا تھا اور فصیح زبان بولتا تھا

لیکن اسی کے ساتھ ایک سے زیادہ مورخوں کا بیان یہ بھی ہے کہ

لم یکن لہ علم ولا مجالسۃ اھل العلم — فتح الباری صـ — نہ خود علم والا تھا، اور نہ اہل علم کی صحبت ہی اسے میسر آئی تھی۔

اسی لئے چنگی کی چوکی کی معمولی ملازمت ہی اس کو مل سکی تھی، حافظ ہی نے لکھا ہے

کان علی معابر ترمذ " — ترمذ کی گذر پر اس کا تقرر ہوا تھا

جہم کے یہ تو مختصر ذاتی حالات تھے۔

اب سنئے، ذہبی نے اپنی کتاب العلو میں یہ روایت نقل کی ہے کہ جس زمانہ میں جہم ترمذ کی اسی گذر والی چوکی میں مقیم تھا،

تکلم السمنیۃ فقالوا صف لنا ربک الذی تعبد صـ۱۳ کتاب العلو ضیعۃ المقصو — جہم کی سمنیہ فرقہ والوں سے بات چیت ہوئی، سمنیہ فرقہ والو نے پوچھا کہ جس خدا کو تو پوجتا ہے، اس کے صفات بیان کر

آپ نے سمجھا سمنیہ کے اس لفظ سے کیا مراد ہے؟ جاننے والے جانتے ہیں کہ ہندوستان کے مذہبی فرقوں کی تعبیر مسلمانوں کے علم کلام کی کتابوں میں سمنیہ کے لفظ سے کی جاتی ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سومنات کی طرف منسوب کر کے مسلمانوں نے ان لوگوں کو سمنیہ کہنا شروع کیا تھا واللہ اعلم بالصواب عرض کر چکا ہوں کہ بلخ کے مسافر سمرقند جانے کے لئے ترمذ کے اسی معبر نو بیدہ سے گذرتے تھے اور بلخ ہی وہ مقام تھا جو باب الہند سمجھا جاتا تھا، ہندوستان کے تجار خراسان جانے کے لئے پہلے بلخ

ہی پہنچتے تھے بلخ میں باب الہند کے نام سے اسی لئے ایک مستقل دروازہ تھا[1]،

بہر حال کہنا یہ ہے کہ ہندوستان کے تاجروں ہی کی طرف سے جہم بن صفوان کے دل میں پہلی دفعہ یہ سوال ڈالا گیا۔ اس وقت تک مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ قرآن پڑھتے تھے۔ اس میں خدا کے متعلق یہ بھی تھا کہ الرحمٰن عرش پر مستوی ہے۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی اسی قرآن ہی میں موجود ہے کہ وہی ہر شے کو محیط ہے وہی ہر ایک کے ساتھ ہے، وہ حبل الورید (گردن کی شہ رگ) سے بھی زیادہ قریب ہے، وہی اول ہے وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے وہی باطن ہے وہی آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے[2]۔ الغرض مسلمان عرش والی آیت کو بھی پڑھتے تھے اور دوسری آیتیں بھی برابر ان کی تلاوت میں گذرتی رہتی تھیں، ان کے ایمان میں دونوں ہی کی گنجائش تھی، حقیقت بھی ان ہی اجمالی تعبیروں میں پوشیدہ تھی کچھ یہ بھی کچھ وہ بھی، ٹھیک جیسے خلق افعال کے قصے میں کچھ یہ بھی صحیح کچھ وہ بھی صحیح یہی واقعیت کی صحیح ترجمانی ہے،

لیکن جہم جو نہ خود علم سے بہرہ رکھتا تھا اور نہ علماء کی صحبتوں سے مستفید ہونے کا موقع اس کو ملا تھا اچانک "ہندی فلسفہ" کی لاحاصل موشگافیوں سے اس کا دماغ دوچار ہوا، لکھا ہے، کہ سوال کے بعد

فدخل البیت لا یخرج مدۃ (فتح الباری ص ۲۹۵/۱۲) جہم کوٹھری میں گھس گیا اور زمانہ تک باہر نہ نکلا،

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے، کہ چالیس دن تک مبہوت رہا، جن میں نماز بھی اس نے نہ پڑھی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سمنیہ (ہندی تاجروں) نے صرف سوال ہی کر کے چھوڑ نہیں دیا تھا، بلکہ سوال و جواب کا سلسلہ بھی دونوں طرف سے جاری رہا،

امام بخاری نے اپنی کتاب "افعال العباد" میں جو روایت اسی سلسلہ میں درج کی ہے۔ اس کے ان الفاظ سے یعنی

---

[1] ان جغرافیائی معلومات کے لئے جی۔ لی۔ اسٹرینج کی کتاب "جغرافیہ خلافت مشرقی" کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ جس کا اردو ترجمہ دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ نے شائع کیا ہے ۱۲ [2] خلیفۃ اللہ یعنی انسان خود اپنے اندر دیکھتا ہے کہ اس کی روح بدن کے کسی حصہ سے غائب نہیں ہوتی ہر ایک پر شاہد و حاضر ہے تاہم قلب کے ساتھ اسی روح کا خاص استوائی تعلق ہے۔ ایسا تعلق کہ سارے بدنی نظام کا کاروبار اسی سے چل رہا ہے قلب سے روح کا استوائی تعلق جس وقت ختم ہو جاتا ہے بدن کے سارے اجزاء منتشر اور پراگندہ ہو جاتے ہیں ۱۲

فخاصمہ بعض السمنیۃ فشک فاقام اربعین یوما لا یصلی ص۶۹	جہم سے سمنیہ فرقہ کے بعض لوگوں نے مباحثہ کیا، بس جہم شک میں مبتلا ہو گیا اور چالیس دن ایسے گذارے جن میں نماز نہ پڑھی

ان سے تو صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ جہم اور سمنیہ میں کافی گفتگو ہوئی، اس کے بعد دیکھا گیا کہ لوگوں کے سامنے اپنے عقیدے کا اظہار حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ کے متعلق یہی جہم ان الفاظ میں کر رہا ہے کہ

ھو ھذا الھواء مع کل شئی و فی کل شئی ولا یخلو منہ شئی ج۱۳ ص۲۹۵ فتح الباری	وہ (خدا) یہی ہوا ہے ہر چیز کے ساتھ ہر چیز میں اور اس سے (خدا) سے کوئی چیز خالی نہیں،

اور یہی تھا اس غلط وحدت الوجود کا تخم اول جسے مسلمان صوفیوں کے بعض طبقات میں غیر معمولی ہر دلعزیزی حاصل ہوئی، مسئلہ کی ابتدائی تعبیر ایک سادہ دل، غیر علمی آدمی کی یہی ہو سکتی تھی، عرش پر الرحمٰن کا استواء جو قرآن کا منصوص مسئلہ تھا۔ اس کا مضحکہ اڑایا گیا اور اجمال جو مسئلہ کی روح تھی، جہم نے چاہا کہ مسلمانوں کو اس سے ہٹا دے، اس کے مقابلہ میں ایک طبقہ پیدا ہوا جو عرش والے نص کو اصل قرار دے کر قرآن ہی کے دوسرے بینات جن میں احاطہ معیت قرب اقربیت اولیت و آخریت ظاہریت و باطنیت کا صراحۃً ذکر کیا گیا ہے، ان سب کی اللہ کے بندوں نے تاویل کی۔ ابہام و اجمال کی قدر و قیمت گم ہو گئی دو مستقل فرقے عرشیوں اور فرشیوں کے پیدا ہو گئے،

ان عرشیوں اور فرشیوں کا قصہ اتنا دراز ہے جس کے لئے اس مختصر سے مضمون میں بھلا کیا گنجائش پیدا ہو سکتی ہے[۱]۔

---

[۱] امام بخاری نے اپنی کتاب خلق افعال العباد میں ایک روایت درج کی ہے جس میں راوی نے بیان کیا ہے کہ قرآن کی سورۂ طٰہٰ کی آیت الرحمٰن علی العرش استوٰی کا ذکر کرتے ہوئے جہم ایک دن بولا کہ کاش! میرے بس کی بات ہوتی تو اس آیت کو قرآن سے چھیل کر نکال دیتا۔ یہ بھی فرشیوں کی اس مجرمانہ آرزو کے مقابلہ میں منہ سے تو کہتے ہوئے نہیں سنا ہے لیکن عرشیوں کے دل میں بھی قرب احاطہ معیت اقربیت اولیت آخرت ظاہریت باطنیت والی آیتوں کے متعلق اسی قسم کے تمنائی بھبھاڑے اضطراراً اگر اٹھتے ہوں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے آخر عرش کے استواء والی ایک آیت کو اصل قرار دے کر قرآن کی بیسیوں آیتوں کے ساتھ تاویل بلکہ شاید تحریف تک کی جرأت کیا معمولی جرأت ہے ۱۲

میں تو اس وقت صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ سیاسی خرخشوں کے بعد جتنے اصولی اختلافات بھی مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔ اگر سراغ لگایا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان کا رشتہ اسلام سے نہیں بلکہ اسلامی دائرے کے بیرونی قصوں سے بھی رہا یہی جہم تھا، جس نے خدا کو ہوا ٹھہراتے ہوئے ہر چیز میں ہر چیز کے ساتھ بتاتے ہوئے دعویٰ کیا کہ کوئی چیز اس سے خالی نہیں، بایں ہمہ وہ اس تنزیہی عقیدے کا داعی تھا کہ

لا اصفه بوصف یجوز اطلاقه علی غیره ۲۹۲ فتح الباری ج ۱۲	ہر ایسی صفت جس کا انتساب غیر خدا کی طرف ہوتا ہو، ہم خدا کی طرف اس صفت کو منسوب نہیں کر سکتے

اسی لئے خدا کو حی (زندہ)، عالم (دانا)، مرید (ارادہ کرنے والا) کہنا یا وہ سنتا ہے، دیکھتا ہے، ان باتوں کے انتساب کو وہ ناجائز قرار دیتا تھا مشہور ہے کہ امام ابو حنیفہ نے جہم کی تنزیہی تعلیم کو سن کر کہا تھا کہ مآل اس کا یہی ہے کہ خدا گویا کچھ نہیں ہے، معدوم ہے، واقعہ یہاں بھی وہی تھا کہ لیس کمثلہ شئی کی بنیاد پر خدائی صفات کو مخلوقات کے صفات پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا لیکن قرآن میں خدا کی طرف جن صفات کا انتساب کیا گیا ہے ان کا کلیتہً انکار کیسے کیا جا سکتا ہے، پھر اس کے اسی تنزیہی ادعا نے کلام کے مسئلہ کو پیدا کیا کہتا تھا کہ کلام تو مخلوق کی صفت ہے خدا اس سے کیسے موصوف ہو سکتا ہے۔

بہر حال جہم پہلا آدمی تھا جس نے خدا کی صفت کلام کا انکار کر کے قرآن کو بجائے کلام اللہ کے مخلوق اللہ کہنے کا مشورہ مسلمانوں کو دیا۔ قرآن مخلوق ہے۔ یا غیر مخلوق ہے اس مسئلہ کے تاریخی تفصیلات سے لوگ عموماً واقف ہیں، ابتدائی بنیاد اس کی جہم ہی نے رکھی تھی[1]

ارباب صدق و صفا، اخلاص و وفا کو اس راہ میں جن شدائد و مصائب سے گذرنا پڑا، خصوصاً سراج الامت سیدنا حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے جس بے جگری اور پامردی کے ساتھ اس فتنہ کا مقابلہ کیا اسلامی تاریخ کے اوراق میں سنہرے حروف میں یہ داستان آج تک لکھی ہوئی ہے،

اسی طرح انسانی وجود کا شعوری نقطہ یا ذات کا احساس عربی میں جیسے "انا" فارسی میں "من" اور

---

[1] اس موقعہ پر یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں ہمارے وطن ہندوستان میں یہ مسئلہ مذہبی دائرے میں چھڑا ہوا تھا کہ وید کے شبد یعنی کلام قدیم ہے یا حادث، "میمانسا والے قدیم مانتے تھے نیائے والے حادث۔ دیکھو قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۱۱

ہم ہندوستان والے "میں" کے لفظ کا اطلاق جس پر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جیسے دنیا کی ہر چیز "شی" ہے "شی" کے نیچے ہمارے وجود کا یہ شعوری نقطہ بھی داخل ہے۔ ایسی صورت میں یہ بات کہ کسی شے سے خدا غائب نہیں ہے بلکہ قرآنی الفاظ میں

وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَهِیۡدٌ

اور اللہ ہر چیز پر شاہد (حاضر) ہے

کا کھلا ہوا اقتضا، یہی ہے کہ جب ہمارے وجود کا یہ شعوری نقطہ "انا" بھی شے ہے تو حق تعالیٰ کا "انا" کے لئے شہید و حاضر ہونا، قرآن ہی کی سکھائی ہوئی بات ہے، یہی منوایا گیا تھا اسی کو مسلمان مانتے چلے آتے تھے۔ ایک جاہل اَن پڑھ مسلمان بھی اپنے آپ کو مثلاً کسی مصیبت میں جب مبتلا پاتا ہے تو دل ہی دل میں وہ اسی "علی کل شی شہید" ہستی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اندر ہی اندر سوال و جواب کا سلسلہ بھی شروع کر دیتا ہے، یہ روزمرہ کے تجربہ کی بات ہے، ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کے شعور کو اپنے "انا" میں اگر وہ نہیں پاتا تو اضطراراً یہ حرکت اس سے کبھی سرزد نہ ہوتی بلکہ شاید اس احساس و شعور کے لئے تو مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں بظاہر آدمی کا یہ فطری احساس معلوم ہوتا ہے، بہرحال نظر کے سامنے نور ہو اور نور کا شعور نظر کو نہ ہو۔ شنوائی کی قوت تک آواز پہنچ جائے اور آواز کو شنوائی کی قوت محسوس نہ کرے جیسے یہ نہیں ہو سکتا، اسی طرح انسانی وجود کا وہ حصہ جو "مطلق شعور" اور شعور ہی شعور ہے، جب حق تعالیٰ اس سے غائب نہیں ہیں بلکہ اس شعوری نقطہ پر بھی وہ شاہد اور حاضر ہیں تو "انا" کے لئے ذاتِ حق کا شعور ظاہر ہے کہ ایک بدیہی بات ہے، لیکن اس سے نہ آدمی کا "انا" "حق" بن جاتا ہے اور نہ کسی طرح یہ سمجھنا درست ہو سکتا ہے کہ حق انا ہے، کیا بینائی نور ہے یا شنوائی کی قوت آواز ہے، بات بالکل واضح اور کھلی ہوئی تھی لیکن جانتے ہیں سب سے پہلے "انا الحق" کا نعرہ مسلمانوں میں جس نے لگایا۔ یعنی حسین بن منصور جو عوام میں منصور ہی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ اس منصوری دعوی کے مدعی حسین بن منصور کون تھے؟

الخطیب اپنی تاریخ بغداد میں اطلاع دیتے ہیں کہ

کان جدہ مجوسیا ؟ اسمہ محمی من — حسین بن منصور کا دادا مجوسی تھا نام اس کا "محمی" تھا

اہل بیضاء فارس ص ۱۱۲ ج ۸ — ایران کے شہر بیضا رکا رہنے والا تھا۔

اور صرف یہی نہیں خطیب نے حسین بن منصور کے صاحبزادے احمد نامی کے حوالہ سے ایک طویل روایت نقل کی ہے جس میں یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ ان کے والد حسین بن منصور نے

قصد الی الھند ص ۱۱۳ — ہندوستان کا ارادہ کیا

لکھا ہے کہ ہندوستان سے پھر ماوراء النہر ترکستان اور ماچین بھی گئے تھے یہ بھی اسی روایت میں ہے کہ

لما رجع کانوا یکاتبونہ من الھند ص ۱۱۳ — لوگ ہندوستان سے خط و کتابت بھی حسین بن منصور (اس کے والد) سے کرتے تھے

اور یہ روایت تو حسین بن منصور کے صاحبزادے کی ہے اسی زمانہ میں عباسی خلیفہ معتضد باللہ نے علی بن احمد الحاسب کو ہندوستان جانے کا حکم دیا تھا علی بن احمد کے الفاظ ہیں کہ

وجھنی المعتضد الی الھند لامور اتعرفھا لیقف علیھا ص ۱۲ ج ۸ — ہندوستان کے متعلق چند خاص امور کے دریافت کرنے کے لئے معتضد نے مجھے ہندروانہ کیا، خلیفہ خود ان امور سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

علی الحاسب کا بیان ہے کہ جس جہاز پر سوار ہو کر ہم ہندوستان کی طرف روانہ ہوتے، تو دیکھا کہ اسی جہاز میں ایک شخص حسین بن منصور بھی سوار ہے ملنے جلنے، بات چیت کرنے میں بہت اچھا آدمی تھا۔ جب ہم ہندوستان کے ساحل پر پہنچے اور قلیوں نے جہاز سے سامان اتارنا شروع کیا تب میں نے حسین سے پوچھا کہ

ایش جئت ھاھنا — تم کس ضرورت سے یہاں (ہندوستان) آئے ہو

جواب میں علی الحاسب کی روایت ہے کہ حسین نے کہا کہ میں ہندوستان کے لوگوں سے سحر سیکھنا چاہتا ہوں۔

شاید اسی جہاز میں المزین نامی آدمی بھی تھا اس نے بھی حسین کو ہندوستان کے ساحل پر اترتے

ـہ المزین جمع تھا یا حجاموں کو مزین اس زمانہ میں جو کہتے تھے، اس لئے المزین کے نام سے موسوم ہوا واللہ اعلم

دیکھا تھا اور اس سے بھی حسین نے کہا تھا کہ میں یہاں کے لوگوں سے سحر سیکھنا چاہتا ہوں۔ واللہ اعلم سحر کے لفظ سے مراد کیا تھی۔ بظاہر "یوگا" یا جوگ" جو اس ملک کے باشندوں کا خاص فن تھا اسی کا سیکھنا مقصود ہو۔ علی الحاسب کی روایت میں ہے کہ ساحل پر اترنے کے بعد میں نے دیکھا کہ دریا کے کنارے ایک کٹیا بنی ہوتی ہے اس میں ایک بوڑھا آدمی نظر آیا، حسین اسی بوڑھے کی کٹیا میں چلا گیا اور سحر کے متعلق باتیں دریافت کرنی شروع کیں۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی جوگی ہی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی خود حسین کی زندگی کے تفصیلات اس کتاب میں جو پاتے جاتے ہیں ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ حسین کی زندگی مدتوں جوگیوں ہی کی زندگی رہی

بہر حال اس وقت نہ مجھے حسین بن منصور کی شخصیت سے بحث ہے اور نہ ان کے مسئلہ "انا الحق" سے بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ایک سیدھی سادی بات کو مسلمانوں کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت جو حاصل ہو گئی عموماً یہ کیفیت بیرونی موثرات ہی نے پیدا کی ہے۔ ایسے مسائل جن میں مختلف پہلوؤں کی گنجائش ہو۔ اور کچھ یہ بھی صحیح اور وہ بھی صحیح ہو" بجائے کچھ" کے ایک ہی پہلو پر زور دینے کا آخری نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اصل حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور آدمی مغالطہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ درحقیقت یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے یہ نہیں ہے کہ قرآن کو نہیں مانا تھا، اور قرآن کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لاتے تھے لیکن انھوں نے پیغمبر قرآن کے ساتھ تعلیمی نسبت تزکیہ سے پہلے قائم کرلی۔ حالانکہ قرآن ہی میں کہہ دیا گیا تھا کہ قرآن کی پیغمبر آیتیں تلاوت کرتے ہیں پھر ماننے والوں کے اندر کی غلطیوں کو صاف کرتے ہیں تب تعلیم دیتے ہیں[2] مگر صفائی جن کی مکمل نہیں ہوئی تھی، انھوں نے قرآنی تعلیمات سے استفادہ کا ارادہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ پہلے سے ان کے پاس تھا کچھ تبدیلی اس میں ضرور ہوئی لیکن قرآنی تعلیمات اپنے صحیح خط و خال کے ساتھ ان میں جاگزیں نہ ہو سکے ان کا طریقہ عمل غیر فطری تھا جس کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا جو ہوا۔

---

[1] شنکر آچاریہ جو ساتویں صدی عیسوی کے بعد کے ہندوستانی مشہور رہنما مرہب، ان کا نظریہ تھا کہ آتما اور پرماتما میں دوئی نہیں ہے [1] قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب۔ [2] یَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ مشہور قرآنی آیت کا یہی اقتضاء ہے۔

زمینداری اور جاگیرداری کا تاریخی پس منظر

از

(جناب مولوی تقی الدین صاحب بہاری)

مولوی تقی الدین صاحب بہاری ایک نوجوان عالم دین ہیں اور مدرسہ امینیہ دہلی کے فاضل ہیں، موصوف کو شروع ہی سے تصنیف و تالیف کے کام سے شغف ہے، پچھلے چند برسوں سے "اسلام کے زرعی نظام" پر مواد جمع کر رہے تھے جو اب ایک کتابی صورت میں تیار ہو گیا ہے، زیر نظر مضمون اسی کتاب کا ایک باب ہے اور برہان میں اس خیال سے شائع کیا جا رہا ہے کہ اس سے پوری کتاب کے متعلق ارباب نظر کی رائے کا اندازہ ہو سکے گا "برہان"

زمین سے متعلق ابتدائی تصورات | ابتدائی زمانہ میں زمین تمام انسانوں کی ملک سمجھی جاتی اور انتفاع کے لحاظ سے سب میں مشترک تھی۔ جو شخص پہلے کسی قطعہ زمین کو کام میں لے آتا اسی کی عارضی ملکیت قائم ہو جاتی اور جب تک قبضہ کا عمل باقی رہتا بے دخل کر کے کسی دوسرے کا قابض ہو جانا انصاف اور قانون فطرت کے خلاف سمجھا جاتا تھا چونکہ اس صورت میں اس بات کا امکان تھا کہ اگر قابض سے زیادہ طاقتور شخص کو یہ مقام پسند ہو گا تو بے دخل کر کے خود قبضہ کرے گا اس لئے کچھ دنوں بعد مستقل ملکیت کا تصور قائم ہوا۔

پہلے صرف استعمال کا حق تھا اور اب اس کے ذات کی بنیاد پڑ گئی۔ پہلے قبضے نے ایک عارضی حق پیدا کیا تھا یہی حق بعد میں مستقل ملکیت کا سبب بنا۔

"بلیک اسٹون" کا یہی نظریہ ہے "جرمنی کا مشہور مقنن "سوگنی" تقریباً اسی رائے کا موید ہے "اہل روما" میں جائداد کا یہی ابتدائی تصور پایا جاتا ہے۔ جے۔ کے بلنچلی ایک حد تک اسی کی تائید میں ہے[1]

شخصی ملکیت کی ابتدا | مستقل ملکیت کا تصور قائم ہونے کے بعد زمین و جائداد کا مالک ایک شخص یا ایک خاندان نہ ہوتا بلکہ اس وقت پدرسری خاندان کے نمونہ پر جو جماعتیں قائم تھیں وہی اس کی مالک ہوتیں اور انھیں کے

[1] قدیم قانون فصل ہشتم ص۲۰ نیز نظریہ سلطنت ص۲۶۲

ذمہ پورا انتظام ہوتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ جماعت کے مشترکہ حقوق سے شخصی حقوق علیحدہ ہوتے گئے اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ شخص واحد مالک سمجھا جانے لگا۔[1]

عام طور سے ہوتا بھی یہی ہے کہ خاندان بڑھ کر ایک جدی رشتہ داروں کا مجموعہ ہو جاتا ہے پھر یہ مجموعہ مختلف گھرانوں میں منقسم ہو جاتا ہے اور بالآخر گھرانوں کی جگہ اشخاص قائم ہو جاتے ہیں جو مالک سمجھے جانے لگتے ہیں۔ لیکن تبدیلی کے ہر مرحلہ پر ملکیت کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔

زمینداری کی ابتدائی حالت پہلی مرتبہ "روما" میں اتنی بڑی جائدادوں کا ذکر ملتا ہے جن کی کاشت خاندان کا سردار اپنے گھر کے لڑکوں اور غلاموں کی مدد سے نہ کرا سکتا تھا۔ غالباً یہ زمیندار آزاد اسامیوں کے ذریعہ کاشت کرانے سے ناواقف تھے اس زمانہ میں عام طور سے کاشتکاری کا کام غلام انجام دیا کرتے ادنیٰ درجہ کے غلام اعلیٰ غلاموں کے سپرد کر دئے جاتے اور وہی ان سے کام لیا کرتے تھے مدتوں کاشت کا یہی طریقہ جاری رہا۔ جب زمینداروں کو اس بات کا احساس ہوا کہ جب تک پیداوار سے کاشتکار کا تعلق نہ ہو زمین کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی پیداوار بڑھ سکتی ہے تو بعض زمینداروں نے دوامی پٹے اور مقررہ لگان پر آزاد آسامیوں کو زمین دینے کا طریقہ رائج کیا۔ اس کے بعد کاشتکار کی دو قسمیں ہو گئیں (۱) غلام کاشتکار (۲) آزاد آسامی کاشتکار

رعایا اور ان کے اختیارات پھر کچھ غلاموں نے ترقی پائی اور آزاد آسامیوں کی حالت میں تنزلی ہوئی جس کے نتیجہ میں رعایا کا وجود ہوا۔ یہ لوگ سالانہ پیداوار کا ایک حصہ زمینداروں کو دیا کرتے تھے۔ دراصل زمین کو بٹائی پر دینے کی ابتدا اسی سے ہوئی ہے۔

زمیندار اور کاشتکار کا یہ معاملہ پہلے معاہدہ کے ذریعہ طے ہوتا تھا بعد میں اس کو مستقل حیثیت حاصل ہو گئی اور معاہدہ محدود ملکیت نام رکھ دیا گیا۔

"روما" میں اس شکل نے یہاں تک ترقی پائی کہ کاشتکار کو زمین کے ساتھ دلچسپی پیدا کرنے کا اس سے عمدہ اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس میں کاشتکاروں کو اتنے وسیع اختیارات ملتے تھے کہ "روما" کے حکام انھیں

---

[1] قدیم قانون فصل ہشتم

کو مالک سمجھتے اور بے دخل ہو جانے کی صورت میں دخلیابی کی نالش کر کے دوبارہ قبضہ کرنے کی اجازت تھی۔

اگر وہ وقت پر محصول ادا کر دیا کرتے تو پٹہ دہندہ (زمیندار) کسی قسم کی دست اندازی کا مجاز نہ ہوتا لیکن محصول ادا نہ کرنے کی صورت میں قبضہ کا اور عام حالت میں طریقۂ کاشت وغیرہ پر خاص قسم کی نگرانی کا حق باقی رہتا تھا۔ دراصل اس صورت میں دوہری ملکیت کا اصول قائم تھا یعنی بعض اختیارات کی بناء پر یہ کہا جا سکتا کہ کاشتکار مالک ہے اور دوسرے بعض اختیارات پر نظر کی جاتی تو زمیندار مالک ہوتا تھا یہی دوہری ملکیت کا اصول روما فوج کے سپاہیوں کی زمین میں بھی نافذ تھا۔ یہ لوگ سرحدی زمینوں پر مالکانہ حیثیت سے قابض تھے زمین حکومت ہی کی ہوتی تھی لیکن سپاہی جب تک فوجی خدمت انجام دیتے رہتے کاشت کرنے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ تھی۔

حقوق استفادہ نے موروثی شکل اسی محدود ملکیت سے اختیار کی ہے کیونکہ اس قسم کی زمینیں عام طور پر آزاد آسامیوں کے ورثاء پر منتقل ہو جاتی تھیں۔

جاگیرداری کا رواج محدود ملکیت کی مذکورہ شکل تقریباً سو سال تک غیر مہذب اقوام کے بادشاہوں کے سامنے رہی انھوں نے اسی کو دیکھ کر جاگیری نظام قائم کیا

عام طور سے جاگیر بادشاہ کے مصاحبوں کو درباداری کے صلہ میں ملا کرتی تھی اور یہ لوگ اس کے صلہ میں اپنی ذاتی آزادی کو قربان کر دیا کرتے تھے، بظاہر نظر میں یہ خدمت بڑی شاندار معلوم ہوتی لیکن اس سے ایک قسم کی غلامانہ ذلت کی بو آتی تھی کیونکہ اس کے بدلے اپنی ہر آزادی کو قربان کرنا پڑتا تھا

یہ ہیں زمینداری و جاگیرداری کے ابتدائی تصورات جو تمام رومی و یونانی دنیا میں رائج تھے اور تقریباً دنیا کی ہر قوم میں پائے جاتے تھے[1]

رومی یونانی زمینداری و جاگیرداری اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ذاتی ملکیت کی ابتدا ایک خاص مقصد اور فائدہ کے تحت ہوتی تھی لیکن بعد میں اس مسئلہ کا غلط تصور عالمگیر انقلاب اور طبقاتی فساد کا سبب بنا۔ حتیٰ کہ اللہ کی زمین جو سب میں مشترک تھی اور جس کے سب حقدار تھے ایک محدود طبقہ میں سمٹ کر رہ گئی اور دوسرا طبقہ جبر و تحکم کے

---

[1] قدیم قانون فصل ہشتم صفحہ ۱۹۶ تا صفحہ ۲۰۶

شکنجہ میں جکڑا ہوا ہر قسم کے وحشیانہ سلوک برداشت کرنے پر مجبور ہوا۔ اور انسان اپنی فطری صلاحیتوں اور طبعی استعدادوں کو چھوڑ کر زمیندار اور زرعی غلام میں تقسیم ہو گیا۔ پہلا طبقہ ہر حیثیت سے آزاد تھا . . . . . اور دوسرا طبقہ ہر حیثیت سے غلام تھا۔ زمین چھوڑ کر نہ دوسرا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت تھی اور نہ اپنی محنت سے منتفع ہونے کی سکت تھی۔ نہ آقاؤں کی تبدیلی کا اختیار تھا اور نہ اپنے آقا سے سرخروئی کی امید تھی۔

چنانچہ مشہور فلسفی افلاطون قدیم یونان کی یہ حالت بیان کرتا ہے

"یونان میں ظالم مظلوم ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتے کبھی پردہ کے پیچھے اور کبھی کھلے بندوں۔ کبھی مظلوموں کا شورشیں پھوٹ پڑتیں اور ظالمانہ طور پر دبائی جاتیں۔ گھروں کو جلانا۔ کھیتوں کو تباہ کرنا۔ قتل کرنا۔ غلام بنانا۔ غرض ہر قسم کے وحشیانہ سلوک عوام اور کاشتکاروں کے ساتھ مباح تھے"[1]

اور مشہور مورخ ایڈورڈ گبن رومن امپائر کے زوال کے اسباب کا خلاصہ یہ بیان کرتا ہے

"روم دو طبقوں میں بٹا ہوا تھا ایک ظالم۔ دوسرا مظلوم۔ عوام اور کاشتکار کی زندگی بیلوں اور گدھوں کے مثل تھی، حکام کے اختیارات غیر محدود اور سزا دینے میں ہر طرح آزاد تھے۔ زرعی غلاموں سے بھاری بھاری لگان وصول کیا جاتا اور تحصیل وصول میں ہر قسم کی دردناک اور عبرتناک سزائیں دی جاتیں"[2]

اس میں شک نہیں کہ بعض فرمانروائے روم آگسٹس وغیرہ نے اصلاحات کی کوششیں کیں اور ان میں رعایا پروری کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے لیکن ان کی یہ کوششیں دیرپا ثابت نہ ہو سکیں کیونکہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جس نظام میں زیادہ جاگیریں ہوں گی اس میں کاشتکار زیادہ پریشان ہوں گے اور سلطنت کے اجزاء میں نظم و ضبط کا اعلیٰ معیار نہ قائم رہ سکے گا۔

قطائع

خلافتِ راشدہ میں ایک قسم ان اراضی کی ملتی ہے جو مفادِ عامہ کے پیشِ نظر خلافت کی جانب سے لوگوں کو دی جاتی تھیں جس کو کلامِ عرب میں "قطائع" کہتے ہیں۔

---

[1] جمہوریہ افلاطون مقالہ پنجم صفحہ ۲۳۰ و صفحہ ۲۵۰ نیز ریاست صفحہ ۲۱۵ و مقدمہ ریاست صفحہ ۳۵ [2] تاریخ زوال روما صفحہ ۵۲ و ۶۱ و ۹۳ و ۹۴ و ۹۸ و حجۃ اللہ البالغہ ج ۱

اس انتظام کی دو صورتیں رائج تھیں۔

(۱) کاشت کے لئے کسی کو زمین دی جاتی اور وہ خود کاشت کرتا۔

(۲) اگر مفادِ عامہ کی کوئی خدمت سپرد ہونے کی بناء پر وہ کاشت نہ کر سکتا تو دوسرے کے ذریعہ کاشت کرواتا اور آمدنی یا پیداوار میں دونوں شریک ہوتے۔

خلافت کی جانب سے اس عطیہ کی کبھی تو یہ شکل ہوتی کہ صرف زمین کی منفعت کا مالک بنا دیا جاتا نفس زمین پر کسی قسم کے تصرف بیع۔ ہبہ وغیرہ کا اختیار نہ ہوتا اور کبھی زمین کی ذات اور منفعت دونوں کا مالک بنا دیا جاتا۔ اس صورت میں ہر قسم کے تصرف بیع۔ ہبہ وغیرہ کے اختیارات بھی حاصل ہوتے تھے لیکن قطائع کی کوئی شکل بھی سرکاری قانون اور ٹیکس سے مستثنیٰ نہ تھی بلکہ اجتماعی مفاد کے پیش نظر خلیفہ کے اختیارات بہ نسبت دوسری زمینوں کے قطائع پر زیادہ تھے۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے بہت سے ایسے قطائع تک واپس لے لئے۔ جو پیغمبر اسلام نے اپنے جلیل القدر صحابیوں کو عطا فرمائے تھے۔

رسول اللہ کا دینا بھی مفادِ عامہ کے پیش نظر تھا اور فاروق اعظم کا واپس لینا بھی اسی مقصد کی ترجمانی کر رہا تھا اس بحث کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت ہے تاکہ زمانہ خلافت کے قطائع کی اصل حقیقت واضح ہو سکے اور یہ معلوم ہو سکے کہ بعد میں اس کی اصل صورت کس قدر مسخ ہوئی۔ اور اب اس لفظ کو موجود زمینداری اور جاگیرداری کی حمایت میں کس بری طرح آلہ کار بنایا جا رہا ہے

قطائع کی تعریف: خلافت راشدہ میں قطائع کی جو نوعیت تھی اس کے پیش نظر اس طرح تعریف کی جا سکتی ہے "مفاد عامہ کے پیش نظر غیر آباد زمین کو آباد کاری کے لئے کسی کو دینا اور حسب حاجت و مصلحت سرکاری ٹیکس وصول کرنا"

چنانچہ اس کی تائید فقہاء متقدمین کے اس قول سے ہوتی ہے

الاقطاع اعطاء الارض للاحیاء سواء وجب فیه العشر او الخراج[1]	"اقطاع" کسی کو آباد کاری کے لئے زمین دینا چاہے اس میں عشر واجب ہو یا خراج۔

[1] فیض الباری للعلامہ انور الکشمیری ج ۳ صفحہ ۲۰

ذیل کی تصریحات سے بھی کسی حد تک اس کی تائید ہوتی ہے

اس بارے میں علامہ مقریزی کلام عرب کا یہ محاورہ نقل کرتے ہیں۔

اقطعه نهراً او ارضاً اباح له ذلك[1]　　نہر اور زمین قطیعہ دیا یعنی اس کے لئے مباح کر دیا

بدر الدین عینیؒ شارح بخاری کہتے ہیں

"قطائع" قطیعہ کی جمع ہے خلیفہ کے قطیعہ دینے کی یہ شکل ہے کہ جس شخص میں اہلیت دیکھے اللہ کے اموال میں سے کچھ حصہ خلافت کی جانب سے اس کو عطا کرے۔ اکثر اس لفظ کا استعمال زمین کے بارے میں آتا ہے اور اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں یا تو زمین کی ذات اور منفعت دونوں کا مالک بنا دیا جائے یا صرف منفعت کا مالک بنایا جائے ذات کا نہیں[2]۔

قاضی ابو بکر بن عربی شارح ترمذی کہتے ہیں

"اقطاع" ہبہ ہے جس میں ایک کا حصہ دوسرے شرکاء سے جدا کر دیا جاتا ہے کیونکہ آراضی میں تمام لوگ شریک ہیں[3]

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کہتے ہیں۔

"خلیفہ کو قطیعہ دینا جائز ہے اس کی دو صورتیں ہیں یا تو زمین کا مالک بنا دے یا مالک نہ بنائے صرف انتفاع کا موقع دے[4]

ان تمام تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "قطائع" کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ کسی شخص کو آبادکاری کے لئے خلافت کی جانب سے آراضی دی جائے۔

کس قسم کی آراضی دی جاتی تھیں | احادیث و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تین قسم کی آراضی ایسی ہوتی تھیں جو خلافت کی جانب سے بطور قطیعہ دی جاتی تھیں۔

(۱) بنجر زمین جو ہمیشہ سے غیر مزروعہ اور غیر آباد چلی آتی تھیں۔ ان کی ویرانی اور سختی دیکھ کر عام لوگوں کو انھیں قابلِ کاشت بنانے کی ہمت نہ ہوتی تھی، خلافت نے ایسی زمینوں کی طرف توجہ کی اور انھیں قابلِ کاشت بنانے کے لئے لوگوں میں تقسیم کر دی چنانچہ "نقیع" میں جو زمین حضرت زبیرؓ کو دی گئی تھی وہ اسی زمین سے تھی[5]

---

[1] کتاب الخطط مقریزی ج ۱ ص ۱۵۵　[2] عمدۃ القاری ج ۶ ص ۳۰۶　[3] عمدۃ القاری ج ۶ ص ۱۵۰ از فیض الباری　[4] مسوی ص ۲۰۹

[5] الاحکام السلطانیہ ص ۱۸۲

(۲) افتادہ زمین جو قابلِ زراعت ہونے کے باوجود کسی وجہ سے زیرِ کاشت نہ ہو۔

اس میں تمام وہ زمینیں شامل تھیں جو بستیوں کے اجاڑ ہو جانے کے بعد بے کار پڑی تھیں اور کوئی آباد کرنے والا نہ رہا۔

مدینہ کی وہ زمینیں بھی اسی میں شامل تھیں جو آبپاشی کی دشواری کی وجہ سے پیغمبرِ اسلام کے حوالہ کر دی گئی تھیں بلال ابن حارث کو رسول اللہ نے "وادیِ عقیق" اسی زمین سے عطا فرمائی تھی[1]

(۳) خالصہ (سرکاری) زمین۔ مفتوحہ علاقہ کی تمام وہ زمینیں جو خلافت کے لئے "خالصہ" قرار دی گئی تھیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

(ا) جن آراضی کے مالک جنگ میں مارے جاتے۔

(ب) یا بھاگ جاتے۔

(ج) شاہی جاگیریں جو بادشاہ کے صرفِ خاص کے لئے خالصہ ہوتی تھیں۔

(د) شاہی خاندان اور افسران کی جاگیریں۔

(ہ) ترائی۔ جھیلیں۔ جھاڑیاں وغیرہ۔

یہ اور اسی قسم کی تمام وہ زمینیں جن پر چند افراد قابض ہو کر عیش کرتے تھے اور اسلام کے بعد ان کا کوئی مالک اور آباد کرنے والا نہ رہتا تھا" خلافت کے لئے "خالصہ" ہو جاتی تھیں[2]

ابو عبیدؒ "خالصہ" کی تفصیل بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

فلم یبق بہا ساکن ولا لہا عامر فکان حکمہا الی الامام[3]

(مذکورہ آراضی میں نہ کوئی رہنے والا تھا اور نہ آباد کرنے والا اس لئے ان کا معاملہ خلیفہ کے سپرد تھا (خالصہ ہو گئی تھیں)

قاضی ابو یوسف کہتے ہیں

وذلک بمنزلۃ المال الذی لم یکن لاحد ولا فی ید احد[4]

اس زمین کی حیثیت اس مال جیسی تھی جو نہ کسی کا ہو اور نہ کسی کے قبضہ میں ہو۔

---

۱ الاموال ص۲۸۳ ۲ الاموال ص۲۸۲ والخراج ص۵۸ و ص۵۹ ۳ الاموال ص۲۸۲ ص۲۸۱ ۴ الخراج ص۵۷

حاصل یہ ہے کہ زمانہ خلافت میں انھیں آراضی سے "قطائع" دیے جاتے تھے جو کسی کے قبضہ میں نہ ہوں نہ ان کا کوئی مالک اور وارث ہوتا۔ کسی کے آباد کرنے کا کوئی نشان نہ ہوتا اور نہ ایسی زمین ہوتی جو قانوناً کسی کو نہ دی جاسکتی تھی مثلاً چراگاہ۔ جنگل۔ نمک کی جھیل وغیرہ اور نہ ایسی صورت ہوتی جس میں کسی کا نقصان ہوتا[1] ایسی زمینوں کے متعلق دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں یا تو بیکار پڑی رہتیں اور مفاد عامہ جو زمین سے متعلق ہیں پامال ہوتے رہتے اور یا دہ صورت اختیار کی جاتی جو مفادِ عامہ کے لحاظ سے مناسب اور بہتر ہوتی خلافت نے نفعِ خلق کے پیش نظر دوسری صورت اختیار کی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ زمانہ خلافت میں تمام بنجر و افتادہ زمینیں آباد ہوگئی تھیں اور آباد شدہ زمینوں سے غلہ اگنے لگا تھا۔

کس مقصد سے دی جاتی تھیں "قطائع" دینے کا مقصد زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنا اور خلق اللہ کا عام مفاد ہوتا تھا جب تک یہ مقصد پورا ہوتا رہتا خلافت کو کوئی دخل دینے کی ضرورت نہ تھی لیکن اگر اس میں کوتاہی ہوتی یا اراضی کے تنظیم کی اس سے عمدہ صورت سامنے آتی جس میں نفعِ خلق زیادہ معلوم ہوتا تو خلافت کو بے دخل کر دینے کا پورا حق تھا: چنانچہ تاریخِ خلافت میں چند ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں بلا پس و پیش اسی نظریہ کے ماتحت اہلِ زمین کو بے دخل کر دیا گیا تھا۔

چند یہ ہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث رض کو پوری "وادی عقیق" دے دی تھی لیکن وہ اس کا بڑا حصہ آباد نہ کر سکے۔ حضرت عمر رض نے فرمایا کہ رسول اللہ نے یہ زمین آپ کو اس لئے نہ دی تھی کہ نہ خود آباد کریں اور نہ دوسروں کو آباد کرنے دیں جتنی آپ آباد کر سکتے ہوں اپنے پاس رکھئے اور بقیہ واپس کیجئے حضرت بلال رض نے کہا کہ میں رسول اللہ کی دی ہوئی زمین کبھی نہ واپس کروں گا آخر کار حضرت عمر رض نے آباد شدہ حصہ کو چھوڑ کر بقیہ زمین واپس لے لی[2]

اس موقع پر قابلِ غور بات یہ ہے کہ بلال بن حارث رض رسول اللہ کے قریب ترین صحابی تھے اور زمین کا عطیہ خود رسول اللہ نے دیا تھا جس کے ساتھ لگاؤ ہونا فطری بات تھی مگر فاروق اعظم رض نے مفادِ عامہ کے پیش نظر

---

[1] الخراج ص۵۹ والاموال ص۲۷۶ و ص۲۷۷ [2] الاموال ص۲۹ والخراج لیحیی ص۹۳

نہ حضرت بلالؓ جیسے جلیل القدر صحابی کا خیال کیا اور نہ اس جذبہ کا کہ رسول اللہ کا دیا ہوا عطیہ کس طرح واپس لیں۔

یہ واقعہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ خلیفۃ اللہ کے سامنے خلق اللہ کا عام مفاد ہوتا تھا وہ اس کے لئے نہ اپنے بزرگ ساتھیوں کے ساتھ کسی قسم کا ترجیحی سلوک کرنے کے لئے تیار تھا اور نہ محض جذباتی امور سے متاثر ہو کر عام مفاد کو نظر انداز کر سکتا تھا۔

جب رسولؐ کا دیا ہوا عطیہ بلالؓ جیسے بزرگ سے واپس لیا جا سکتا ہے تو دیگر نا اہل لوگوں کے پاس سے بیکار زمین واپس لینے میں کیسے غور و فکر کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

(۲) رسول اللہؐ نے ایک اور شخص کو زمین دی تھی حضرت عمرؓ نے آباد کئے ہوئے حصہ کو چھوڑ کر بقیہ زمین واپس لے لی[1]۔

(۳) قوم بجیلہ کا واقعہ اوپر گذر چکا ہے فاروق اعظمؓ نے خالصہ زمین کا کچھ حصہ ان کو دے دیا تھا وہ تین سال تک وہ آباد بھی کرتے رہے لیکن جب نفع خلق کے پیش نظر اس سے عمدہ صورت سمجھ میں آئی تو بلا پس و پیش اسکو واپس لے لیا۔

(۴) فاروق اعظمؓ اور عمر بن عبد العزیزؒ کا عام قانون کے ماتحت مسلمانوں کو زمین جائداد سے بے دخل کر کے وظیفہ مقرر کر دینا اس بات کی شہادت کے لئے کافی ہے کہ حکومتِ الٰہی میں قطائع دینے کا سلسلہ عام مفاد کے پیشِ نظر اور پیداوار بڑھانے کے لئے تھا جب تک قطائع کے باقی رکھنے میں یہ مقصد پورا ہوتا باقی رکھے جاتے ورنہ جس صورت کے اختیار کرنے میں نفع خلق زیادہ نظر آتا حتی الامکان ذاتی مفاد کو ملحوظ رکھ کر وہی صورت اختیار کرنے کی پوری گنجائش تھی اُس نظریہ کی مزید وضاحت ان اصولوں سے ہوتی ہے جو قطائع کے بارے میں نافذ تھے۔

کن لوگوں کو دی جاتی تھیں | حکومتِ الٰہی میں انھیں لوگوں کو قطائع دئے جاتے تھے جو کاشتکار تھے یا جن کے ذمہ مفادِ عامہ کی کوئی خدمت سپرد ہوتی تھی۔

اس بارے میں علامہ مقریزی اور قاضی ابو یوسف یہ کلیہ بیان کرتے ہیں۔

---

[1] الخراج یحییٰ ص۸۲

"پیغمبر اسلام اور آپ کے جانشینوں نے انھیں لوگوں کو قطائع دئے تھے جن کے دینے میں ملک و ملت کی بھلائی تھی۔"[1]

علامہ بدرالدین عینیؒ کہتے ہیں

"خلیفہ کے قطائع دینے کی شکل یہ ہے کہ اللہ کے مال سے ان لوگوں کو "عطایا" دے جس میں ان کی اہلیت دیکھے۔"[1]

ان کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) جن لوگوں میں آبادکاری اور کاشتکاری کی صلاحیت ہوتی۔

(۲) جن کے ذمہ مفادِ عامہ کی کوئی خدمت سپرد ہوتی۔

(۳) فوجی اور تمام وہ لوگ جو ملک و قوم کی حفاظت پر مامور ہوتے۔

(۴) نومسلموں کو تالیفِ قلوب کے لئے۔ بسا اوقات لوگ اسلام قبول کر کے اپنے آپ کو نادار اور محتاج پاتے تھے۔ گذر بسر کی کوئی شکل نہ رہ جاتی تھی۔ ایسی حالت میں خلافت "قطائع" دے کر ان کو کسب معاش کے قابل بناتی تھی۔ تاکہ دوسروں کی دست نگری سے محفوظ رہ کر آزادانہ اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دے سکیں، نومسلموں کے ساتھ اس حسنِ سلوک کو دیکھ کر غیر مسلموں کو سوچنے سمجھنے کا موقع ملتا اور اسلام قبول کرنے کے لئے راہیں کھلتی تھیں۔

اصل بات یہ ہے کہ خلافت کے سامنے "قطائع" کا مقصد خلق اللہ کے لئے زیادہ پیداوار حاصل کرنا تھا اس لئے عام طور سے انھیں لوگوں کو دئے جاتے جو زمین کو زیر کاشت لاکر پیداوار بڑھا سکتے تھے اور اسی وقت تک باقی رکھے جاتے جب تک مقصد اجازت دیتا تھا۔

اسی بناء پر قاضی ابویوسف فرماتے ہیں۔

ولولا ذلک لم یاتوہ ولم یقطعوا حق مسلم ولا معاہد[2]

اگر یہ مقصد نہ ہوتا تو رسول اللہ اور خلفا کسی کو کسی مسلمان یا معاہد کا حق نہ دیتے کیونکہ زمین میں سب شریک ہیں۔

کتنی مقدار دی جاتی تھی

اس سلسلہ میں تاریخِ خلافت کا مطالعہ کرنے سے پہلے بنیادی طور پر چند باتیں پیش نظر ہونی چاہئیں۔

---

[1] عینی ج ۶ ص ۳۶ [2] مزید تحقیق و تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الخراج لابی یوسف ص ۶۱ و ۶۲ و ۶۰ والاموال ص ۲۷۹ و ۲۸۰ و ۲۸۱ و ۲۸۲

(۱) بنجر و افتادہ آراضی بکثرت تھیں اور آباد کرنے والے کم تھے۔

(۲) پیداوار آج کے مقابلہ میں نہایت ہی کم تھی خصوصاً عرب کی زمینوں کی۔

(۳) رسول اللہ اور صدیق اکبرؓ کے زمانہ خلافت میں فوجیوں اور دیگر کارپردازوں کی تنخواہیں مقرر نہ تھیں

(۴) فاروق اعظمؓ نے تنخواہوں اور وظیفوں کا باقاعدہ انتظام کیا۔

(۵) تنخواہ مقرر نہ ہونے کی صورت میں مفادِ عامہ کی خدمت کرنے والے لوگ خدمت چھوڑ کر خود کاشت کرتے یا زمین کاشتکاروں کے حوالہ کر کے پیداوار یا آمدنی میں دونوں شریک ہوتے۔

(۶) تنخواہوں اور وظیفوں کے مقرر ہو جانے کے بعد فاروق اعظمؓ نے مسلمانوں کی زمین و جائداد کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا قابل غور ہے۔

مزید وضاحت کے لئے چند واقعات یہ ہیں۔

(۱) ابوبکر صدیقؓ نے حضرت طلحہؓ کو قطیعہ عطا فرمایا اور چند لوگوں کو گواہ بنا کر حکمنامہ ان کے حوالہ کر دیا۔ گواہوں میں حضرت عمرؓ بھی تھے۔ حضرت طلحہؓ جب دستخط کرانے کے لئے عمرؓ کے پاس آئے تو یہ کہہ کر دستخط سے انکار کر دیا۔

هذا اكله لك دون الناس — کیا یہ سب تمہیں ہی مل جائے اور دوسرے محروم رہیں

پھر طلحہؓ غصہ میں بھرے ہوئے ابوبکرؓ کے پاس آئے اور کہا

والله ما ادری انت الخليفة ام عمر — واللہ میں نہیں جانتا کہ کون خلیفہ ہے آپ ہیں یا عمر

ابوبکرؓ نے فرمایا۔ بل عمر۔ بلکہ عمر ہیں

الغرض عمرؓ کی مخالفت کی وجہ سے فرمانِ صدیقی رد ہو گیا۔[1]

(۲) حضرت عیینہؓ کو صدیق اکبرؓ نے "قطیعہ" دیا جب دستخط کے لئے عمرؓ کے پاس آئے تو انھوں نے دستخط کرنے سے انکار ہی نہیں کیا بلکہ لکھے ہوئے کو مٹا دیا۔ عیینہؓ دوبارہ ابوبکرؓ کے پاس آئے اور دوسرا حکمنامہ

---

[1] الاموال ص ۲۸۳

لکھنے کی درخواست کی۔

واللہ لا اُجددُ شیئاً رد ہ عمر[1] خدا کی قسم وہ کام دوبارہ نہ کروں گا جس کو عمرؓ نے رد کر دیا ہو

باقی رہی یہ بات کہ حضرت عمرؓ نے دستخط سے کیوں انکار کیا جب کہ رسول اللہ ابو بکرؓ اور خود عمرؓ سے "قطیعہ" دینا ثابت ہے اس کی وجہ حضرت عمرؓ نے خود ہی ان الفاظ میں بیان کر دی تھی کہ

اھذا کلہ لک دون الناس کیا یہ سب تجھے ہی مل جائے اور دوسرے محروم رہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ صدیق و فاروق دونوں کا ایک مقصد تھا یعنی "قطائع" دے کر زمین کو زیر کاشت لانا تاکہ خلق اللہ کو زیادہ سے زیادہ غذا مہیا ہو سکے مگر یہ بات بھی ہر وقت ملحوظ رہتی کہ زمین صرف چند افراد کے ہاتھوں میں پڑ کر ان کے لئے عیش و آرام طلبی کا سامان نہ بن جائے یا بے کار نہ پڑی رہے۔ اس لئے یہ احتیاط ضروری تھی کہ صرف ان لوگوں کو زمین دی جائے جو اہل تھے اور اتنی دی جائے جتنی وہ استعمال کر سکتے تھے

حقیقت یہ ہے کہ حکومتِ الٰہی میں کسی فرد کو نہ تو بے کار رہنے دیا جاتا اور نہ دوسرے کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عیش و عشرت کا موقع ملتا تھا

اگر کسی فرد میں کاشتکاری کی اہلیت اور صلاحیت ہوتی تو آراضی اس کے حوالہ کر کے خلق اللہ کی خدمت پر مامور کر دیا جاتا اور اگر دیگر مفادِ عامہ کے لئے موزوں ہوتا تو اتنی مقدار زمین دی جاتی کہ دوسروں سے کاشت کرا کے خدمت کے فرائض اطمینان کے ساتھ انجام دے سکے۔ ایسی صورت میں کاشتکار اپنی صلاحیت کے مطابق خدمتِ خلق کرتا تھا اور صاحبِ زمین اپنی صلاحیت کے مطابق اس فرض کو انجام دیتا تھا۔

اسی بناء پر بدر الدین عینی کہتے ہیں۔

یجوز للجندی الذی یقطع لہ ان یوجر ما اقطع لہ[2] فوجی کے لئے اپنے قطائع کو کرایہ پر دینا جائز ہے

اور شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں۔

ولا یقطع الا قدر ما یتاتی العمل علیہ[3] ایسی مقدار قطیعہ دیا جائے جس پر کام کرنا آسان ہو

---

[1] الاموال ص ۲۸۳ [2] عمدۃ القاری ج ۶ ص ۳۶ [3] مسوی ص ۲۸۵

پھر کہتے ہیں۔

امام را باید کہ اقطاع کند بقدر حاجت [۱]

قطائع اور سرکاری ٹیکس | زمانہ خلافت میں "قطائع" سرکاری ٹیکس اور قانون سے مستثنیٰ نہ تھے بلکہ خلیفہ کے اختیارات بہ نسبت دیگر آراضی کے "قطائع" میں زیادہ وسیع ہوتے تھے۔

جیسا کہ قاضی ابو یوسفؒ کہتے ہیں۔

"قطائع" اگر عشری زمین سے دئے گئے ہیں تو عشر واجب ہوگا خراجی زمین سے دیئے گئے ہیں تو خراج واجب ہوگا

پھر کہتے ہیں

جس کسی کو خراجی زمین سے قطائع دیے جائیں تو پیداوار کا دسواں۔ پندرھواں۔ بیسواں حصہ یا اس سے بھی زیادہ یا خراج بہر حال جو مناسب ہو خلیفہ مقرر کرے۔

آگے چل کر کہتے ہیں

مجھے امید ہے کہ اس بارے میں خلیفہ جو بھی مناسب سمجھ کر کرے گا اس کے لئے وسعت اور گنجائش ہے۔

ہارون الرشید کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں

مفادِ عامہ کے پیشِ نظر آپ جو مناسب سمجھیں اس میں آپ کو پورا اختیار ہے [۲]

حاصل یہ ہے کہ حکومتِ الٰہی میں زمین جائداد نہ ذاتی وقار اور اقتدار بڑھانے کے لئے تھی اور نہ کاشتکاروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مفت خوروں کا طبقہ پیدا کرنے کے لئے بلکہ یہ ساری چیزیں پیداوار حاصل کر کے مفادِ عامہ کی راہوں میں صرف کرنے کے لئے اور خلقِ خدا کی خدمت کے لئے تھیں اس لئے قانون اور ٹیکس کے معاملات میں خلیفہ کے اختیارات وسیع تھے مذکورہ تمام تصریحات کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ موجودہ زمینداری اور جاگیرداری کی صورت قطائع سے بالکل مختلف ہے۔ جاگیردار و زمیندار ایک وسیع حصۂ زمین کا مالک ہوتا ہے کاشتکار اور مزدور اس پر کام کرتے ہیں اور مالکِ زمین بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے ان کے منافع سے عیش و آرام کرتا ہے۔

"قطائع" سے اس قسم کی تنظیم کے لئے کوئی جواز نہیں نکل سکتا بلکہ متعدد مثالیں ایسی ملتی ہیں کہ ایسے نظام کو سختی کے ساتھ ختم کیا گیا اور ایسا کرنے میں مفادِ خلق کے سوا کوئی دوسرا جذبہ یا مصلحت کارفرما نہ تھی۔

(باقی آئندہ)

[۱] مصفیٰ ص۳۰۵ [۲] الخراج ص۵۹ و ص۶۰

التقریظ والانتقاد

"جامع المجددین"

"بحث تجدید و مجدد"

(۸)

(از سعید احمد)

اس سلسلہ میں لکھنے کو تو بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً احکام سفر، ضبط ولادت اور پھر خصوصاً عورتوں سے متعلق احکام و مسائل کا جہاں تک تعلق ہے ان پر گفتگو کی اور بحث و نظر کی کافی گنجائش ہے لیکن اگر ہم اسی طرح ایک ایک مسئلہ کو لے کر گفتگو کرتے رہے تو یہ تبصرہ ابھی ایک سال میں بھی پورا نہیں ہوگا اس بنا پر اس کو یہیں ختم کر کے اب ہم تجدید و مجدد کے عنوان پر مختصر کلام کرنا چاہتے ہیں اور یہ ہی بحث ہمارے تبصرہ کی کتاب کا آخری باب ہوگا۔

جناب مؤلف نے بار بار اور بڑی تحدی کے ساتھ لکھا ہے کہ حضرت مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہٗ عہد حاضر کے نہ صرف مجدد بلکہ جامع المجددین یعنی کامل مجدد تھے اور دین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کی تجدید حضرت مرحوم نے نہ کی ہو۔ ہم کو اس سے اختلاف ہے اور ہماری رائے یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں اسلام کی تجدید ضرور ہوئی ہے لیکن اس کا سہرا تنہا کسی ایک بزرگ کے سر نہیں ہے۔ بلکہ علماء۔ مشائخ اور صلحاء ارباب کمال کی ایک جماعت کے سر ہے جس کے سب افراد نے اپنی اپنی وہبی و کسبی صلاحیت و استعداد کے مطابق اسلامی زندگی کے مختلف شعبوں میں اصلاح و تجدید کا عظیم الشان کام انجام دیا ہے اس جماعت کے سرخیل و میر کارواں حجۃ اللہ علی الارض حضرت

مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ تھے اور کوئی شبہ نہیں کہ حضرت مولانا تھانوی بھی اس جماعت کے ایک رکن رکین اور شاہد مسند نشین تھے یہیں نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جامع المجددین کے مؤلف نے جوش اعتقاد وارادت سے مغلوب ہو کر مولانا تھانوی کے اصل کمالات کا بھی بہت ہی سرسری اور سطحی جائزہ لیا ہے جس کی وجہ سے وہ یہ کہہ کر کہ مولانا کم از کم "مجدد معاشرت" تو تھے ہی آگے بڑھ گئے ہیں حالانکہ جیسا کہ ہم بتائیں گے مولانا کے تجدیدی کام کی بنیاد ایک بہت عمیق اور گہری حقیقت پر قائم ہے جس تک ان کے مرید باصفا کی نظر پہنچ بھی نہیں سکی ہے اور بے شبہ یہ کام مولانا تھانوی کا مخصوص کارنامہ ہے جس کی وجہ سے ہم نے ان کو بزم مجددین کا ایک شاہد مسند نشین کہا ہے۔ فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

سطور بالا میں ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ

(۱) تجدید کی حقیقت کیا ہے؟

(۲) مجدد کا اصل کام کیا ہے؟

(۳) مجدد میں کیا کیا اوصاف ہونے چاہئیں؟

اب ہم عنوانات بالا میں سے ہر ایک عنوان پر الگ الگ گفتگو کرتے ہیں

تجدید کی حقیقت قدرت کا قانون یہ رہا ہے کہ ایک مدت کے بعد جب کبھی لوگوں میں گمراہی اور کجی پیدا ہو گئی اور وہ طریق حق وصواب سے دور جا پڑے ہیں تو ان کی ہدایت اور صراط مستقیم کی نشاندہی کے لئے پیغمبر مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پیغمبری کے ختم ہو جانے کے بعد اب جب کہ کسی نبی کی بعثت کا امکان نہیں رہا، اور دوسری جانب فطرت انسانی کی اثر پذیری اور تغیر کوشی کا عالم وہی ہے جو پہلے تھا تو ظاہر ہے کہ اب ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو خود پیغمبر نہ ہوں لیکن جزوی یا کلی طور پر پیغمبرانہ کام کا احیا اور اس کے دین کی تجدید کرتے رہیں چنانچہ ارشاد نبوی ہے کہ اس امت میں ہر صدی کے سرے پر اللہ تعالیٰ ایسا شخص یا ایسے اشخاص پیدا کرتا رہے گا جو دین کی تجدید کریں گے یہ حدیث اگرچہ صحاح ستہ میں سے صرف سنن ابو داؤد میں مذکور ہے اور راویوں کے اعتبار سے حدیث صحیح وحسن کے مرتبہ کی حدیث نہیں ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ معنی کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے اور اس

حیثیت سے اس میں کلام کرنے کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ ختم نبوت کے بعد دین کے بقاء کی اس کے سوا کوئی اور صورت ہی نہیں ہے کہ ایک معتد بہ مدت کے فصل سے وقتاً فوقتاً مجدد آتے رہیں حدیث میں جو "علی راس المائۃ" کا لفظ آیا ہے اس سے بعض کیا اکثر علماء نے اس کا لفظی مفہوم مراد لیا ہے اور اس بناء پر جب کسی شخص کے مجدد ہونے کی بحث درمیان میں آتی ہے تو پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ وہ صدی کے آغاز یا آخر میں بھی تھا یا نہیں؟ لیکن جیسا کہ ملا علی قاری نے مرقات میں لکھا ہے۔ ہمارے نزدیک اس سے مقصود صرف "معتد بہ وقت" کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ اور بس! یعنی اتنی مدت جس میں بالعموم لوگوں کے عقائد و افکار۔ ان کے اعمال و افعال اور ان کے رجحانات و میلانات میں تغیر و تبدل واقع ہو جاتا ہے اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ "ان تستغفر لھم سبعین مرۃً" سے عدد معین نہیں بلکہ کثرت و تکرار استغفار مراد ہے۔

اس موقع پر چند باتیں یاد رکھنی چاہئیں!

(۱) جیسا کہ ابھی کہا گیا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ مجدد صدی کے آخر یا اول میں ہی ہو" وہ درمیان صدی میں بھی ہو سکتا ہے اس کی اس حیثیت کا فیصلہ اس کے کام کی روشنی میں ہوگا۔ نہ اس کی تاریخ پیدائش و وفات کی روشنی میں۔

(۲) مجدد شخص واحد بھی ہو سکتا ہے اور ایک جماعت بھی! مجدد شخص واحد اسی وقت ہوگا جب کہ تن تنہا ایک ہی شخص نے ایک جماعت کا کام کر کے مسلمانوں کی روحانی۔ اخلاقی۔ جسمانی۔ معاشی و اقتصادی اور سیاسی حیثیت سے تعلیم و تربیت کر کے انھیں "وانتم الاعلون" اور صحیح معنی میں "حزب اللہ" کا مصداق بنا دیا ہو؛ اس کے برخلاف جماعتی تجدید اس وقت ہوگی جب کہ کسی ایک جماعت کے مختلف افراد نے کسی ایک ایک شعبہ کی تجدید کی ہو اور ان سب کی متفقہ کوششوں کا مجموعی اثر یہ ہوا ہو کہ نور ظلمت پر اور اسلام کفر پر غالب آگیا ہو اور مسلمان بحیثیت ایک قوم کے عزت و عظمت کے مالک ہو گئے ہوں اس صورت میں اگرچہ فرداً فرداً ہر ایک کو مجدد کہا جا سکتا ہے لیکن دراصل "من یجدد لھا دینھا" کا مصداق پوری جماعت من حیث المجموع ہوگی نہ کہ اس جماعت کا ہر فرد الگ الگ!

(۳) مجدد طبقہ علماء و مشائخ میں سے بھی ہو سکتا ہے اور دوسرے ارباب سیاست اور اصحاب علم و فضل و کمال میں سے بھی۔ بشرطیکہ اس کی زندگی اور اس کا طریق کار اسلامی تعلیمات کے مطابق ہو اور اس کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہو۔

(۴) تجدید ناقص بھی ہو سکتی ہے اور کامل بھی! کامل اس وقت ہوگی جب کہ اسلامی نظام حیات مکمل طور پر سرفراز و سربلند اور نافذ و جاری کر دیا گیا ہو اور اس کی عظمت و سطوت کے سامنے جابرۂ عالم اور فراعنۂ روزگار کی گردنیں تسلیم و اطاعت کے بار سے خم ہو گئی ہوں اور رب السموات والارض کا مقصد "لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ" ایک حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آگیا ہو۔ بالکل ٹھیک اسی طرح جیسا کہ عہد خلافت راشدہ میں ہوا یا پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز کے مختصر دور حکومت میں اس کی جھلک نظر آئی اس کے برخلاف جو تجدید ہوگی وہ کسی نہ کسی حیثیت سے ناقص ہوگی اور جو مجدد ہوگا وہ خواہ دوسرے مجددین کے اعتبار سے کیسا ہی بڑا مجدد ہو اور مجدد اعظم کہلاتا ہو۔ بہرحال "مجدد کامل" نہیں ہوگا، عقل اور قیاس کا تقاضا ہے اور خود احادیث میں بھی اس کی طرف اشارے ملتے ہیں کہ ایک "مجدد کامل" کا ظہور ضرور ہوگا۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ اس شان کا مجدد اب تک پیدا نہیں ہوا ہے، اگرچہ آج کی دنیا گمراہی اور ضلالت کے جس قعر عظیم میں جا گری ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب مذاہب کفر و ضلال کے مجددین کامل کا ظہور ہو رہا ہے اور ان کی وجہ سے انسانیت کے شرف و مجد کی کتاب کا ایک ایک ورق پریشان ہو کر رہ گیا ہے تو ان کے توڑ میں اسلام کے مجدد کامل کا بھی ظہور ہو۔

معمار حرم باز بتعمیر جہاں خیز!!

مجدد کا اصل کام کیا ہے؟ گذشتہ تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ مجدد کا اصل کام کیا ہے یعنی وہ سب سے پہلے اس زنگ اور میل کچیل کو دور کرتا ہے جو امتداد زمانہ کے باعث اور مختلف اندرونی اور بیرونی اسباب و علل کی وجہ سے اسلام کے صاف و شفاف چہرہ پر مستولی ہو گیا ہے۔ پھر وہ ان اسباب کا بنظر غائر مطالعہ کرتا ہے جن کی وجہ سے حق کو اضمحلال اور باطل کو فروغ ہوا ہے اور اس کے بعد فساد کے آنے کی جتنی راہیں ہوتی ہیں ان کا بڑی وسعت نظر کے ساتھ جائزہ لیتا ہے اور ہر راہ کو مسدود کرنے فساد

کے ہر سرچشمہ کو بند کرنے اور باطل کی ہر قوت کو شکست دینے کے لئے ایک پروگرام بنا لیتا ہے یہ پروگرام اس کی اعلیٰ دماغی و ذہنی قابلیت۔ طہارت نفس۔ عالی نظری۔ شجاعت و بسالت۔ غیر معمولی بیدار دلی کا مظہر ہوتا ہے۔ اس مجدد کے لئے کوئی ایک خاص مورچہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ باطل کے ہر محاذ پر جھوٹ اور شیطنت کے ہر مورچہ پر صف آرائی کرتا ہے وہ اپنی زبان سے بھی کام لیتا ہے اور قلم سے بھی۔ اور اگر ضرورت داعی ہوتی ہے تو اسے تلوار اٹھانے میں بھی تامل نہیں ہوتا وہ ارباب عزیمت میں سے ہوتا ہے نہ کہ ارباب رخصت میں سے وہ سراپا حرکت اور جوش عمل ہوتا ہے۔ اپنے مشن کے لئے زمین کی طنابیں ناپتا ہے۔ سفر کرتا ہے اور جو آگ اس کے دل میں سلگ رہی ہوتی ہے وہ ہزاروں دلوں میں روشن کر دیتا ہے وہ گوشہ نشین و خلوت گزیں نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا اس کا کام صرف دعائیں مانگنا اور سبحہ گردانی کرنا نہیں ہوتا بلکہ وہ مرد شمشیر و دعا بھی ہوتا ہے اور دنیا کے ہر فتنہ کو چیلنج کرتا ہے غرض کہ علم اور عمل۔ فکر و نظر۔ اور سیرت و کیرکٹر ہر میدان میں اس کا پرچم لہراتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ مسکراتا ہے تو نسیم سحر اور شبنم کی لطافتیں اس پر نثار ہوتی ہیں وہ غصہ میں چیختا ہے تو رعد کی گرج اور بجلی کی تڑپ خوف و دہشت کے بادلوں میں روپوش ہو جاتے ہیں وہ اس کارگاہ ہستی میں اللہ کی ایک نشانی اور قدرت کی انگشتری کا ایک نگینہ ہوتا ہے۔ اس کی مسلسل جد و جہد سے فکر و نظر اور عمل و کردار کی دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا ہو جاتا ہے۔ کفر و ضلالت کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں بدعت و گمراہی کے بادل فنا ہو جاتے ہیں حق کا آفتاب ضو فشانی کرنے لگتا ہے۔ مسلمان صحیح معنی میں مسلمان ہو جاتے ہیں ذلت و نکبت کی جگہ عزت و عظمت ان کے قدم چومتی ہے اور وہ ایک زندہ قوم کی حیثیت سے رہنے کے قابل ہو جاتے ہیں ملا علی قاری فرماتے ہیں۔

اذا قل العلم وکثر الجھل والبدعۃ	جب علم کم اور جہل اور بدعت زیادہ ہو جاتی ہے تو اللہ تم
بعث اللہ من یجدد من الامۃ	ایسے لوگ پیدا کرتا ہے جو امت کے دین کی تجدید کرتے
ای یبین السنۃ من البدعۃ	ہیں یعنی یہ سنت کو بدعت سے ممیز کر دیتے ہیں علم کو زیادہ
ویکثر العلم ویعز اھلہ ویقمع البدعۃ	کرتے اور اہل علم کو غالب کر دیتے ہیں اور بدعت کا قلع قمع

دیکھیے اھلھا مرقاۃ ج ۱ ص ۲۴۷ کرتے اور اہل بدعت کو شکست دیتے ہیں۔

مجدد کے اوصاف و کمالات | سطور گذشتہ بالا سے یہ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ایک مجدد[1] میں کیا کیا اوصاف و کمالات ہونے چاہئیں ہم ذیل میں مزید وضاحت کی غرض سے انھیں اوصاف کو نمبر وار بیان کرتے ہیں۔

ذہانت و ذکاوت | ذہانت و ذکاوت کے بغیر معمولی سے معمولی دعویٰ میں بھی کامیابی نہیں ہوتی پھر یہ ظاہر ہے کہ تجدید کا اہم کام اس کے بغیر کیوں کر انجام پاسکتا ہے۔

مہارت علوم و فنون | ایک مجدد کو علوم و فنون اسلامیہ و عصریہ میں بھی ماہر ہونا چاہیے کیونکہ اقوام و ملل کے افکار و خیالات پر رائج الوقت علوم و فنون کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ اس بنا پر ایک مجدد کو معلوم ہونا چاہیے کہ فلاں معاملہ اور مسئلہ میں خیال کی گمراہی کہاں سے آئی ہے تاکہ وہ اس کا سدباب کر سکے۔ کسی زمانہ کے علوم و فنون مثل آلات حربیہ کے ہوتے ہیں جس طرح کوئی قوم اپنے زمانہ کے مروج اور ترقی یافتہ ہتھیاروں کو استعمال کئے بغیر جنگ میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتی اسی طرح کوئی مصلح اور مجدد اپنے عہد کے مروج علوم و فنون جن کو انسانی عقائد و افکار کے تشکیل و تعمیر میں دخل ہو۔ ان سے واقفیت اور ان میں بصیرت حاصل کئے بغیر فکر و نظر کی جنگ میں کامیاب نہیں ہو سکتا، رہ گئے اسلامی علوم و فنون! تو ان کی نسبت کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے جو شخص خود اپنے گھر سے بے خبر ہے وہ اس کی تعمیر جدید و تجدید کیونکر کریگا

تفقہ | ایک مجدد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لکیر کا فقیر اور صرف سطح شناس نہ ہو۔ بلکہ اس کو احکام الٰہی کے اسرار و غوامض اور رموز و علل سے پوری واقفیت ہو۔ وہ یہ جانتا ہو کہ فلاں حکم فلاں وجہ سے تھا اور مخصوص قسم کے حالات کے زیر اثر تھا۔ شریعت اسلام کے مسائل میں جو تنوع اور رنگا رنگی پائی جاتی ہے ایک مجدد میں اس بات کی صلاحیت ہونی چاہئے کہ وہ ان سب احکام متنوعہ و مختلفہ میں ہم آہنگی اور یکسانیت پیدا کرے اور ہر علم کا الگ الگ محمل و مصداق متعین کر کے ان میں توافق کی راہ نکالے پھر اس کو اپنے زمانہ کے حالات کا جائزہ وسیع النظری اور روشن دماغی کے ساتھ لیکر یہ معلوم کرنا چاہیے کہ احکام اسلام میں اور اس کے عہد کے حالات میں مطابقت پیدا کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

[1] یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں مجدد سے ہماری مراد وہ ہے جو من یجدد لھا دینھا کا مصداق ہو نہ کہ مجدد جزئی

اگر نہیں کی جاسکتی تو ان حالات سے عہدہ برآ ہونے کی کیا صورت ہے؟ اس کا کوئی کامیاب عملی حل نکالنا چاہیئے، ساری دنیا کو بے وقوف سمجھ کر اپنے آپ یا اپنی قوم کے لئے "ہمچو من دگرے نیست" کا صرف نعرہ لگاتے رہنے سے تجدید نہیں ہوتی ہے۔

تقویٰ وطہارت | ایک مجدد کی زندگی چونکہ دوسروں کے لئے ایک دعوت عمل ہوتی ہے اس بنا پر اس کو تقویٰ وطہارت کے وصف سے بھی متصف ہونا چاہیے ورنہ نہ اس کی باتوں میں اثر ہوگا اور نہ اس کے عقیدتمندوں کی عقیدت پائدار ہوگی۔

قوت تحریر وتقریر | مجدد میں تحریر وتقریر کی طاقت وقوت غیر معمولی ہونی چاہیے تاکہ وہ اپنے پیغام اور اپنی دعوت کو دوسروں تک زیادہ سے زیادہ موثر ودلنشین انداز میں پہنچا سکے کوئی حقیقت اپنی جگہ پر کتنی ہی ٹھوس اور سچی ہو لیکن قابل قبول طریقہ پر اس کی اشاعت اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک حسن بیان کی مدد شامل حال نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جو اسلام کا داعی اول تھا وہ فصاحت وبلاغت میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔

لیڈرشپ کی صلاحیت | مذکورۂ بالا صفات وکمالات کے علاوہ ایک مجدد کے لئے یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ اس میں ایک "انحطاط پذیر رفتہ" اور زبوں حال قوم کا لیڈر بننے کی استعداد بدرجۂ اتم موجود ہو۔ اس مقصد کے لئے سب سے مقدم یہ ہے کہ وہ قوم کی نفسیات سے پوری طرح باخبر ہو اور قوم جن فکری وعملی اسقام وعوارض میں مبتلا ہوگئی ہے ان کی صحیح تشخیص کرکے اس کی نظر ان عوارض کے طبعی اسباب ووجوہ پر ہو، یعنی اسے ایک طبیب حاذق کی طرح ہونا چاہیے کہ پہلے وہ اصل مرض کی جڑ معلوم کرے پھر اس کے اسباب کا پتہ لگائے اور پھر وہ مریض کی دوا اور پرہیز کا ایک ایسا جامع وہمہ گیر پروگرام بنائے جس پر عمل کرنے کے بعد مرض کی جڑ کٹ جائے اور اس کی وجہ سے فساد جہاں جہاں پیدا ہوگیا تھا وہ سب دفع ہوجائے اور اس کی عروق افسردہ میں زندگی کا نیا اور تازہ وصالح خون پیدا ہوکر اسے ازسرنو تنومند اور تندرست بنادے مگر مجدد اور طبیب میں فرق یہ ہے کہ طبیب صرف مرض کی تشخیص کر۔ نسخہ لکھ کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوجاتا ہے۔ نسخہ استعمال کرنا نہ کرنا یا اس کی ہدایات

کے مطابق عمل پیرا ہونا یا نہ ہونا یہ سب کچھ مریض یا اس کے تیمارداروں کے سپرد ہوتا ہے۔ وہ جانیں اور ان کا کام اس کے برخلاف مجدد کا کام یہ ہے کہ وہ صرف پروگرام ہی نہیں بناتا یا بالفاظ دگر نسخہ ہی نہیں تجویز کرتا ہے۔ بلکہ وہ خود مریض سے نسخہ کا استعمال بھی کراتا ہے اور جو چیزیں ازالہ مرض میں ممد ومعاون ہوسکتی ہیں انھیں کھلاتا اور جن چیزوں سے مرض میں زیادتی کا اندیشہ ہوسکتا ہے ان سے مریض کو باز بھی رکھتا ہے اس غرض کے لئے اس کو کبھی کونین کی گولیوں پر شکر لپیٹنی پڑتی ہے کہ مریض کی دلجوئی ہو اور کبھی مریض کو دھمکانا اور جھڑکنا بھی پڑتا ہے۔ گویا یوں سمجھیے کہ مجدد قوم کا طبیب حاذق بھی ہوتا ہے اور اس کا باپ بھی! اس کا دل بھی بیدار ہوتا ہے اور دماغ بھی روشن، مرض کی کیفیات بدلنے کے ساتھ ساتھ اس کا طریق فکر بھی بدلتا ہے اور نسخہ میں اس کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں اور مریض کی طبیعت اور اس کے تاثرات ذہنی میں انقلاب کے رونما ہونے کے ساتھ ساتھ مریض کے ساتھ اس کے برتاؤ میں بھی انقلاب پیدا ہوتا رہتا ہے، مریض درد سے چیختا ہے تو وہ خود بھی رونے لگتا ہے لیکن بایں ہمہ وہ اپنا دماغی توازن برقرار رکھتا ہے اور محبت کے جوش میں یہ نہیں کرتا کہ مریض کو کڑوی کسیلی دوا ہی نہ پینے دے۔

کامیاب لیڈرشپ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مجدد اپنی قوم کی نفسیات سے واقف ہو کر اس کے مطابق عمل ہی نہ کرے بلکہ اس قوم کو جن دوسری اقوام سے واسطہ پڑ رہا ہے ان کی نفسیات اور ان کی طاقت و قوت اور اس طاقت و قوت کے اصل سرچشموں سے بھی واقف ہو اور اس نے ان سب چیزوں کا مطالعہ دیدہ وری اور دقت نگاہ سے کیا ہو! اس پہلو سے ایک مجدد کی حیثیت فوج کے کپتان یا کمانڈر کی سی ہوتی ہے۔ ایک کمانڈر کا یہ فرض ہے کہ جنگ کا آغاز کرنے سے پہلے وہ خوب اچھی طرح یہ معلوم کرے کہ حریف مخالف کی تعداد کتنی ہے! اس کے پاس کتنے ہتھیار اور کون کون سے آلاتِ حرب ہیں رسل و رسائل اور سامان رسد کی فراہمی اور ان کی آمد و رفت کے راستے کتنے کیسے اور کون کون سے ہیں، دشمن کے مورچوں میں سے کون سا مورچہ مضبوط ہے اور کون سا کمزور اور اس کو اپنا پہلا حملہ کب کس وقت اور کتنی فوج اور کیسے ساز و سامان اور کیسی کیسی پیش بندیوں

کے ساتھ کس موقع پر کرنا چاہیے، علاوہ بریں اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ دشمن کے تعلقات کن کن حکومتوں کے ساتھ ہیں اور اس کو کہاں کہاں سے اور کس شکل میں کتنی اور کس قسم کی کمک مل سکتی ہے دشمن کے ملک میں کتنے دریا ہیں؟ کیسی کیسی پہاڑیاں اور درے ہیں اس کے معاشی اور اقتصادی ذرائع کیا ہیں؟ ظاہر ہے کہ جو کمانڈر آغازِ حرب سے قبل ان سب چیزوں کا جائزہ نہیں لیتا اور ان کے مطابق اپنی فوج کی نقل و حرکت کی تنظیم نہیں کرتا وہ کسی اتفاقی حادثہ سے کامیاب ہو جاتے تو ہو جائے نظر بر اسبابِ ظاہری اس کی کامیابی مشکل ہے!!

اسی سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی ہو گی کہ مجدد کے لئے "قوم کا" قوم کے "خواص" و "عوام" سب کا اعتماد حاصل کرنا بھی ضروری ہے یعنی قوم کے حالات۔ ذہنی کیفیات اور دماغی صلاحیت و استعداد کے پیش نظر اپنی تحریک اس معتدل رفتاری کے ساتھ چلانی چاہیے کہ قوم یکایک متنفر اور متوحش ہو کر اس کا ساتھ نہ چھوڑ دے۔ یعنی اس کو پہلے دعوت ذہنی ہو گی۔ خیالات و افکار بدلنے ہوں گے اور پھر ان کی تنظیم کرنی ہو گی!! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہر ایک کے لئے ایک صحیح نمونہ عمل موجود ہے ایک اعرابی آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ آپ شروع شروع میں فرماتے ہیں کہ کلمہ پڑھنا اور نماز ادا کرنا اس کے کچھ دنوں بعد روزہ اور پھر زکوٰۃ و حج کی تعلیم و تلقین آہستہ آہستہ فرماتے ہیں یہ نہیں کہ ایک دم ہی اس کو سارے احکام و فرائض کا مکلف کر دیا ہو شراب ایسی ام الخبائث چیز جس کو نزول اسلام کے اول روز حرام ہونا چاہیے تھا سنہ ۳ھ میں حرام ہوئی اور وہ بھی تدریجی طور پر حضرت عائشہ اس کی مصلحت و حکمت بھی بیان فرماتی ہیں کہ اگر شراب پہلے ہی دن حرام ہو جاتی تو کوئی نہ سنتا۔ آنحضرت چاہتے تھے کہ حطیم کو ہدم کر دیں، مگر فرمایا کہ قوم نئی نئی مسلمان ہوئی ہے۔ اگر حطیم کو گرا دیا گیا تو کہیں یہ نہ کہے کہ یہ کیسے پیغمبر ہیں کہ بناء ابراہیمی میں کانٹ چھانٹ کرنے لگے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ منافق کون کون لوگ ہیں لیکن اس کے باوجود آپ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ مجھ کو تو معلوم ہے کہ یہ لوگ منافق ہیں مگر دوسروں کو اس کا علم نہیں اس بنا پر اگر ان کو قتل کیا گیا تو کہا جائے گا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ساتھیوں کو ہی قتل کرنے لگے پھر یہ دیکھو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس

طرح مکہ کی زندگی میں پہلے چپکے چپکے دعوت اسلام دیتے ہیں اور اپنا حلقہ وسیع کرتے رہتے ہیں حضرت عمرؓ ایسے باا ثر و باوقار اور مدبر و شجاع شخص کے لئے مسلمان ہونے کی دعا فرماتے ہیں اہل مکہ کی ستم رانی حد سے زیادہ ہوتی ہے تو مسلمانوں کے ایک گروہ کو حبشہ کی طرف چلے جانے کا حکم کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کو اپنا ہیڈ کوارٹر بناتے ہیں۔ ادھر مسلمانوں کی عسکری تنظیم ہوتی ہے اور ادھر مدینہ کے باا ثر یہودیوں کے ساتھ معاہدے ہوتے ہیں اب غزوات کا دور شروع ہوتا ہے تو ایک طرف جہاں بدر و حنین کی معرکہ آرائیاں ہیں تو دوسری طرف صلح حدیبیہ کا بھی ایک منظر ہے اس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مجدد کا خون گرم مگر دماغ ٹھنڈا ہونا چاہئے۔ اس میں شجاعت و بہادری کے ساتھ قوت برداشت بھی اور بردباری و حلم کا جوہر بھی ہونا چاہئے۔

عزیمت کوشی | ایک مجدد کی راہ پھولوں کی سیج نہیں۔ بلکہ کانٹوں اور مصیبتوں سے بھری ہوتی ہے ظاہر ہے کہ جب وہ نظام باطل کے خلاف حق و صداقت ضلالت کے بالمقابل اسلام محض اور جھوٹ کے مقابلہ میں سچ کی حمایت اور اس کی اشاعت کرے گا تو شروع شروع میں اس کی زبردست مخالفت ہوگی۔ ارباب اقتدار اس کو اپنے اقتدار سے ڈرائیں گے اور قید و محن میں کسنے کی کوشش کریں گے، جیسا کہ امام احمد بن حنبل امام ابو حنیفہ۔ امام مالک بن انس۔ امام غزالیؒ۔ حافظ ابن تیمیہ۔ اور شیخ احمد سرہندی اور حضرت سید احمد صاحب شہید۔ جن کو مجددین امت کہا گیا ہے ان کے ساتھ کیا گیا اس موقع پر مجدد کو صاحب عزیمت ہونا چاہئے۔ نہ کہ صاحب رخصت ؛ اسے قید و بند کے مصائب انگیز کرنے چاہئیں۔ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ گٹھیا۔ یا اختلاج قلب۔ اور یا اور کسی بیماری کا عذر کر کے خانہ نشین ہو کر بیٹھ رہے اسے کھلم کھلا میدان میں آنا چاہئے اور ہر قسم کے آرام و آفات کو ہنسی خوشی برداشت کرنا چاہئے۔

کشتگانِ عشق مے از ساغرِ سری خورند　　چونکہ سر را خاک خواہد خورد گو پیمانہ باش
کاذبی در عشق اگر خاکسترت گرد و خموش　　منہ پا چو در میدانِ سربازان نہی مردانہ باش

ہم نے یہاں تک مجدد کے عام اوصاف و کمالات بیان کئے ہیں اب بتائیں گے کہ حضرت مولانا تھانوی کے زمانہ میں اسلام کی اور مسلمانوں کی حالت کیا تھی؟ اور کیوں تھی؟ اور ان حالات کے پیش نظر ایک مجدد کو کیسا ہونا چاہئے تھا۔؟

باقی آئندہ

اُردو اَدب اِس سہ ماہی میں

از

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

اُردو اَدب کی اِس سہ ماہی میں ایک قابلِ ذکر کتاب "تنقیدی سرمایہ" ہے۔ اس کے لکھنے والے پرنسپل عبدالشکور ہیں۔ یہ کتاب دراصل ۱۹۴۶ء میں ایک مختصر مقالہ کے طور پر لکھی گئی تھی۔ لیکن شوق کی بے پایانی سے پوری ایک کتاب بن گئی۔ یہ اس کا دوسرا اڈیشن ہے۔ اور ترتیب کے اعتبار سے "نقشِ اول" سے بالکل مختلف ہے۔ اب اس کو دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ یہ پہلا حصہ ہے۔ جو میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں دوسرا حصہ ترقی پسند نقادوں کے لئے وقف ہوگا۔ لیکن وہ ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔

اردو تنقید کے متعلق پروفیسر کلیم الدین احمد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اُردو میں تنقید کا وجود فرضی ہے۔ یہ تنقید کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر۔

صنم سنتے ہیں تیرے بھی کمر ہے ‏ کہاں ہے۔ کس طرف کو ہے کدھر ہے

جغرافیہ وجود سارا ‏ ہر چند کہ ہم نے چھان مارا

کی سیر بھی گرچہ بحر و بر کی ‏ لیکن نہ خبر ملی کمر کی

اس طرح نگاہ جستجو جغرافیہ اردو کی سیر کرکے مایوس واپس آجاتی ہے۔ لیکن تنقید کے جلوے سے مسرور نہیں ہوتی"

اس رائے میں سچائی نہیں ہے۔ محض طعن اور تشنیع ہے اور زیرِ بحث "تنقیدی سرمایہ" کی دو جلدیں اس رائے کو غلط ثابت کرنے میں بڑی شہادت کا کام دے سکتی ہیں اگر اردو کے قدیم تذکروں کو غور سے دیکھا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ اُس وقت بھی

اردو ادب کے ساتھ ساتھ تنقید کے سانچے موجود تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ تخلیقی قوت بغیر تنقیدی قوت کے ممکن ہی نہیں ہے۔ تنقید کا ادب سے وہی تعلق ہے۔ جو کہ ادب کا زندگی سے ہے۔ یہ فلسفہ بھی ہے اور مذاق علمی کی تاریخ بھی۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح ہماری شاعری ایک زمانہ تک مقررہ روش پر چلتی رہی۔ اور چند بندھے ٹکے مضامین نظم کرنے کا نام شاعری ہو کر رہ گیا۔ اسی طرح تنقید پر بھی جمود طاری رہا۔ اور وہ بھی تعمیری تخلیقی نہیں بلکہ رسمی اور میکانکی ہو کر رہ گئی۔ غدر کے بعد شاعری اور تنقید کو نئے محرکات حاصل ہوئے اور دونوں نے حیات اور کائنات کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ شکور صاحب نے جو ابواب قائم کئے ہیں ان کی گفتگو کے وسیع دائرہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کتاب کی تقسیم اس طرح ہے

(۱) تنقید کیا ہے ؟

(۲) ہمارا قدیم تنقیدی سرمایہ۔

(۳) اردو میں تنقید کی ابتدا۔

(۴) اردو تنقید کا عارضی زوال۔

(۵-۶) اردو تنقید کی ترقی کا پہلا دور۔ دُوسرا دور۔

(۷) اس سرمایہ پر ایک نظر۔

شکور صاحب نے تنقید کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غالب نے تقریر کی لذت ان الفاظ میں بیان کی ہے :-

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔"

"اس تقریر کی لذت کو اجاگر کرنا نقاد کا کام ہے۔ اس تقریر کی لذت میں زبان کی چاشنی اور جذبے کے حلاوت دونوں موجود ہوتی ہیں۔ چنانچہ جذبہ شاعر نہیں ہوتا۔ بلکہ شاعری کا موجب ہوتا ہے۔ مگر جذبے کا ہر بیان شاعری نہیں ہے۔ اس بیان کا خوبصورت دلکش اور دل نشین ہونا ازبس ضروری ہے۔ اس طرح نقاد جس طرح جذبے کی جانچ پڑتال کرتا ہے

اُسی طرح زبان اور محاوروں کو بھی جانچتا ہے۔"

یہ تعریف ادھوری ہے۔ اب تنقید ایک سماجی عمل ہے۔ اس کے ڈانڈے تاریخ سے ملے ہوئے ہیں۔ وہ فن اور علم ہی نہیں۔ ایک ادارہ ہے اور اس کی تزئین وآرائش میں وہ تمام سماجی اور سائنسی علوم مدد دیتے ہیں۔ جن کو کہ ہم ادب سے دور رکھنے کے عادی تھے۔

شکور صاحب نے میرؔ کے تذکرہ "نکات الشعرا" کے متعلق لکھا ہے "کہ اس میں تنقیدی مواد بہت کم ہے۔ اور جو کچھ ہے وہ محض برسبیل تذکرہ ہے۔" یہ وہی رائے ہے۔ جو اس سے قبل میرؔ کے مخالفین یعنی حکیم قدرت اللہ قاسم۔ شفیقؔ اورنگ آبادی۔ اور مولوی کریم الدین وغیرہ نے ظاہر کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ اندھی اور بہری عقیدت جو قدیم مشرقی اخلاق کا ایک جزو ہے۔ میرؔ صاحب کے تذکرہ میں موجود نہیں ہے۔ اس میں توقع کے خلاف کافی تنقیدی مواد موجود ہے۔ اور انہوں نے زمانے کی عام اور غلط رائے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس قدر "برہنہ" اور "واشگاف" رائیں ظاہر کی ہیں۔ کہ ایک عالم میں تہلکا مچ گیا۔ ان کی خوبینی مُسلّم۔ لیکن ان کی اصابت رائے اور ان کی دیدہ وری میں شبہ نہیں

شکور صاحب نے اپنی کتاب میں وحید الدین سلیم کو کوئی جگہ نہیں دی۔ اور یہ بہت بڑی فرد گذاشت ہے۔ انہوں نے فراق اور اعجاز حسین کا ذکر ترقی پسند حضرات کے گروہ میں نہیں کیا۔ حالاں کہ یہ دونوں حضرات ترقی پسندی کے دعویدار ہیں۔ اگر وہ کسی وجہ سے ان لوگوں کو اس زمرہ میں شامل کرنا نہیں چاہتے۔ تو اس کے اسباب ووجوہ پیش کرنے ضروری تھے۔ اس کتاب سے تنقید کے عہد بہ عہد رجحانات کا اندازہ نہیں ہوتا لیکن یہ باتیں جو میں نے عرض کی ہیں۔ ان کی حیثیت خالِ رخِ زیبا کی ہے۔ ساری کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ اس میں حدیث دلبراں کا سا لطف ہے۔ آپ شکور صاحب کی رائے سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن ان کے خلوص پر شبہ نہیں کر سکتے۔

اردو کے بہت سے شاعر گم نامی کی حالت میں ہیں۔ بعض کی چند چیزیں منظر عام پر

آئی ہیں۔ لیکن ان کے متعلق پوری تحقیق نہیں ہوئی۔ ضرورت ہے کہ ان اساتذۂ سخن کا صحیح درجہ متعین کیا جائے۔ اور ان کو ان کے درجہ کے مطابق اعزاز کی کرسیوں پر بٹھایا جائے۔ اسی قسم کی ایک کوشش پرنسپل عبدالشکور نے نظام رام پوری لکھ کر کی ہے یہ نظام وہی ہیں۔ جن کی یہ غزل "اُٹھا کے ہاتھ" اور "مسکرا کے ہاتھ" بہت مشہور ہے۔ ان کی شہرت کا انحصار ان کی غزلوں پر ہے۔ قصیدوں میں نہ بلند آہنگی ہے اور نہ شوکت الفاظ لیکن غزلوں میں سادگی اور پرکاری ہے شکور صاحب نے ۶۱ صفحات میں نظام کے تغزل سے بحث کی ہے اور ۲۳ صفحات میں ان کی غزلوں کا انتخاب پیش کیا ہے۔

اگست ۱۹۴۲ء میں حضرت نیاز فتحپوری نے نظام پر ایک مقالہ لکھا تھا۔ اس کے بعد نظام کے متعلق شکور صاحب کی یہ کتاب سب سے زیادہ دقیق اور قابل قدر خدمت ہے

اس عرصہ میں نگار کا مومن نمبر بھی شائع ہوا ہے۔ جو دراصل پوری ایک کتاب ہے۔ لیکن مومن کے تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں ہے۔ مومن کو عام طور پر لوگ غالب کا حریف جانتے ہیں۔ یا ہجرِ پردہ نشین میں مرنے والا اور کوچۂ رقیب میں سر کے بل جانے والا شاعر۔ لیکن وہ غالباً پہلا غزل گو شاعر ہے۔ جس نے انگریزی حکومت کے خلاف کھلم کھلا نفرت اور بیزاری کا اظہار کیا۔ اس کے کلام میں نہ ذوق کی سی خوشامد ہے اور نہ غالب کا سا۔ "تا خدا باشد بہادر شاہ باد" والا انداز۔ اور نہ انگریزوں کی چاپلوسی۔ وہ انگریزی حکومت کے خلاف لڑ کر جان دینے کا خواہشمند ہے۔ لکھتا ہے:-

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب ۔۔۔ یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں ۔۔۔ مری جاں فدا ہو تری راہ میں

اس زمانہ میں ہماری زندگی خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ رندی وہشیاری ایک ساتھ چلتی تھیں۔ ان میں اتنا فرق نہ تھا جتنا کہ آج نظر آتا ہے۔ زندگی عشق مجازی سے شروع ہوتی تھی۔ اور بعض صورتوں میں وہ عشق حقیقی کا زینہ بن جاتی تھی۔ مومن اپنے ماحول

سے متاثر ہوئے۔ لیکن اس سے اونچے بھی اٹھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں خودداری، انفرادیت اور آزادی کی تڑپ ہے۔ ان پہلوؤں پر زور دینے کی ضرورت تھی۔ مومن کی شاعری میں بھی یہی جدت طرازی اور انفرادیت نمایاں ہے۔ مثلاً ؎

منظور رہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں آتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

یہ شعر ملاحظہ ہو:۔ ؎

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی ناصح یہ بندِ غم نہیں قید حیات ہے

یہ تیور بھی دیکھئے:۔ ؎

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

مومن کا فنی تجزیہ حضرت نیاز فتحپوری۔ سید اعجاز احمد مرزا جعفر علی خاں۔ اثرؔ لکھنوی اور عبدالباری آسی نے بڑی محنت اور کاوش سے کیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مومن کے متعلق اس سے بہتر مجموعہ موجود نہیں ہے۔

اس عرصہ میں دہلی کتاب گھر دہلی سے ایک کتاب "جنوبی ہند میں دو ہفتہ" شائع ہوئی ہے۔ اس کے لکھنے والے حضرت جگن ناتھ آزاد ہیں۔ ان کی مشام جاں تک پہنچنے والی اور قلب کی تہوں میں بس جانے والی شاعری سے ہر اہل ذوق واقف ہے۔ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ نثر میں یہ ان کی پہلی کتاب ہے۔ جو منظر عام پر آئی ہے۔ اس کو بعض لوگ سفرنامہ بعض رپورتاژ کہتے ہیں۔ لیکن شاعرانہ زبان میں اس کا صرف ایک ہی نام ہو سکتا ہے۔

"افسانۂ آں شبے کہ با یار گزشت"

اسی لئے اس میں وہ لطف ہے جو "غزل" میں ہوتا ہے۔ ضمناً انہوں نے دکن کے متحدہ کلچر پاکیزہ تمدن۔ اور زبان کے مسئلہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ دکن میں علاقائی باتوں کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ اور اس پر حکومت ہند ایک رپورٹ بھی مرتب کر چکی ہے۔ آزاد صاحب نے اس مسئلہ کے بھی بعض گوشوں کو روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور جو کچھ لکھا ہے

وہ سنجیدگی اور متانت کے ساتھ۔

اس زمانہ کی ایک اور قابل ذکر کتاب سید ریاست علی ندوی کی ہے جس میں انہوں نے عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان سے بحث کی ہے۔ یہ تاریخ کی کتاب ہے۔ اور اس کی طبع و اشاعت کے لئے اُتّر پردیش کی حکومت نے ڈیڑھ ہزار روپیہ دیا تھا۔ انہوں نے تاریخ کے بعض ایسے گوشوں پر بھی نظر ڈالی ہے۔ جو ابھی تک سب کی نظروں کے سامنے نہیں آئے عام تاریخوں میں عہدِ وسطیٰ محمدؐ بن قاسم کے اچانک حملہ کو دکھا کر غزنوی کے حملے سے شروع کیا جاتا ہے۔ فاضل مولف نے یہ بتایا ہے۔ کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت سے بہت پہلے لنکا۔ مال دیپ۔ مالابار۔ ٹراونکور۔ کارومنڈل۔ گجرات۔ بمبئی۔ سندھ۔ کشمیر۔ سرحد۔ بنگال اور بہار میں مسلمانوں کی نو آبادیاں قائم تھیں۔ اور یہاں کے ہندو راجاؤں اور باشندوں نے ان کو پوری رعائتیں دیں تھیں۔ اور وہ کامل آزادی کے ساتھ یہاں رہتے سہتے تھے اس میل جول کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونو کو ایک دوسرے کے تہذیب و تمدن علم و فن کے جاننے کا موقع ملا۔ عربوں نے ہندوستان کے قدیم علوم ہیئت و نجوم" جوتش" حساب" ادب" شعر و ادب فن بت تراشی میں ہندوستان کی عظمت کو مانا۔ اور ان علوم کو عربی میں منتقل کرکے یورپ میں پھیلایا۔ اسی طرح طبی نظریے۔ جانوروں کے علاج کے طریقے۔ سانپوں کا علم جفر۔ رمل کیمیا" منطق"۔ اخلاق"۔ حکمت"۔ موسیقی" کے راگ" راگنیاں"۔ غرض یہ سارے علوم و فنون عربی میں داخل کئے گئے۔ اور عرب و ہند کا رشتہ مستحکم ہوا۔ یہ ملی جلی آبادیاں اور یہ مراسم اور تعلقات باقاعدہ حکومت کے قیام سے بہت پہلے کے ہیں۔ بعد میں یہ اتحاد اور بڑھ گیا۔ جو آج بھی زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آسکتا ہے۔

فاضل مولف نے اس تاریخ کے مرتب کرنے میں قدیم عربی اور فارسی ماخذوں کو استعمال کیا ہے اور اس طرح یہ ہندوستان کی تاریخ کی معیاری کتابوں میں ایک مفید اضافہ ہے۔ افسوس یہ کتاب مربوط نہیں ہے۔ مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ لیکن پھر بھی

اس کا مطالعہ ان تمام لوگوں کے لئے ضروری ہے جو ہندوستان کے گذشتہ موجودہ اور آئندہ تمدن کے مسئلہ پر غور کر رہے ہیں۔

اس سہ ماہی کے ادب میں کمزوریاں اور خامیاں ہیں لیکن اس میں تعمیر عمل اور سنجیدگی بھی ہے، اس میں ایک بیدار روح اور نئے مقاصد کی گرمی ہے اور یہی مستقبل کے لئے فال نیک ہے۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو دہلی)

اخلاق و فلسفۂ اخلاق

مکمل اور جدید اڈیشن

علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب، جس میں تمام قدیم و جدید نظریوں کو سامنے رکھ کر اصول اخلاق، فلسفۂ اخلاق اور انواعِ اخلاق پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور اس کے لئے ایک مخصوص اسلوبِ بیان اختیار کیا گیا ہے، اسی کے ساتھ اسلام کے نظامِ اخلاق کی تفصیلات کو ایسی دل پذیر ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے مجموعۂ اخلاق کی فضیلت تمام ملتوں کے اخلاقی نظاموں کے مقابلے میں روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

فی الحقیقت ہماری زبان میں اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جس میں ایک طرف علمی اعتبار سے اخلاق کے تمام گوشوں پر مکمل بحث ہو اور دوسری طرف ابوابِ اخلاق کی تشریح علمی نقطۂ نظر سے اس طرح کی گئی ہو کہ اس سے اسلام کے مجموعۂ اخلاق کی برتری دوسری ملتوں کے ضابطہائے اخلاق پر ثابت ہو جائے اس کتاب سے یہ کمی پوری ہو گئی ہے اور اس موضوع پر ایک معیاری کتاب سامنے آگئی ہے اس اڈیشن میں بہت کچھ حک و فک کیا گیا ہے اور متعدد مباحث کو نئے سرے سے مرتب کیا گیا ہے، حجم بھی پہلے سے کافی بڑھ گیا ہے صفحات ۵۹۲ بڑی تقطیع قیمت غیر مجلد چھ روپے آٹھ آنے ہے، مجلد سات روپے آٹھ آنے ہے۔

ادبیات

ظہورِ قدسی

از جناب بسمل شاہجہانپوری

زمیں شادماں ہے زماں شادماں ہے ہر ایک چیز دنیا کی عشرت بجاں ہے

زمیں پر فلک سے نظاروں کی بارش جبینِ چمن پر ستاروں کی بارش

زمیں کیا ادب سے فلک جھک گیا ہے شیاطیں کا دم خوف سے رُک گیا ہے

زمانے کو راحت کا پیغام آیا حبیبِ خدا لے کر اسلام آیا

ہر اک غنچے کو رنگِ توحید بخشا ہر اک ذرے کو جامِ جمشید بخشا

غلامی کو نئی طرح آزادیاں دیں جہانِ الم کوش کو شادیاں دیں

بلندی پہ پہنچا دیا پستیوں کو بنایا بہشتِ بریں بستیوں کو

محبت مجسم مروت سراپا دُعائے خلیل و نوید مسیحا

پسِ پردۂ میم احد جلوہ نما ہے
غرض وہ بزرگی میں بعد از خدا ہے

بشکریہ آل انڈیا ریڈیو

غزل

از جناب شارق میرٹھی ایم۔ اے

عشق کی آئینہ سامانی دیکھ
آ مرا عالم حیرانی دیکھ

اس کے جلووں کا تماشائی نہ بن
اپنے جلووں کی درخشانی دیکھ

تو نے دیکھی ہے ستاروں کی چمک
کبھی ذرّوں کی بھی تابانی دیکھ

رازِ تعمیر سمجھنے کے لئے
در و دیوار کی ویرانی دیکھ

پہلے ذرّوں کو عطا کر جلوے
اور پھر ان کی درخشانی دیکھ

لالہ و سرو و سمن کے طالب
میرے اشکوں کی گل افشانی دیکھ

میں کہاں اور خلشِ عشق کہاں
مجھ کو دیکھ اور غمِ پنہانی دیکھ

اپنی جمعیتِ خاطر کے لئے
جا کے ذرّوں کی پریشانی دیکھ

جانبِ طور نہ جا اے شارق
آ، مری سوختہ سامانی دیکھ

"زنجیریں"

(ایک حبشی غلام کا خواب)

چاولوں کے کھیت کی آغوش میں کار و بدست
ریت میں اُلجھے ہوئے بالوں کو دفنائے ہوئے

ہو گیا جب نیند میں بیہوش وہ محنت سے چور
سینۂ عریاں کو خستہ ٹانٹوں سے ٹھونکائے ہوئے

کھو گیا نیند کی پرچھائیوں میں ایک بار
اُس نے پھر دیکھے وطن کے نقش دھندلائے ہوئے

اس کے خوابوں کی حسیں پہنائیوں کے آر پار
بہہ رہا تھا اس کا پیارا دیس حبشِ تیرہ فام

تاڑ اور اونچی کھجوروں کے تلے —— میدان پر
اس کے قدموں کو ملی اک بار پھر شاہی خرام

پھر سُنا اُس نے جرس ہیں گونجتے جھنکارتے
جا رہے ہیں کارواں وادی کی جانب تیز گام

اس نے پھر دیکھا کہ بچوں کے اسی جمگھٹے میں ہے
اس کی آہو چشم "رانی" ایستادہ ایک بار

اس کے بچے اس کی گردن میں لٹک کر پے بہ پے
کر رہے ہیں "باپ" کے رخسار کو معصوم پیار

اس کی محوِ خواب پلکوں سے ٹپک کر گر پڑا
ایک آنسو ریگ کی آغوش میں بے اختیار

اور پھر وہ حبش کے دامن میں گھوڑے پر سوار
چل پڑا اک وحشیانہ تیزیٔ رفتار سے

آج اس کی باگ تھی سونے کی زنجیروں کا نام
اور وہ خود ہر قدم پر رزمیہ جھنکار سے

دیکھ سکتا تھا کہ پیہم اس کی فولادی رکاب
قاتلانہ کھیلتی ہے پہلوئے رہوار سے

اس کے آگے اُڑ رہے تھے سرخ افریقی طیور
جیسے لہراتا چلا جائے کوئی خونیں علَم
اور اُن اُڑتے ہوئے شعلوں کے پیچھے صبح شام
تھے رواں اُلٹی کے میدانوں میں گھوڑے کے قدم
اس نے دیکھے آخرش افریقیوں کے جھونپڑے
جھلملایا اس کے آگے منظرِ پہنائے یم

کھل گئیں اک دم درختوں کی زبانیں بے شمار
گونج اٹھی صحرا میں آزادی کی بانگِ لرزہ خیز
اور ریگستان کا وحشی بگولہ ساتھ ساتھ
چیختا آیا گرجتا، سنسناتا تیز تیز
چونک کر خوابوں ہی خوابوں میں وہ آخر ہنس پڑا
دیکھ کر اس جشن کے سیلاب کو ہنگامہ ریز

اس کو اب پگھلا نہ سکتا تھا "شرارِ نیم روز"
بے اثر تھی تازیانوں کی سزائے دل خراش
"موت" روشن کر چکی تھی اس کے خوابستان کو
خاک پر اوندھا پڑا تھا جسم — آب و گِل کی لاش
جسم اک زنجیر فرسودہ کہ جس کو روح نے
پھینک ڈالا تھا زمیں پر کر دیا تھا پاش پاش

(لونگ فیلو)　　مترجمہ شمس نوید

تبصرے

داستان ادب (حیدرآباد) از جناب سید محی الدین قادری زور تقطیع کلاں ضخامت ۲۲۲ صفحات۔ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے۔

پتہ:۔ سب رس کتاب گھر، خیریت آباد، حیدرآباد دکن۔

حیدرآباد کے حالیہ انقلاب سے عربی، فارسی اور اردو پر جو کچھ گذر رہی ہے اُس کو دیکھ کر سید محی الدین زور صاحب کو جو اردو کے مشہور اہلِ قلم اور مصنف ہیں۔ خیال پیدا ہوا کہ حیدرآباد دکن کے ان حضرات کا ایک تذکرہ لکھ دیا جائے جنھوں نے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد سے اب تک حیدرآباد میں عربی، فارسی یا اردو کی خدمت کی ہے۔ چنانچہ زیر تبصرہ کتاب اسی جذبہ کی عملی تسکین کا نتیجہ ہے۔ لائق مصنف نے اس میں تین سو برس کی طویل مدت کو دس عہدوں پر تقسیم کیا ہے اور ہر عہد کے ذکر میں اس زمانے کے شعراء، ادبا اور سرپرستِ علوم و فنون سلاطین و امرا کا تذکرہ کیا ہے۔ اگرچہ کتاب زیادہ تفصیلی نہیں ہے اور اس کی موجودہ حیثیت ان یادداشتوں کی سی ہے جو ایک پروفیسر کلاس روم میں لکچر دیتے وقت اپنے سامنے رکھ لیتا ہے۔ تاہم تاریخِ ادب کے ایک طالبِ علم کے لئے اس کا مطالعہ مفید بھی ہوگا اور دلچسپ بھی۔

مقالات صارم تقطیع خورد، کتابت وطباعت بہتر، ضخامت ۱۷۶ صفحات، قیمت مجلد عہ۔ پتہ ادارہ علمیہ، دھنی رام روڈ، نئی انارکلی، لاہور۔

مولانا عبدالصمد صارم سیوہاروی اپنی متعدد تالیفات کی وجہ سے اردو زبان کے روشناس مصنف ہیں۔ علاوہ مستقل کتابوں کے موصوف نے وقتاً فوقتاً متعدد اخبارات و رسائل میں جو طبع زاد یا مترجم مقالات یا مقالچات لکھے تھے۔ زیر تبصرہ کتاب انھیں کا مجموعہ ہے۔ یہ چھوٹے بڑے مضامین گنتی میں دس ہیں۔ جن سے شروع کے پانچ مقالات ادبی تخیل ہیں اور علمی ہونے

کی وجہ سے معلومات افزا اور مفید ہیں۔ ان کے علاوہ باقی پانچ مترجم و ملخص ہیں اور مختلف عنوانات پر ہیں جن میں سے ایک سل کی بیماری اور اس کے اسباب اور علاج پر ہے۔ مضامین کی اپنی جگہ پر افادیت اور ان کے لائق مطالعہ ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ لائق مؤلف کو ابھی بہت کچھ کرنا اور لکھنا ہے۔ مقالات کا مجموعہ وہ لوگ شائع کرتے ہیں جو اپنا فریضۂ حیات بہت بڑی حد تک ادا کر چکے ہوں۔ اس بنا پر ہمارے خیال میں اس مجموعہ کے شائع کرنے میں جلدی کی گئی ہے۔ جب مقالات بہت بڑی تعداد میں ہو جاتے تو ان کو موضوع کے اعتبار سے مرتب کرکے شائع کیا جاتا اور وہ مجموعہ ضخیم تر بھی ہوتا تو بہتر تھا!!

شکست و فتح از پروفیسر جمیل منظہری۔ تقطیع خورد ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ کتابت طباعت بہتر۔ قیمت دو روپے۔ پتہ: مکتبہ ارتقا نمبر A/۱۱ تانتی بگان روڈ، کلکتہ ۱۴۔

پروفیسر صاحب اردو زبان کے مشہور شاعر شیوا بیان اور صاحب طرز ادیب ہیں موصوف نے رسالہ ندیم گیا کی دو قسطوں میں "فرض کی قربان گاہ پر" کے عنوان سے مدت ہوئی ایک افسانہ لکھا تھا۔ اب یہی افسانہ نام بدل کر کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔ یہ اگرچہ کہنے کو ایک افسانہ ہے جس کا پلاٹ بھی صاف سیدھا اور سپاٹ ہے۔ لیکن در اصل فاضل مصنف نے افسانہ کے روپ میں محبت، شباب، شادی اور فطرتِ نسوانی پر خالص نفسیاتی نقطۂ نظر سے بڑی دلچسپ اور سبق آموز بحث کی ہے جسے پڑھ کر قارئین کے ذہن میں ایک عجیب قسم کا متجسسانہ ہیجان پیدا ہو جاتا ہے زبان و بیان دلکش اور معیاری ہے۔ ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد اسے ختم کئے بغیر ہاتھ سے رکھ دینے کو جی نہیں چاہتا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس طرح کی افسانہ نگاری اردو ادب میں اگرچہ بالکل نایاب نہیں ہے مگر کم ضرور ہے۔ اس کے لئے فکر و نظر کی پختگی عمق مشاہدہ اور وسیع قوتِ بیان کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ پروفیسر صاحب اس افسانہ کا دوسرا حصہ بھی جلد شائع کریں گے۔

خطوطِ اکبر مرتبہ جناب مختار الدین احمد صاحب آرزو ایم۔اے تقطیع کلاں ضخامت ۶۴ صفحات کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت درج نہیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے پتہ پر جناب مرتب سے ملے گی۔

جناب آرزو جو زبان و ادب سے متعلق بلند پایہ تحقیقات کی وجہ سے ملک روشناس ادیب و محقق ہیں۔ انھوں نے اس مجموعہ میں بڑی محنت اور تلاش کے بعد لسان العصر اکبر مرحوم کے ۳۶ غیر مطبوعہ خطوط ایڈٹ کیے ہیں۔ اکبر جیسی بلند پایہ شخصیت کے زبانِ قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ہمارے قومی ادب کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔ اس بنا پر جناب آرزو کی کوشش ادبی حلقوں میں بنظرِ استحسان دیکھے جانے کی مستحق ہے۔ لائق مرتب نے صرف خطوط ہی شائع نہیں کیے بلکہ شروع میں تقریب کے عنوان سے ایک معلومات افزا اور مفید مقدمہ بھی شامل کیا ہے جس میں خطوطِ اکبر کی سرگذشت۔ اُن کی خصوصیات اور اکبر کا طرزِ خطوط نویسی۔ ان سب پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اخیر میں فاضل مرتب نے اس مجموعہ کے تمام خطوط پر بہت مفید حواشی بھی لکھے ہیں۔ جن میں مکتوب الیہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔ یا خط میں اگر کوئی بات مبہم ہے تو اس کی تشریح کی گئی ہے یا دوسرے خطوط کی روشنی میں اگر اس مجموعے کے کسی خط میں کوئی بات قابلِ اعتراض ہے تو اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں لائق مرتب نے اپنے آزادیِ رائے کے حق کو بعض جگہ ہمارے خیال میں غلط بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً اکبر نے ایک جگہ اسپیکری کا لفظ استعمال کیا ہے۔ آرزو صاحب کو اس پر اعتراض ہے۔ لیکن اول تو اکبر نے یہ لفظ بطورِ ظرافت استعمال کیا ہے جو ان کا خاصۂ طبعی ہے اور پھر اگر کلکٹر سے کلکٹری اور کمشنر سے کمشنری بولا جا سکتا ہے تو اسپیکری کیوں قابلِ اعتراض ہے۔ اسی طرح ان کو قریباً کے لفظ پر بھی اعتراض ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں "قریباً کی جگہ تقریباً مناسب ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔ تنوین اردو میں مصدر ہی پر مستعمل ہے"۔ یہ اعتراض بھی صحیح نہیں، کیونکہ اردو میں یوماً فیوماً اور اباً عن جدٍ عام طور پر مستعمل ہوتے ہیں۔ ایک جگہ آرزو صاحب لکھتے ہیں "اُن کی موت کا اکبر پر بڑا صدمہ ہوا" (صفحہ ۸۰) یہاں بجائے "پر کے" "کو" ہونا چاہیئے۔ بہر حال یہ مجموعہ دلچسپ، مفید اور لائق مطالعہ ہے اور اُمید ہے اربابِ ذوق اس کی قدر کریں گے۔

بُرہان

جلد بست و نہم — شمارہ نمبر ۴

اکتوبر سنہ ۱۹۵۲ء مطابق محرم الحرام سنہ ۱۳۷۲ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

ایلیٹ کی تاریخ ہند سے اس ملک کی تاریخ کا کوئی طالب علم ناواقف نہیں ہوگا۔ ایک عرصہ تک یہی تاریخ ہمارے مورخین کے لئے سب سے زیادہ مستند ذریعۂ معلومات کا کام دیتی رہی اور اس حیثیت سے اس کی اہمیت تسلیم رہی ہے۔ لیکن ادھر کچھ مدت سے یہ کتاب ناپید تھی اور اگر کہیں اس کا کوئی نسخہ ملتا بھی تھا تو وہ بے حد گراں تھا جس کے باعث شخصی طور پر خرید کرنے کی ہمت مشکل سے ہی کسی کو ہو سکتی تھی خوشی کی بات ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے تین فاضل اساتذۂ تاریخ و سیاست نے ایک خاص اور مفید پروگرام کے ماتحت اس کتاب کو از سرِ نو شائع کرنے پر علی گڈھ کی ایک پبلشنگ ایجنسی کو آمادہ کیا چنانچہ اس کتاب کی جلد دوم جو غزنویوں اور غوریوں کے عہد پر مشتمل ہے۔ پچھلے دنوں چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ اس جلد میں پہلے پروفیسر محمد حبیب کا "تعارف" کے عنوان سے ایک بسیط مقالہ یا مقدمہ ہے جس میں موصوف نے فلسفۂ تاریخ کے موجودہ مادی نقطۂ نظر کی روشنی میں ان عام معاشی اور معاشرتی حالات کا جائزہ لیا ہے جو غوریوں کے عہد میں پائے جاتے تھے اور گویا اس طرح انھوں نے واقعاتِ متعلقہ کو طبعی اسباب وعلل کا نتیجہ قرار دے کر ان کی توجیہ یا "تاویل" کی ہے۔ پروفیسر صاحب کے نقطۂ نظر سے متفق ہونا ضروری نہیں البتہ اس کی علمی اور تاریخی افادیت سے انکار نہیں ہو سکتا" اس کے بعد تاریخ الیٹ کا اصل متن اور ضمیمہ ہے جو چھ سو صفحات پر مشتمل ہے پھر پروفیسر ہوڈیوالا نے اس تاریخ پر جو مفید اور محققانہ تبصرہ کیا تھا اس کا وہ حصہ جو اس عہد سے متعلق ہے شامل ہے اور یہ کم و بیش ڈیڑھ سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے آخر میں ہمارے فاضل دوست جناب خلیق احمد صاحب نظامی ایم۔ اے استاذ تاریخ مسلم یونیورسٹی کا ایک تکملہ ہے جو علمی اور معلوماتی اعتبار سے تاریخ کے طلباء کے لئے نہایت مفید اور کارآمد ہے اس میں موصوف نے الیٹ کے تاریخی نقطۂ نگاہ کے پس منظر پر بڑی عمدہ تنقید کی ہے۔ الیٹ نے جن کتابوں سے مدد لی ہے ان کے اور ان کتابوں کے مصنفین کے متعلق مزید بصیرت افروز معلومات

بہم پہنچائی ہیں علاوہ بریں ان ماخذ کا پتہ دیا ہے جن سے غزنویوں اور غوریوں کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے اور جو الیٹ کو دستیاب نہیں ہو سکے اس میں شبہ نہیں کہ ان مفید تر اور قیمتی اضافوں کے ساتھ الیٹ کی تاریخ ہند کی اشاعت مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا ایک شاندار علمی اور تاریخی کارنامہ ہے جس پر ہمارے فاضل دوست اور ان کے رفقا خصوصاً اور پبلشنگ ایجنسی عموماً مبارکباد کی مستحق ہے خدا کرے یہ سلسلہ بغیر کسی مانع اور رکاوٹ کے اسی طرح جلد تکمیل کو پہنچے اور علما اور طلبار کو اس سے استفادہ کا موقع ملے اس مجلد جلد کی قیمت پچیس روپیہ ہے اور کوسموپولیٹن پبلشرز۔ سول لائن بدر باغ علی گڈھ سے مل سکتی ہے۔

ہمارے فاضل اور عزیز دوست جناب خلیق احمد صاحب نظامی ایک عرصہ سے بڑی جستجو اور محنت و عرقریزی کے ساتھ ہندوستان کے مشائخِ چشت پر کام کر رہے ہیں اور اس کام کو انھوں نے گویا زندگی کا ایک مقصد بنا لیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے متعدد وقیع مقالات حیدرآباد کے بلند پایہ سہ ماہی رسالہ اسلامک کلچر میں انگریزی زبان میں اور چند مقالات اردو میں برہان میں شائع ہوتے رہے ہیں اور اہلِ علم و ذوق کے حلقہ میں بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں۔ اب قارئین کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ موصوف نے اس سلسلہ کی دو جلدیں مکمل کر لی ہیں جو ندوۃ المصنفین کی طرف سے شائع ہوں گی، ان کی کتابت شروع ہو چکی ہے۔ یہ کتابیں جس تحقیق و کاوش اور محنت و تلاش سے لکھی گئی ہیں۔ اس کے پیشِ نظر امید ہے کہ ان کی اشاعت سے ہماری زبان کے علمی لٹریچر میں ایک بیش قیمت اضافہ ہوگا جن کے مطالعہ سے قلب و روح بھی محظوظ ہوں گے اور دماغ میں بھی روشنی اور تازگی پیدا ہوگی!!

برہان کی گذشتہ اشاعت میں اطلاع دی گئی تھی کہ ندوۃ المصنفین کی کتاب "مسلمانوں کے عروج و زوال" کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو رہا ہے اور بنگلہ میں بھی! اول الذکر ترجمہ جو صاحب کر رہے تھے وہ تو ایک سال سے زیادہ ہوا کہ گورنمنٹ اسکالرشپ لے کر ڈاکٹریٹ کے لئے باہر چلے گئے اب معلوم نہیں کہ ترجمہ کا حشر کیا ہوا پورا ہوا یا جہاں تک ہو چکا تھا وہیں رہ گیا۔ البتہ بنگلہ کا ترجمہ مکمل ہو گیا ہے اور مشرقی بنگال میں اس کے چھاپنے

کا انتظام ہو رہا ہے۔ اس بنگلہ ترجمہ کی کچھ قسطیں کلکتہ کے ایک بنگالی رسالہ میں چھپی تھیں اور مقبول ہوئی تھیں

ندوۃ المصنفین نے جو کام اپنے ذمہ لیا تھا۔ ایک مرتبہ بالکل تباہ و برباد ہو جانے کے بعد بھی آج وہ اسی مستعدی اور ہمت و پامردی کے ساتھ انجام دیئے چلا جا رہا ہے اور اس درجہ غیرت و خودداری کے ساتھ کہ نہ کہیں زبان پر حرفِ جزع و فزع ہے اور نہ امداد کی پُرزور اپیلیں لیکن آج کل اردو زبان کی نشر و اشاعت کے سنجیدہ و متین ادارے جس دور سے گذر رہے ہیں وہ کسی پر مخفی نہیں ہمارا عہد تو یہ ہے کہ جس ذمہ داری کو ہم نے اپنے سر لیا ہے اس کو جب تک ہو سکے گا نباہیں گے۔ لیکن یہ بات خود آپ کے سوچنے کی ہے کہ آپ کو کیا کرنا چاہیئے؟ سوال بہت مختصر ہے اور وہ یہ کہ ندوۃ المصنفین سے اسلامی لٹریچر میں قابل قدر اضافہ ہو رہا ہے یا نہیں؟ اس کے کاموں سے ہندوستان میں اسلامی کلچر کی حفاظت و بقا میں مدد مل رہی ہے یا نہیں؟ اس کے رسالے اور کتابوں سے اردو زبان کو قوت بہم پہنچ رہی ہے یا نہیں؟ اگر ان سب سوالوں کا جواب اثبات میں ہے اور کسی رو رعایت اور مروت کی بنا پر نہیں بلکہ خود اپنے دل کی بصیرت اور دماغ کی بنا پر ہے اور آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس ادارہ کو قائم رہنا چاہیئے تو پھر آپ خود سوچئے کہ اس مقصد کے لئے آپ کو کیا کرنا چاہیے! ندوۃ المصنفین کا محسن یا معاون ہونا۔ ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہے آپ جتنا دیں گے اس سے زیادہ کی ورنہ اتنے ہی روپیہ کی لاگت کی کتابیں اور رسالہ آپ کو مل جائے گا چندہ وغیرہ قسم کی کوئی چیز آپ سے طلب نہیں کی جاتی اس بنا پر ہمارے ندوۃ المصنفین کے قدرداں احباب میں سے ہر صاحب اگر اس کا عہد کر لیں کہ وہ اپنے حلقۂ تعارف و اثر میں کم از کم کسی ایک صاحب ذوق و حیثیت کو ندوۃ المصنفین کا ممبر ضرور بنائیں گے تو ادارہ کی موجودہ دشوار ترین مالی مشکلات بڑی حد تک حل ہو سکتی ہیں اور یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے۔ صرف ادنیٰ توجہ اور معمولی دلچسپی کی ضرورت ہے آپ کوشش کیجئے کہ ادارہ کے مخلص و بے لوث کارکنوں کو تنگ آکر اور پچھتا کر یہ نہ کہنا پڑے کہ

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی
میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ بے نوازی

اسلام کا نظامِ عفت و عصمت

از

(جناب مولوی محمد ظفیر الدین صاحب استاذ دار العلوم معینیہ سانجھ)

(۲)

پاکیزہ نفس عورتوں کے امتیاز کی ضرورت | کوئی ذی عقل اس بات سے انکار نہیں کر سکتا، کہ مختلف طبیعتوں کے لوگ ہر زمانہ میں پائے جاتے ہیں، جہاں نیک لوگ بستے ہیں وہیں کچھ بد طینت لوگوں کا بھی بسیرا ہوتا ہے جو ہر وقت ٹوہ میں ہوتے ہیں اور جن کی نگاہیں بیباک ہوتی ہیں، اور اس جماعت میں مرد و عورت دونوں شریک ہیں، مگر جو لوگ اس طرح کے ہوتے ہیں، وہ اپنے رہن سہن اور طور و طریقہ کے اعتبار سے بڑی حد تک جانے پہچانے جاتے ہیں، بدکار مرد ان عورتوں کو خواہ مخواہ چھیڑنے کی جرأت کرتے ہیں جن کے متعلق ان کو کسی رنگ ڈھنگ سے معلوم ہو جائے، کہ یہ دوسری قبیل سے ہیں، اس لئے اسلام جب آیا اور واقعات بھی اس طرح کے پیش آئے تو ارشادِ ربانی ہوا،

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰٓی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا (احزاب - ۸)

اے نبی اپنی عورتوں، اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں لٹکالیں اس میں زیادہ امید ہے کہ وہ پہچانی پڑیں گی تو ان کو کوئی نہ ستائے گا، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ پاکدامن اور مومن عورتیں اپنا دوپٹہ باضابطہ رکھ لیا کریں، جن سے نمایاں طور پر معلوم ہو کہ یہ شریف طبقہ کی عورتیں ہیں، زناکار اور بدچلن نہیں ہیں، تاکہ فاسق اور بدکار مردوں کو معلوم رہے اور وہ اپنی شرارت کی وجہ سے ان کو چھیڑنے کی ہمت نہ کریں۔

دستور بھی کچھ ایسا ہی ہے، کہ وہ عورتیں جو خاص طرز کا لباس پہنتی ہیں، یا خاص طور پر بن سنور کر نکلتی ہیں اور اپنی خوبصورتی اور زینت کا اعلان کرتی ہیں ان کے متعلق آج تک مرد کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے، اور جو مرد دوسرے قماش کے ہوتے ہیں، موقع پاکر آنکھ لڑانے کی سعی کرتے ہیں، بخلاف ان عورتوں کے، جن کو اپنی عزت و آبرو کا پاس رہتا ہے، عصمت مآب اور دیندار ہوتی ہیں ان کے رہن سہن ہی سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے اور کوئی بھول کر بھی ان سے الجھنے کی کوشش نہیں کرتا، اس آیت کے ضمن میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی تحریر فرماتے ہیں۔

"یعنی بدن ڈھانپنے کے ساتھ چادر کا کچھ حصہ سر سے نیچے چہرہ پر بھی لٹکا لیویں، روایات میں ہے اس آیت کے نازل ہونے پر مسلمان عورتیں بدن اور چہرہ چھپا کر اس طرح نکلتی تھیں کہ صرف ایک آنکھ دیکھنے کے لئے کھلی رہتی تھی، اس سے ثابت ہوا کہ فتنہ کے وقت آزاد عورت کو چہرہ بھی چھپا لینا چاہئے۔"

عہد نبوی میں امتیازی لباس کا حکم

عہد نبوی میں بھی کچھ بدمعاش یہودی اور منافق اس طرح کے تھے جو عورتوں کو چھیڑا کرتے تھے اور دوسری قسم کی عورتوں کے ساتھ بعض پاکدامن شریف عورتیں بھی ان کی چھیڑ چھاڑ سے نہیں بچی تھیں، دوپٹہ اور چادر بڑھا کر آپ نے لباس میں امتیاز پیدا کر دیا۔ اس امتیاز پیدا کر دینے کے بعد خود رب العالمین نے فرمایا۔

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا (۶۰)	اگر منافق لوگ اور جن کے دلوں میں روگ ہے باز نہیں آئے اور مدینہ میں جھوٹی خبریں اڑانے والے باز آئے تو پھر ہو شبہ ہم تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے پھر وہ ترے ساتھ تھوڑے دنوں کے علاوہ شہر میں رہنے نہ پائیں گے۔

اس امتیازی شان کے بعد بھی اگر کسی بد طینت نے کسی پاکدامن عورت کو چھیڑا تو اس کو معاف نہیں کیا جائے گا، اور عہد نبوی میں ایسا ہی ہوا، یہودی جلا وطن ہوئے۔

کہنا یہ ہے کہ اولاً تو قرآن کا مطالبہ ہے کہ عورتیں بغیر ضرورت گھر سے باہر نہ پھریں، جیسا کہ قرآن کی اس سلسلہ کی پہلی آیت روشنی میں ہونکتی ہیں اشارہ گذرا، بلکہ قرآن کا صراحتاً حکم گذرا ہے، ارشاد

نبوی ہے۔

ان المراۃ عورۃ فاذا خرجت استشرفھا الشیطان واقرب ماتکون برحمۃ ربھا وھی فی قعر بیتھا (ابن کثیر ص ۴۶۳ ج ۳)

عورت ستر ہے جب وہ نکلتی ہے تو شیطان اسے جھانکتا ہے اور اس کے لئے اپنے گھر کے گوشہ میں ہی رہنا باعث رحمت الٰہی ہے۔

گھر سے باہر آنے کے شرعی آداب ثانیاً قرآن پاک کا مطالبہ ہے کہ اگر ضرورت کی وجہ سے ان کو نکلنا ہی پڑے تو نگاہیں پست رکھیں، اور شہوت کے مقام سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں مثلاً مرد و عورت کا ملا جلا کلب گھر اور مخلوط سوسائٹی، سینما، تھیٹر، اور اس طرح کی دوسری جگہوں سے مکمل اجتناب رکھیں، جس کا حکم قُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ الخ میں گذرا، پھر یہ کہ نکلیں تو ستر کو چھپا کر، اور آزاد عورت کا سارا بدن ستر ہے، بجز ہتھیلی اور چہرے کے، جس کا ذکر لَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا میں ہے، ثالثاً باہر نکلیں یا کسی کے سامنے آئیں تو چادر (دوپٹہ) اوپر سے ڈال لیں، اور بدن کا رانگ و خراش ظاہر نہ ہونے دیں، جیسا کہ ابھی آیت گذری يُدْنِينَ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ اور دوسری جگہ قرآن پاک نے اعلان کیا

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ (نور۔ ۴)

اور اپنی اوڑھنی عورتیں اپنے گریباں پر ڈال لیں

دوپٹہ ڈالنے کا طریقہ خمار لغت میں اس دوپٹہ کو کہتے ہیں جس کو عورت اپنے سر پر ڈالتی ہے، سلف صالحین نے بیان کیا ہے کہ سر پر سے لاکر سینوں پر اس طرح ڈالا جائے کہ جسم کے ابھار اور مواضع زینت میں سے کوئی حصہ نظر نہ پڑے اس طرح ہرگز نہ ہو کہ دوپٹہ کا آنچل پیچھے کی طرف ڈال لیا جائے جس سے سینہ کا ابھار نہ چھپ سکے بلکہ اس میں اور ابھار پیدا ہو جائے، جیسا کہ جاہلیت کے دور میں رواج تھا، اور جس کو اسلام مٹانے آیا تھا، یہاں یہ حکم ہے کہ قمیص کے اوپر دوپٹہ اس طرح ڈالا جائے کہ پوری ستر پوشی ہو سکے،

ہمارے شعراء کرام کے یہاں جوبن کے ابھار کو جو جگہ حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں اور طبعاً شعراء وغیرہ کا تازہ کردہ احساس بسا اوقات آدمی کو اس ابھار کی طرف متوجہ کر دیتا ہے اس لئے موجودہ دور میں اور بھی ضرورت ہے کہ اس کی پوری ستر پوشی عمل میں لائی جائے، حضرت عائشہ صدیقہؓ

دستور بھی کچھ ایسا ہی ہے، کہ وہ عورتیں جو خاص طرز کا لباس پہنتی ہیں، یا خاص طور پر بن سنور کر نکلتی ہیں اور اپنی خوبصورتی اور زینت کا اعلان کرتی ہیں ان کے متعلق آج تک مرد کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے، اور جو مرد دوسرے قماش کے ہوتے ہیں، موقع پاکر آنکھ لڑانے کی سعی کرتے ہیں، بخلاف ان عورتوں کے، جن کو اپنی عزت و آبرو کا پاس رہتا ہے، عصمت مآب اور دیندار ہوتی ہیں ان کے رہن سہن ہی سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے اور کوئی بھول کر بھی ان سے الجھنے کی کوشش نہیں کرتا، اس آیت کے ضمن میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ تحریر فرماتے ہیں۔

"یعنی بدن ڈھانپنے کے ساتھ چادر کا کچھ حصہ سر سے نیچے چہرہ پر بھی لٹکا لیویں، روایات میں ہے اس آیت کے نازل ہونے پر مسلمان عورتیں بدن اور چہرہ چھپا کر اس طرح نکلتی تھیں کہ صرف ایک آنکھ دیکھنے کے لئے کھلی رہتی تھی، اس سے ثابت ہوا کہ فتنہ کے وقت آزاد عورت کو چہرہ بھی چھپا لینا چاہئے"

عہد نبوی میں امتیازی لباس کا حکم

عہد نبوی میں بھی کچھ بدمعاش یہودی اور منافق اس طرح کے تھے جو عورتوں کو چھیڑا کرتے تھے اور دوسری قسم کی عورتوں کے ساتھ بعض پاکدامن شریف عورتیں بھی ان کی چھیڑ چھاڑ سے نہیں بچتی تھیں، دوپٹہ اور چادر بڑھا کر آپ نے لباس میں امتیاز پیدا کر دیا۔ اس امتیاز پیدا کر دینے کے بعد خود رب العالمین نے فرمایا۔

لَئِنْ لَّمْ یَنْتَہِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ	اگر منافق لوگ اور جن کے دلوں میں روگ ہے باز نہیں
فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ	آئے اور نہ جھوٹی خبریں مدینہ میں اڑانے والے باز آئے
فِی الْمَدِیْنَۃِ لَنُغْرِیَنَّکَ بِہِمْ ثُمَّ	تو پھر بیشبہ ہم تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے پھر وہ ترے
لَا یُجَاوِرُوْنَکَ فِیْہَآ اِلَّا قَلِیْلًا	ساتھ تھوڑے دنوں کے علاوہ شہر میں رہنے نہ پائیں گے۔

اس امتیازی شان کے بعد بھی اگر کسی بدطینت نے کسی پاکدامن عورت کو چھیڑا تو اس کو معاف نہیں کیا جائے گا، اور عہد نبوی میں ایسا ہی ہوا، یہودی جلاوطن ہوئے۔

کہنا یہ ہے کہ اولاً تو قرآن کا مطالبہ ہے کہ عورتیں بغیر ضرورت گھر سے باہر نہ پھریں، جیسا کہ قرآن کی اس سلسلہ کی پہلی آیت (وقرن فی بیوتکن) میں اشارہ گذرا، بلکہ قرآن کا صراحتاً حکم گذرا ہے، ارشاد

نبوی ہے۔

ان المرأۃ عورۃ فاذا خرجت استشرفہا الشیطان واقرب ماتکون برحمۃ ربہا وھی فی قعر بیتہا (ابن کثیر ج۳ ص۴۸۲)

عورت ستر ہے جب وہ نکلتی ہے تو شیطان اسے جھانکتا ہے اور اس کے لئے اپنے گھر کے گوشہ میں ہی رہنا باعث رحمت الٰہی ہے۔

گھر سے باہر آنے کے شرعی آداب

ثانیاً قرآن پاک کا مطالبہ ہے کہ اگر ضرورت کی وجہ سے ان کو نکلنا ہی پڑے تو نگاہیں پست رکھیں، اور شہوت کے مقام سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں مثلاً مرد وعورت کا ملا جلا کلب گھر اور مخلوط سوسائٹی، سینما، تھیٹر، اور اس طرح کی دوسری جگہوں سے مکمل اجتناب رکھیں، جس کا حکم قُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ الخ میں گذرا، پھر یہ کہ نکلیں تو ستر کو چھپا کر، اور آزاد عورت کا سارا بدن ستر ہے، بجز ہتھیلی اور چہرہ کے، جس کا ذکر لَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا میں ہے، ثالثاً باہر نکلیں یا کسی کے سامنے آئیں تو چادر (دوپٹہ) اوپر سے ڈال لیں، اور بدن کا رنگ وخراش ظاہر نہ ہونے دیں، جیسا کہ ابھی آیت گذری يُدْنِينَ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ اور دوسری جگہ قرآن پاک نے اعلان کیا

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ (نور-۴) اور اپنی اوڑھنی عورتیں اپنے گریبان پر ڈال لیں

دوپٹہ ڈالنے کا طریقہ

خمار لغت میں اس دوپٹہ کو کہتے ہیں جس کو عورت اپنے سر پر ڈالتی ہے، سلف صالحین نے بیان کیا ہے کہ سر پر سے لاکر سینوں پر اس طرح ڈالا جائے کہ جسم کے ابھار اور مواضع زینت میں سے کوئی حصہ نظر نہ پڑے اس طرح ہرگز نہ ہو کہ دوپٹہ کا آنچل پیچھے کی طرف ڈال لیا جائے جس سے سینہ کا ابھار نہ چھپ سکے بلکہ اس میں اور ابھار پیدا ہوجائے، جیسا کہ جاہلیت کے دور میں رواج تھا، اور جس کو اسلام مٹانے آیا تھا، یہاں یہ حکم ہے کہ قمیص کے اوپر دوپٹہ اس طرح ڈالا جائے کہ پوری ستر پوشی ہو سکے،

ہمارے شعراء کرام کے یہاں جوبن کے ابھار کو جو جگہ حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں اور طبعاً سینز شعراء وغیرہ کا تازہ کردہ احساس بسا اوقات آدمی کو اس ابھار کی طرف متوجہ کردیتا ہے اس لئے موجودہ دور میں اور بھی ضرورت ہے کہ اس کی پوری ستر پوشی عمل میں لائی جائے، حضرت عائشہ صدیقہؓ

فرماتی ہیں

يرحم الله نساء المهاجرات الاول لما انزل الله وليضربن الخ شققن مروطهن فاختمرن بها (ابن کثیر ۲۸۴/۳)

اللہ اول ہجرت کرنے والی عورتوں پر رحم فرمائیں جب دوپٹہ کا حکم نازل ہوا تو انھوں نے اپنی چادریں پھاڑ پھاڑ کر دوپٹہ بنالیا۔

ابن کثیر نے اور بھی بہت سی حدیثیں نقل کی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں اس آیت پر پورا پورا عمل کیا گیا،

اظہار زینت غیر کی ممانعت رابعاً نکلیں تو کوئی ایسی حرکت نہ ہونے پائے جس سے زینت کا اظہار ہو سکے یا دوسروں کی توجہ اس کی طرف کھنچ سکے، نہ ظاہری طور پر ایسی بات ہو اور نہ باطنی طریقہ پر، بلکہ ہر طرح ظاہر و باطن پاک ہو، باطن کے متعلق تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ

وہ آنکھوں کی چوری اور دلوں کے بھید کو جانتا ہے

اور ظاہر کے متعلق ہدایت فرمائی

وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِن زِينَتِهِنَّ وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (نور-۴)

اور عورتیں اپنے پاؤں کو زمین پر نہ ماریں کہ ان کی مخفی زینت جانی جائے۔ اور اے ایمان والو سب مل کر اللہ کی طرف توبہ کرو تاکہ تم بھلائی پاؤ۔

عورتیں عموماً پاؤں میں مختلف اور متعدد زیورات پہنا کرتی ہیں، بعض زیور بنا ہی اس طرح جاتا ہے کہ جب عورتیں اس کو پہن کر چلیں گی اس میں آواز پیدا ہوگی جیسے گھونگرو وغیرہ اس طرح کے زیورات بالکل ممنوع ہیں شریعت میں اس کی اجازت نہیں ہے، اور بعض زیور خود تو نہیں بجتے ہیں، ہاں دوسرے زیور میں ٹکرا کر آواز کرتے ہیں جیسے چھڑا اور کڑا وغیرہ اس طرح کے زیورات گو پہننا جائز ہیں مگر احتیاط کا حکم ہے کہ چلنے میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر آواز نہ پیدا کریں پھر ان کو پہننے اور پہن کر چلنے میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ ان کی چمک دمک دوسروں کی آنکھوں کو خیرہ نہ کر رہی ہوں کیونکہ آواز ہو یا چمک دمک بسا اوقات یہ بھی باعث فتنہ و فساد بن جاتی ہے۔

اس سے یہ بات بھی بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جب زیورات کے اخفا کا حکم ہے، اور

ان کی آواز کے متعلق احتیاط اور ممانعت کا حکم ہے، تو جن اعضا میں یہ زیورات پہنے جاتے ہیں، ان کے اخفا کا تو بدرجۂ اولیٰ حکم ہوگا، اور شریعت میں ان اعضا کے ستر کا تاکیدی حکم ہے بھی، پس معلوم ہوا کہ زیورات اور ان کے اعضا سب کی ستر پوشی کا حکم ہے،

خوشبو مل کر نکلنے کی ممانعت | اس آیت میں جو علت بیان کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوا، کہ کوئی ایسی بات نہ کی جائے، کہ وہ دوسروں سے عورت کی مخفی باتوں کی چغلی کرتی ہو، یا ان کو عورت کی طرف متوجہ کرتی ہے، لہذا معلوم ہوا، خوشبو اور عطر اور سینٹ لگا کر گھر سے باہر نہ نکلیں، حدیث میں عورتوں کے لئے مسجد کی اجازت مذکور ہے، مگر وہاں بھی گو وہ عبادت کے لئے خدا کے گھر میں حاضر ہو رہی ہیں، خوشبو مل کر نکلنے کی اجازت نہیں ہے، بلکہ ہدایت ہے کہ کپڑوں میں بھی چمک دمک تک نہ ہو، معمولی اور استعمال کے کپڑوں میں مسجد آئیں،[ع] اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عورتوں کو اگر ضرورت کی وجہ سے نکلنے کی حاجت ہو تو اس طرح نکلیں کہ وہ دوسروں کے لئے جاذب نظر نہ ہوں، ایک حدیث ہے

کل عین زانیۃ والمرأۃ اذا استعطرت فمرت بالمجلس فھی کذا وکذا یعنی زانیۃ (ترمذی)	ہر آنکھ زانیہ ہے اور عورت جو خوشبو لگا کر کسی مجلس پر گذرتی ہے، وہ بھی زانیہ ہے،

حضرت ابوہریرہؓ کی ایک عورت سے ملاقات ہوگئی، جس سے خوشبو پھوٹ رہی تھی، دریافت فرمایا، مسجد سے آرہی ہیں؟ بی بی صاحبہؓ نے کہا، ہاں، فرمایا خوشبو ملے ہوئی ہیں؟ انھوں نے کہا، جی ہاں فرمایا میں نے اپنے محبوب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوتے سنا ہے کہ جو عورت خوشبو لگا کر مسجد میں آتی ہے، اس کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا ہے، چنانچہ وہ پلٹیں اور اپنے کپڑوں کو خوب اچھی طرح دھویا،[1]

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

الرافلۃ فی الزینۃ فی غیر اھلھا کمثل ظلمۃ یوم القیامۃ لا نور لھا (ابن کثیر ص ۲۸۶ ج ۳)	اپنے اہل وعیال کے سوا دوسرے لوگوں میں بن سنور کر جانا ایسا ہے جیسے قیامت کے دن کی تاریکی، جس کے لئے کوئی روشنی نہ ہو

ع اس سلسلہ میں مری کتاب "اسلام کا نظام مساجد" کا یہ باب دیکھیں ۱۲ منہ [1] ابن کثیر ص ۲۸۶ ج ۳

عام گذرگاہ سے اجتناب کا حکم | اوپر جو آیت ذکر کی گئی اس سے یہ بھی کنایۃً معلوم ہوا، کہ فتنہ سے بچنے کی خاطر صدر راستہ سے نہ گذریں جہاں مردوں کی ریل پیل ہو، بلکہ وہ کنارے سے ہو کر گذر جائیں، مسجد میں جہاں ان کو حاضری کی اجازت ہے وہیں ان کو حکم ہے کہ پچھلی صف میں ملیں، حدیث میں صراحت ہے

خیر صفوف النساء آخرھا وشرھا — عورتوں کے لئے بہترین صف اس کی پچھلی صف ہے اور

اولھا رواہ مسلم (ریاض الصالحین ص۵۵۴) — اس کی اگلی بدترین صف ہے

اور مردوں کے لئے اسی حدیث میں مذکور ہے کہ ان کے لئے بہترین صف پہلی ہے اور بدترین آخری اسی طرح مسجد سے واپسی میں ہدایت تھی کہ عورتیں پہلے آجائیں تب مرد مسجد سے چلیں، اور یہ کہ اگر مردوں کا ساتھ ہو جائے تو راستہ کے کنارے ہو جائیں، ایک دفعہ ایسا ہو گیا تو آپ نے فرمایا۔

استاخرن فانہ لیس لکن ان تحققن — عورتیں پیچھے ہو جائیں

الطریق علیکن بحافات الطریق (ابن کثیر ج۳ ص۲۸۷) — عورتوں کے لئے ضروری ہے کہ راستے کے کنارے سے چلیں

اس حکم کے بعد عورتوں کا اسی پر عمل رہا، اس طرح چلتی تھیں کہ ان کا کپڑا دیوار سے لگتا ہوتا،

اسلام میں احترام عفت | آج کون ایسا عقلمند ہے جس کو دنیا کا تھوڑا بہت بھی تجربہ ہو اور وہ ان ہدایات کی حکمتوں کا انکار کر دے، جو قوم اور جماعت ان ہدایات کو نہیں برتا کرتی ہے، وہاں عفت و عصمت خطرہ میں گھر جاتی ہے جس کی خبریں رات دن ہم اخباروں میں پڑھتے رہتے ہیں، صدق لکھنؤ کا فائل دیکھ جائیے اس میں اس طرح کی سینکڑوں خبریں مل جائیں گی۔

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بغیر قصد و ارادہ بھی نوجوان تیر نظر کا شکار ہو جاتے ہیں، اور اداتے جاناں پر فریفتہ ہو کر جان کی بازی لگا دیتے ہیں، اسلام نے فروع سے صرف نظر کیا ہے مگر اصل حقیقت کو خوب سمجھا ہے، اور ان تمام راہوں پر آہنی دیوار کھینچ دی ہے، جن سے فتنوں کے داخلہ کا خطرہ ہو سکتا ہے، اور اس طرح عفت و عصمت کے دامن کو داغدار ہونے سے بچا لیا ہے،

بات کرنے میں لوچ نہ ہو | اسی حد تک بس نہیں ہے، اسلام نے اس کا حکم بھی دیا ہے، کہ اگر وہ کسی اجنبی مرد سے اپنے شوہر کے علاوہ مجبوراً باتیں کریں، گو وہ پردہ کی اوٹ سے ہو، تو بھی باتوں میں لوچ اور شیرینی پیدا ہونے نہ پائے

تاکہ کسی بدطینت کو شرارت کا موقع نہ ملے، ارشاد ربانی ہے،

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا (احزاب ۴) — اور چبا کر باتیں نہ کرو کہ جس کے دل میں روگ ہے وہ لالچ کرے اور تم معقول بات کہو

اپنے شوہر کے ساتھ بات کرنے کا جو طریقہ ہے وہ بس اسی کے لئے خاص ہے، دوسروں کے لئے وہ طرزِ گفتگو اختیار نہیں کیا جاسکتا، غیر سے جو بات کی جائے وہ صاف اور بھلی ہو، عشوہ وادا کے ساتھ گفتگو ہرگز نہ کی جائے اور گفتگو میں لب ولہجہ خشک ہی رکھا جائے، لگی لپٹی باتیں جس سے مرد کے شیطانی نفس کو حیلہ کی راہ سوجھتی ہے اس سے بالکلیہ اجتناب ضروری ہے۔

محرم کے لئے رعایت اسلام نے اظہارِ زینت، بے پردگی، چبا کر بات چیت کرنے اور اس طرح کی دوسری چیزوں سے سختی کے ساتھ روکا ہے، البتہ اپنے ان خصوصی رشتہ داروں کے سامنے آنے کی اجازت دی ہے جن کو اپنے خصوصی رشتہ کی وجہ سے طبعاً عورت کے لئے خیر کی خواہش ہوتی ہے، جیسے باپ، اپنا خاص بھائی، اپنا لڑکا، اور اپنا خاص بھتیجا وغیرہ۔ قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے

وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَى عَوْرَاتِ النِّسَاءِ (نور ۴)

اور اپنی زینت عورتیں نہ کھولیں مگر اپنے خاوند کے لئے یا اپنے باپ کے آگے، یا اپنے خاوند کے باپ کے، یا اپنے خاوند کے بیٹے کے، یا اپنے بھائی کے، یا اپنے بھتیجوں کے یا اپنے بھانجوں کے، یا اپنی عورتوں کے، یا اپنی لونڈیوں کے یا خدمت میں مشغول رہنے والوں کے، جو مرد کہ کچھ غرض نہیں رکھتے، یا لڑکوں کے جنھوں نے ابھی عورتوں کے بھید کو نہیں پہچانا

اس آیت میں جہاں بھائی کا ذکر ہے، اس سے صرف اپنا حقیقی، علاتی اور اخیافی بھائی مراد ہے چچازاد بھائی۔ ماموں زاد بھائی، پھوپھازاد بھائی اور اس طرح کے دوسرے وہ بھائی مراد نہیں ہیں جن سے

شادی کبھی بھی جائز ہو سکتی ہے ان سے بھی پردہ اسی طرح ضروری ہے جس طرح غیروں سے،

محرم اس کو کہتے ہیں، جس سے کبھی بھی شادی درست نہ ہو، اور ابداء زینت صرف انہی کے سامنے جائز ہے، جو محرم ہیں، ہندوستان اور غیر ملک میں چچازاد اور ماموں زاد بھائی وغیرہ سے جو بے پردگی کا رواج ہے شریعت کے خلاف ہے، بھائی کے لڑکا سے مراد آیت میں اپنا سگا، علاتی اور اخیافی بھائی کا لڑکا ہی مراد ہے دوسرے بھائیوں کے لڑکے مراد نہیں ہے، اسی طرح بہن کے بیٹوں میں صرف حقیقی، علاتی اور اخیافی بہن کے لڑکے شریک ہوں گے، غیر نہیں، اپنی عورتوں سے آیت میں دین کی شریک بہن مراد ہیں کافر عورتوں سے بھی پردہ ضروری ہے کہ وہ بھی اجنبی مرد کے حکم میں داخل ہیں، ہاں کافر لونڈیوں سے پردہ نہیں ہے، غلام بھی اجنبی مرد کے حکم میں ہی ہے، ان سے بھی پردہ ہوگا اگر یہ بالغ ہوں،

مردوں میں جو نابالغ ہوں یا کم عقلی کی وجہ سے عورت مرد کی اس کو تمیز نہ ہو اور نہ عورت سے اس کو کوئی رغبت ہو، ان سے پردہ ضروری نہیں ہے بقیہ تمام بالغ مردوں سے پردہ عورت کے لئے ضروری ہے گو وہ بوڑھا ہو، عنین ہو یا وہ مجبوب ہو،

جن کے سامنے ابداء زینت کی اجازت ہے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ خواہ مخواہ کیا ہی جائے ہاں ان کے سامنے کسی وجہ سے ظاہر ہو جائے تو شرعاً مضائقہ بھی نہیں ہے مگر جن حصوں کا کھولنا جائز ہے وہ ہتھیلیاں اور چہرہ ہے، جیسا کہ اوپر قرآن کی آیت گذر چکی ہے اور زیادہ سے زیادہ محرم کے سامنے وہ اعضاء بھی ضرورتاً کھولے جا سکتے ہیں جن میں زیورات پہنے جاتے ہیں میری مراد کان، بازو اور گردن وغیرہ سے ہے ہاں شوہر سے کسی حصہ کا اخفا ضروری نہیں ہے، البتہ ادب یہ ہے کہ ایک دوسرے کی شرمگاہ نہ دیکھے۔

مخنث عورتوں میں آئے مخنث کو بھی عورتوں میں آنے کی اجازت نہیں ہے، ابتداء میں اجازت تھی، ایک مخنث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں آتا تھا، لوگوں کو خیال تھا کہ اس کو عورتوں کی ذات میں کوئی توجہ نہیں، مگر تجربہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس کو بھی عورتوں کے حسن و جمال سے مناسبت ہے، چنانچہ وہ بیٹھا ایک دن، کسی عورت کی آمد کا نقشہ کھینچ رہا تھا اس کی خبر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو آپ نے فرمایا

الا اری ھذا یعلم ما ھھنا لا یدخلن   یہ یہاں کی باتیں جانتا ہے اب یہ تمہارے پاس نہ آنے

علیکم (ابن کثیر ۲۸۵ ج ۳)

بلائے۔

مراہق کے لئے ہدایت | اور اس کے بعد اسے عورتوں میں آنے سے روک دیا گیا، شریعت مطہرہ نے مراہق (یعنی قریب البلوغ) لڑکے کو بھی عورتوں میں آنے کی اجازت نہیں دی اور نہ عورتوں کو ان کے سامنے ابداء زینت کی، مراہق کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

ایاکم والدخول علی النساء (مشکوٰۃ باب النظر الی المخطوبہ)

عورتوں کے پاس آنے جانے سے پرہیز کرو

شوہر کے عزیز و قریب سے اجتناب | شوہر کے رشتہ داروں کے سامنے ہونے اور مذاق کرنے کا جو رواج ہندوستان میں ہے وہ بھی شریعت کی تعلیمات کے خلاف ہے، وہ شوہر کا بھائی ہو یا کوئی اور عزیز، محرم میں صرف شوہر کا باپ داخل ہے، دوسرا کوئی نہیں، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شوہر کے عزیز و قریب (جیسے بھائی وغیرہ) کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا،

الحمو الموت (مشکوٰۃ باب النظر الی المخطوبہ)

شوہر کے رشتہ دار عزیز (بھائی وغیرہ) موت ہیں

کسی مرد سے تنہائی میں نہ ملے | اسلام ان تمام خطروں سے عفت و عصمت کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے، جن سے عفت پر حرف آسکتا ہے، کسی مرد کا عورت سے تنہائی میں ملنا جس قدر خطرہ کا باعث ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے پھر مزید اس سے تہمت جو خواہ مخواہ آئے گی وہ بھی پوشیدہ نہیں، اس لئے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا، ارشاد نبوی ہے۔

لا یخلون رجل بامرأۃ الا کان ثالثھما الشیطان (مشکوٰۃ ۲۶۹)

کوئی مرد کسی عورت سے تنہائی میں نہیں ملتا ہے مگر تیسرا شیطان موجود رہتا ہے

ایسی حالت میں شیطان جانبین کی شہوت میں ابھار پیدا کرنے کی سعی کرتا ہے، اور مرد و عورت دونوں کے قلب میں برائی کا وسوسہ ڈالتا ہے، یہاں کامیابی نہیں ہوئی، تو کسی تیسرے کو بہکاتا ہے کہ ان کے حق میں سوئے ظن کا اظہار کرے، اور اس طرح ناکردہ گناہ میں کلنک کا ٹیکہ لگانا چاہتا ہے

اس تہذیب زمانہ میں برائی کا سبب بہت کچھ یہی طریقہ ہے، کہ عورتیں بے باکانہ تنہائی میں اجنبی مردوں سے ملتی ہیں، اور باتوں باتوں میں مرد عورت پر اپنی محبت کا غلط سکہ بٹھانا چاہتا ہے

جن کے شوہر گھر میں نہ ہوں ان سے بچو | ایک حدیث میں ہے کہ ان عورتوں کے پاس ملنے کے لئے نہ جایا کرو، جن کے شوہر گھر میں نہیں ہیں، اور اس ممانعت کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ شیطان خون کی طرح دوڑتا رہتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ شہوت میں تحریک پیدا کر دے،

فان الشیطان یجری من احدکم مجری الدم (مشکوٰۃ ص ۲۶۹) | اس لئے کہ شیطان تم میں خون کے دوڑنے کی طرح دوڑتا رہتا ہے

اسی حدیث میں ہے کہ راوی نے خود ذات بابرکت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق استفسار کیا تو آپ نے فرمایا میرا بھی یہی حال تھا، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے شیطان پر مجھے غلبہ حاصل ہو گیا اور اب اس سے ہر طرح محفوظ ہوں

ومنی ولکن اللہ اعاننی علیہ فاسلم (مشکوٰۃ ص ۲۶۹) | اور میرا بھی یہی حال تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اعانت فرمائی اب وہ تابع ہے

ان حدیثوں کی روشنی میں مرد و عورت کی باہمی کشش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے موجودہ دور میں جو کچھ فتنے پیدا ہوتے رہتے ہیں ان سے بھی اس کی پوری تائید ہوتی ہے اور ہر ذی عقل حدیث کے اس نقطۂ نظر کے ماننے پر مجبور ہے

جدید تحقیقات ہماری تائید میں | اب تک اس باب میں قرآن پاک احادیث اور عقل انسانی کی روشنی میں بحث کی گئی مگر کچھ لوگوں کی اس وقت تک تسکین نہیں ہوتی، جب تک وہ اہل یورپ کی رائے نہیں ملاحظہ کر لیتے چنانچہ ایسے روشن خیال طبقہ کے لئے انسائیکلوپیڈیا وغیرہ کے حوالہ سے کچھ اقوال نقل کئے جاتے ہیں جن سے ہمارے مطمح نظر کی مزید تائید ہوتی ہے۔

رومن امپائر جو تمام یورپ کی ماں ہے اور جو حکومت تمدن و تہذیب کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھی، یہاں رومن امپائر میں بھی عروج و ترقی کے زمانہ میں عورتیں پردہ ہی میں رکھی جاتی تھیں، ان کو باہر کے کاموں سے کوئی مناسبت نہ تھی، انیسویں صدی کی انسائیکلوپیڈیا میں مذکور ہے

رومانیوں کی عورتیں بھی اسی طرح کام کاج پسند کرتی تھیں، جس طرح مرد پسند کرتے ہیں، اور وہ اپنے گھروں میں

کام کرتی رہتی تھیں، ان کے شوہر اور باپ بھائی صرف میدان جنگ میں سرفروشی کرتے رہتے تھے، خانہ داری کے کاموں سے فراغت پانے کے بعد عورتوں کے اہم کام یہ تھے، کہ وہ سوت کاتیں اور اون کو صاف کر کے اس کے کپڑے بنائیں، رومانی عورتیں سخت پردہ کیا کرتی تھیں، یہاں تک کہ ان میں جو عورت دایہ گیری کا کام کرتی تھی، وہ اپنے گھر سے نکلتے وقت بھاری نقاب سے اپنا چہرہ چھپالیتی اور اس کے اوپر ایک موٹی چادر اوڑھتی جو ایڑی تک لٹکی رہتی پھر اس چادر پر بھی ایک عباء اوڑھی جاتی جس کے سبب سے اس کی شکل کا نظر آنا تو کیا جسم کی بناوٹ کا بھی پتہ لگنا مشکل ہوتا تھا۔[1]

عورتوں کی بے پردگی کا نتیجہ

اس دور میں اس ملک اور قوم کی ترقی و عروج کا آفتاب نصف النہار پر تھا، تمام شعبہ ہائے زندگی میں سب سے فائق تھے، مگر ٹھیک یہی زمانہ تھا کہ ان کو عیش پرستی اور لہو لعب کا شوق پیدا ہوا اور پھر اس سلسلہ میں مردوں نے اپنی ہر مجلس نشاط میں عورتوں کو شریک کرنا چاہا، کہ ان کے بغیر مجلس سونی اور بے رونق معلوم ہو رہی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں کو پردہ کی قید سے باہر نکالا، اور ان کے دامن عصمت کو داغدار بنانے کی سعی کی، اور کچھ ہی دنوں میں ان کی عورتیں ناچ و رنگ کی محفلوں میں کھل کر آگئیں پھر رومانی حکومت کا کیا حشر ہوا؟ کہ بربادی شروع ہو گئی، اور ساری عظمت و شوکت کی عمارت زمین پر آگئی اور بلا شبہ اس بربادی کا بڑا سبب عورتوں کی آزادی ہی تھی، تاریخ کی روشنی میں علامہ فرید وجدی تحریر فرماتے ہیں۔

"مگر بات یہ ہوئی کہ جب انھیں بے پردہ بنایا گیا تو اقتضائے فطرت مردان پر مائل ہونے لگے اور اس کے لئے آپس میں کٹنا مرنا شروع کر دیا، یہ ایک ایسی سیاسی حقیقت ہے جس کے ماننے میں کوئی شخص بحث ہی نہیں کرسکتا ہے"[2]

علامہ لوئس سیرول نے ریویو آف ریویوز جلد ۱۱ میں "پولٹیکل فساد" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے، اس میں کہتا ہے "کہ اعلیٰ درجہ کے اخلاق کی بنیادیں منہدم کرنے میں سب سے زبردست کارکن عورت رہی ہے"[3]

پھر آگے چل کر رقمطراز ہے۔

---

[1] مسلمان عورت صفحہ ۱۵۷ [2] ایضاً صفحہ ۱۵۸ [3] ایضاً

"رومانی جمہوری حکومت کے پچھلے دور میں مدبرانِ سلطنت اور اعیان مملکت نازک مزاج اور عیش پسند عورتوں کی صحبت بہت پسند کرنے لگے تھے، اور ایسی عورتیں ان دنوں بکثرت پائی جاتی تھیں۔"[1]

مرد و عورت کے آزادانہ میل جول کا انجام

پھر عورتوں کے بے پردہ ہونے اور آزادی پانے کے بعد ملک کی کیا حالت ہوئی تاریخ میں پڑھئے، عورتوں کی آزادی کی وجہ سے ملک کا اخراجات بہت زیادہ بڑھ گیا، فتنہ و فساد کے چشمے اُبلنے لگے، ان کے اخلاق و اعمال نے تعفن پیدا کر دیا، اور پھر ہوا یہ کہ

"عورت و مرد کے اس آزادانہ میل جول کی وجہ سے روما والوں میں جیسی کمینہ عادتیں اور گندہ خصلتیں پیدا ہو گئی تھیں مرا قلم ان کے لکھنے سے شرماتا ہے، جن سے ان کی ہمتیں مردہ ہو گئیں، ارادے پست ہو گئے اور طبیعتوں میں کمینہ پن آگیا، پھر تو ان میں باہمی چشمک اور خونریزی (خانہ جنگی) کا زور ہوا، اور یہ فساد اس قدر بڑھا کہ انسانیت اور اخلاق کا ان میں نام تک نہیں رہ گیا۔"[2]

یہ ایک تاریخی واقعہ تھا، جو آپ کے سامنے پیش کیا گیا، مگر عرض یہ کرنا ہے، کہ عورتوں کے متعلق حجاب کا جو خداوندی قانون ہے، تجربات کی روشنی میں اہل یورپ کے بڑے بڑے علماء نے بھی اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے، چنانچہ فلسفہ حسی کا موسس اگسٹ کونٹ اپنی مشہور تصنیف "النظام السیاسیہ علی حسب الفلسفہ الحسیہ" میں لکھتا ہے۔

"جس طرح ہمارے زمانہ میں عورتوں کی سوشیل حالت کے متعلق خیالی گمراہیاں پیدا ہو رہی ہیں اسی طرح تغیر نظام تمدن اور آداب معاشرت کے ہر ایک دور میں پیدا ہوتی رہی ہیں مگر وہ لاز آف نیچر جو جنس محب (عورت) کو منزلی زندگی کے لئے مخصوص رکھتا ہے، اس میں کبھی کوئی اہم تغیر واقع نہیں ہوا، یہ قانون الٰہی اس درجہ صحیح اور محقق ہے کہ گو اس کی مخالفت میں سیکڑوں باطل خیالات قائم ہوتے رہے مگر بغیر کسی نقصان یا تغیر کے سب پر غالب آتا رہا۔ . . . . مردوں کے مشاغل میں عورتوں کی شرکت سے جو خوفناک نتائج اور فساد پیدا ہو رہے ہیں، ان کا علاج یہی ہے، کہ دنیا میں جنس عامل (مرد) پر جنس محب (عورت) کے جو مادی فرائض ہیں، ان کی حد بندی اور تعیین کر دی جائے مرد پر واجب ہے کہ عورت کے تغذیہ کا انتظام کرے یہی وہ قانون طبعی اور ناموس الٰہی ہے، جو جنس محب کی اصلی زندگی کو منزلی دائرہ میں محدود کرتا ہے، یہی وہ قاعدہ ہے جو ہیئت اجتماعی کے خوفناک و مہیب اشکال کو احسن و اکمل کر دیتا ہے، یہی وہ قانون ہے جو عورت کو اپنے طبعی جذبات سے ترقی نوع انسانی . . ."

---

[1] مسلمان عورت صفحہ ۱۵۶ [2] ایضاً صفحہ ۱۶۶ [3] مسلمان عورت صفحہ ۶۴ و صفحہ ۶۵

مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ

از

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات)

(۲)

بہر حال اصولی اور بنیادی اختلافات جن کی وجہ سے مسلمانوں کے کسی دینی فرقہ نے اپنی دینی زندگی اور اس کے نتائج کو دوسرے مسلمانوں کی دینی زندگی اور اس کے نتائج سے الگ کر لیا ہو تفرق اور تفار بعید کے اس حال کی پیدائش میں ممکن ہے، ڈھونڈھنے والوں کو دوسرے اسباب کا بھی سراغ مل جائے لیکن عام حالات میں کم از کم میرا خیال یہی ہے اور اپنے محدود مطالعہ سے اسی نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ اندرونی اسباب میں تو زیادہ اثر ان سیاسی اختلافات کا پڑا ہے جن پر ابتداءِ اسلام کے خاص پیدا کردہ ماحول کی وجہ سے مذہب اور دین کا رنگ چڑھا دیا جاتا تھا۔ کھیلنے والے دراصل سیاسی کھیل کھیلنا چاہتے تھے لیکن اپنے کھیل میں اس وقت تک وہ کامیاب نہیں ہو سکتے تھے جب تک کہ مذہب کا لبادہ اوپر سے سیاسی اغراض پر اڑھا نہ دیا جاتا،

اسی طرح بیرونی اسباب میں سب سے زیادہ نمایاں سبب وہی نظر آتا ہے کہ اوہام و اغلاط جن میں قبل الاسلام کے ادیان لت پت تھے۔ اور ان ہی سے پاک کرنے کے لئے خالقِ کائنات نے اپنے بندوں میں آخری رسول کو اٹھایا تھا، قرآن کے اتارنے کا بڑا مقصد یہی یہ تھا کہ انسانی زندگی کا وہ قدرتی آئین جن آسمانی کتابوں کے ذریعہ سے انسانی گھرانوں میں وقتاً فوقتاً نافذ ہوتا رہا تھا ان کتابوں میں من مانے خیالات شریک کر دئے گئے تھے۔ اپنے پیدا کرنے والے خالق کی خالص مرضی کے مطابق جی کر جو مرنا چاہتے تھے۔ ان کے لئے تسلی اور تسکین کا کوئی قابلِ اعتبار ذریعہ دنیا میں کسی قوم اور ملک میں آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر باقی نہ رہا تھا بطور آخری اڈیشن کے قرآن نازل کیا گیا تاکہ اپنے موروثی ادیان،

اور آبائی مذاہب کی مشکوک کتابوں کو قرآن پر پیش کر کر کے شک سے نکل کر یقین کی ٹھنڈی روشنی میں آ جائیں داخل ہونے والے اسلام میں عموماً داخل بھی اسی لئے ہوئے تھے لیکن ان میں سب کا حال ایک جیسا نہیں تھا، عزم میں جن کے خامی تھی، حوصلے جن کے زیادہ بلند نہ تھے۔ اس انس اور الفت کے ازالہ پر جیسا کہ چاہیے تھا قادر نہ ہو سکے جس کی تطہیر و تزکیہ کی اس راہ میں بہر حال ضرورت تھی۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعوری اور زیادہ تر غیر شعوری طور پر آبائی اوہام و اغلاط اور اسلامی تعلیمات میں تطبیق و توفیق کی بیہودہ کوششوں میں وہ مشغول ہو گئے، اسی نامبارک سعی نے اور غلط اقدام نے عجیب و غریب نظریات و خیالات کو مسلمانوں میں پھیلا کر مختلف ٹولیوں میں ان کو بانٹ دیا تھا، "دین اسلامی" کی تاریخ کا یہ بڑا مبسوط مضمون ہے۔ تاہم بقدر ضرورت اس سلسلہ میں جو کچھ پیش کیا جا چکا ہے۔ اگر پڑھنے والوں نے توجہ سے اس کو پڑھ لیا ہے تو شاید وہ بھی اسی نتیجہ تک پہنچ چکے ہوں گے جس نتیجہ تک مرے مطالعہ اور جستجو نے مجھے پہنچایا ہے۔

اس کے بعد خود سوچنا چاہئے، کہ سیاسی جوڑ توڑ کے لئے مذہبی سوانگ اختیار کرنے والوں نے جن فرقوں کو مسلمانوں میں پیدا کر دیا تھا، ان کا جو انجام ہوا، اس کے سوا دوسرا انجام ان کا آخر ہو ہی کیا سکتا تھا، یہ سیاسی قصے زمانہ کی رفتار کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ میدان میں ایک پارٹی آتی ہے، کھیلتی ہے، ہنگامے مچاتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے، انسانیت کی تاریخ سیاسی بازی گریوں کے ان تماشوں سے بھری ہوئی ہے، مسلمانوں کی تاریخ میں بھی یہی کھیل کھیلے گئے ہیں۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی شاطروں کے ساتھ شطرنج کی وہ بساط بھی الٹتی چلی گئی، جو وقتاً فوقتاً بچھتی رہی اور ان کے ساتھ وہ فرقے بھی ختم ہوتے چلے گئے جو پیداواری تھے، ایک ایسے زمانہ کے سیاسی ہنگاموں میں جس میں مذہب کی چھاپ کے بغیر کوئی چیز چل ہی نہیں سکتی تھی۔ آخر آج ان ازراقہ کو ہم کہاں ڈھونڈیں، جو کہتے پھرتے تھے کہ "دینی نصب العین" اور "اقامتِ حق" کی جو مہم ہم لوگوں نے اٹھائی ہے جو اس میں شریک نہ ہوگا خواہ ہمارے دشمنوں کی مدد بھی نہ کرے۔ ناطرفدار ہی رہے لیکن وہ بھی اسلامی دین کے دائرے سے خارج ہو گیا اور اپنا ٹھکانہ اس نے جہنم کو بنا لیا

انہ کفر القعدۃ وھو اول ما اظھر البراءۃ من القعدۃ علی القتال وان کان موافقا علی دینہ وکفر من لم یھاجر الیہ صد ۱۲۹ شہرستانی ج ۱	ازراقہ کا لیڈر ابن ازرق پہلا آدمی تھا جس نے ان لوگوں کو کافر قرار دیا۔ اس کی سیاسی کشمکش میں جن لوگوں نے ساتھ نہیں دیا تھا اور ان لوگوں سے اپنے دین کو اس نے جدا کر لیا۔ خواہ دین کے دوسرے معاملات میں وہ ان کے ہمنوا ہی کیوں نہ ہوں، ازراقہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہجرت کر کے جو ان کے ساتھ آ کر نہ ملا ایسا مسلمان کافر ہو گیا۔

یہی ان کا سیاسی کہئے، یا دینی عقیدہ تھا۔

یا ان غریب "نجدات عاذریہ" کا سراغ دنیا کے کس گوشہ میں لگایا جا سکتا ہے جو گویا مسلمانوں کے نہلسٹ تھے اور کہتے پھرتے تھے کہ

لاحاجۃ للناس الی الامام قط انما علیھم ان یتناصفوا فیما بینھم صد ۱۳۲ ج ا ش	امام (یعنی کسی منظم حکومت) کی کوئی ضرورت نہیں ہے لوگوں پر صرف یہ فرض ہے کہ آپس کے معاملات کو انصاف کے ساتھ خود چکا لیا کریں،

جہاں اس فرقہ کا لیڈر نجدہ بن عامر گیا، وہیں یہ سیاسی عقیدہ بھی دفن ہو گیا جس پر دینی اعتقاد کا خول اوپر سے مڑھ دیا گیا تھا،

بتایا جائے کہ مسلمان بادشاہوں اور ائمہ کے مقابلہ میں جنہوں نے یہ فیصلہ کر کے اسی کو اپنا دین بنا لیا تھا کہ

"ہم بادشاہوں، اور صرف ان مسلمانوں کے قتل کو مذہبی فرض خیال کرتے ہیں، جو ان حکمرانوں کے حامی اور مددگار ہیں، اور ان کے احکام کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن جو حکمرانوں پر اعتراض کرتے ہیں اور ان سے راضی نہیں ہیں، ان مسلمانوں کو ہم قتل نہیں کریں گے، ہاں! ان حکومتوں کی طرف سے جاسوسی کا کام جو انجام دے گا، ہم اس کو بھی تلوار کے حوالہ کریں گے۔" صد ۱۳۲ ج ا شہرستانی

میمونیہ فرقہ جس کا قائد میمون بن خالد تھا، اس کا یہی عقیدہ تھا لیکن نہ اب میمون ہی دنیا میں زندہ ہے اور نہ بے چارے میمونیہ، عرب کے بیابان میں اپنے لیڈر کے ساتھ وہ بھی گم ہو گئے،

عبداللہ بن ایاض جس کا دعویٰ تھا کہ

"قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے والوں میں جو ہمارے مخالف ہیں۔ ہم ان کو مشرک تو نہیں سمجھتے لیکن چونکہ ہمارے مخالف ہیں اس لئے کافر قرار دے کر ان کے مال کو مال غنیمت ہم بنا سکتے ہیں اور ان کے ہتھیار اور گھوڑے چھین لیں گے، اگرچہ اسی کے ساتھ ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح بھی جائز ہے اور ان کے مال کے ہم وارث بھی بن سکتے ہیں"

مسلمانوں کے ممالک کے متعلق ان کا خیال تھا کہ دار الاسلام تو نہیں لیکن دار التوحید ان کو کہنا چاہئے لیکن حکومت کی فوجی چھاؤنیاں جن علاقوں میں قائم ہیں وہ دار التوحید بھی نہیں ہیں۔ بلکہ دار التقی ہیں" صفحہ ۱۰۱

بتایا جائے کہ اسی ابن ایاض کی طرف منسوب کر کے "ایاضیہ" نامی جس فرقہ کا ذکر کیا جاتا ہے کتابوں کے سوا سطح زمین پر کہاں مل سکتا ہے؟

اسی طرح حالات نے اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی میں اس قسم کے خیال کے لوگوں کو جو پیدا کر دیا تھا، جنہوں نے دنیا کو دو۲ حصوں میں بانٹا تھا جہاں اسلامی احکام کا اعلان و اظہار کھلے بندوں بے روک ٹوک جاری ہو، ان علاقوں کا نام ان کی اصطلاح میں "دار العلانیہ" تھا، اور جہاں مسلمانوں کو اس قسم کی آزادی حاصل نہ ہو، اس کا نام انھوں نے "دار التقیہ" رکھ دیا تھا، اس تقسیم کے ساتھ یا اس کے بھی قائل تھے کہ

"دار التقیہ میں مسلمان عورتوں کا نکاح اپنی قوم کے ان افراد کے ساتھ جائز ہے۔ جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا مگر دار العلانیہ میں اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی" صفحہ ۱۲۳ جز اش،

اور ان باتوں کی تفصیل کہاں تک کی جائے حد یہ ہے کہ اس قسم کے روشن خیال بھی ان ہی سیاسی جھگڑوں سے مسلمانوں میں پیدا ہو چکے تھے جو کہتے تھے کہ

اسلام کے دینی اصطلاحات کی شرح مصلحتِ وقت کے مطابق کرنے کا ہمیں اختیار ہے، یہ ہو سکتا ہے کہ ہم

کعبہ کے حج کی تشریح کرتے ہوئے یہ کہیں کہ کعبہ عرب میں نہیں ہے بلکہ لعلّہا بالھند (بلکہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں ہو)، ص ۱۲۶

تشریح کے ان اطلاقی اختیارات کے ساتھ مسلمان صرف وہ اپنے آپ ہی کو سمجھتے تھے۔ یہ دعویٰ "غسانیوں" کا تھا جن کا لیڈر غسان الکوفی تھا

سچی بات تو یہ ہے کہ خوارج جن کے متعلق سنا جاتا ہے، کہ اب بھی ان کی تھوڑی بہت تعداد عرب کے بعض ساحلی علاقوں (مسقط، عمان) وغیرہ میں پائی جاتی ہے، اور مغرب اقصےٰ (مراکش وغیرہ) کے کوہستانی خطوں میں سیاحوں کا بیان ہے کہ قدیم خارجیوں کے نام لیواؤں سے ان کی ملاقات ہوئی تھی، نہیں کہا جا سکتا کہ دور افتادہ گوشوں میں واقعی ان خارجیوں کی صحیح تعداد کیا ہے کچھ بھی ہو لیکن چند لاکھ تک بھی ان کی گنتی اگر پہنچ جائے تو شاید اس سے زیادہ تخمینہ ان کا کیا بھی نہیں جا سکتا،

چند لاکھ ان خوارج کے بعد ابتداء اسلام کی سیاسی کش مکش سے پیدا ہونے والے اسلامی فرقوں میں کوئی فرقہ صحیح معنوں میں اگر باقی رہ گیا ہے، تو وہ شیعوں کا فرقہ ہے۔ لیکن "شیعہ" کے اسی لفظ میں میرا خیال ہے کہ سیاسی قصوں سے پیدا ہونے والے دینی فرقوں کی تاریخ پوشیدہ ہے،

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اب تو "شیعہ" کے اس لفظ سے جیسا کہ سب جانتے ہیں مسلمانوں کا ایک خاص فرقہ سمجھا جاتا ہے لیکن درحقیقت اسلام کی ابتدائی صدیوں کی سیاست کی یہ ایک سیاسی اصطلاح ہے۔ یعنی موجودہ زمانہ میں "پارٹی" کے لفظ سے جو کچھ سمجھا جاتا ہے یہی مفہوم "شیعہ" کے اس لفظ کا اس زمانہ میں تھا، اسلامی تاریخ کا تھوڑا بہت مطالعہ بھی جن لوگوں نے کیا ہے وہ اس سے واقف ہیں۔ مثلاً اس موقعہ پر بے ساختہ ابن عساکر کی تاریخ دمشق کی ایک بات یاد آگئی، عباسیوں کا دوسرا خلیفہ ابوجعفر منصور اپنے دربار میں بیٹھا ہوا تھا، اچانک درباریوں کی طرف خطاب کر کے ایک دن اس نے دریافت کیا،

حجاج (مشہور ظالم است) کا وصیت نامہ کسی کو یاد ہے؟

دنیا کی عام تاریخ کے متعلق تو میں دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن مسلمانوں کی تاریخ میں ڈکٹیٹرشپ

کے طریق حکمرانی کا حجاج اپنے وقت میں شاید سب سے بڑا امام تھا بنی امیہ کی حکومت کے حکمرانوں کو اسی لئے مطلق العنان ڈکٹیٹر کی حیثیت سے خود بھی مانتا تھا اور چاہتا تھا کہ دوسرے بھی ان کو حکومت کا ڈکٹیٹر ہی تسلیم کریں۔ اس باب میں ہلکی سی مخالفت اس کے لئے ناقابل برداشت تھی، واقعات کا ایک ذخیرہ اس باب میں تاریخ کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ اپنے اسی نقطۂ نظر سے مرتے ہوتے حجاج نے وصیت نامہ لکھوایا تھا جس میں کلمۂ شہادت کے بعد تھا۔

"ولید بن عبدالملک (جو اس کے زمانہ میں بنی امیہ کا حکمراں تھا) اس کی فرماں برداری، اور طاعت کے سوا حجاج اور کچھ نہیں جانتا، اسی عہد پر وہ زندہ رہا اور اسی عہد پر وہ مرا، اور اسی عہد پر قیامت کے دن وہ اٹھے گا

وصیت نامہ کے عربی الفاظ جن کا ترجمہ میں نے درج کیا ہے، ابوجعفر منصور نے ان کو سن کر دربار والوں سے کہا کہ

هٰذه واللّٰه الشيعة لا شيعتكم　　　　یہ ہے شیعہ، نہ کہ تمہارے شیعہ

(تاریخ دمشق ابن عساکر ص۸۱ ج۴)

مطلب یہ تھا کہ پارٹی کے ساتھ وفاداری کی اصل حقیقت یہ ہے، کہ زندگی موت، دنیا اور آخرت تک سب وفاداری کے جذبات میں غرق ہو جائیں۔ ابوجعفر کو اپنی پارٹی سے شکایت تھی کہ ہمارے شیعہ یعنی پارٹی میں وفاداری کا یہ بے پناہ جذبہ نہیں پایا جاتا۔

میں ابوجعفر منصور کے ان ہی الفاظ کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں، اس زمانہ کی ایک سیاسی

لے ولید بن عبدالملک کے دریافت کرنے پر حجاج نے خود ہی کہا تھا کہ لبنان اور سنیر (شام کا ایک پہاڑ) اگر ان دونوں پہاڑوں کے برابر زر خالص مجھے مل جائے اور سب کو خدا کی راہ میں خرچ کر دوں، جب بھی میری یہ نیکی اس اطاعت اور فرماں برداری کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے جو میرے دل میں آپ کی طرف سے پائی جاتی ہے، اس نے کہا کہ مسلمانوں کا جتنا خون بھی اس سلسلہ میں یعنی ولید کے لوگ مطیع ہو جائیں، میں نے بہایا ہے اس خون کی نہ مجھے پروا ہے اور نہ اس کا خوف یاد رکھنا چاہیے کہ ایک لاکھ سے زائد مسلمانوں کو ستونوں میں باندھ کر اس ظالم نے اسی سلسلہ میں قتل کرایا تھا، کہتا تھا کہ اللہ سے ڈرنے یعنی تقوی کے لئے تو فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ فرمایا گیا ہے لیکن اسی کے بعد وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا (سنو اور اطاعت کرو) کے حکم کو قرآن نے استطاعت کے ساتھ مشروط نہیں کیا ہے ۱۲ ص۸۶ ج۴ ابن عساکر

اصطلاح اس سے سمجھ میں آتی ہے یعنی اہل بیت نبوت یا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حامیوں کی پارٹی ہی کو شیعہ نہیں کہتے تھے بلکہ "شیعہ" کا لفظ عام تھا جس کی اضافت عباسیوں، امویوں اہل بیت وغیرہ سب ہی کی طرف کی جاتی تھی، بنی امیہ کے حامیوں اور پارٹی والوں کو شیعہ بنی امیہ، عباسیوں کی پارٹی والے شیعہ بنی عباس کہلاتے تھے۔ جیسے شیعہ علی یا شیعہ اہل بیت ان لوگوں کی تعبیر تھی، جن پر اب مطلق "شیعہ" کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال اسی لئے تو پیش آئی کہ سارے مضاف الیہ جس کی طرف شیعہ کا یہ لفظ منسوب ہو کر استعمال ہوتا تھا یکے بعد دیگرے ختم ہوتے چلے گئے، تاآنکہ "پارٹی" یا "شیعہ" ہونے کی حیثیت سے صرف وہی لوگ رہ گئے، جو اپنے آپ کو اہل بیت اور حضرت علیؓ کی پارٹی میں شمار کرتے تھے۔

اور یہی میرا مقصد ہے کہ "شیعہ" کے لفظ کا جو مفہوم اب ہو گیا ہے یہ خود بتا رہا ہے کہ مسلمانوں کی بے شمار سیاسی پارٹیاں پیدا ہو ہو کر ختم ہوتی چلی گئیں، وہی جنہوں نے مذہب کا چولا پہن لیا تھا، لے دے کر صرف ایک پارٹی وہی اہل بیت کی حمایت کا دعویٰ کرنے والی باقی رہ گئی ہے۔ جن کو ہم اب "شیعہ" کہتے ہیں۔

اور سیاسی راہ سے پیدا ہونے والے فرقوں میں تو خیر شیعوں کا یہ فرقہ باقی بھی رہ گیا ہے لیکن اسلامی دین کے دائرے میں داخل ہونے والی قوموں کے جن مذہبی الانشیوں سے متاثر ہو کر مسلمانوں میں جو فرقے پیدا ہوئے تھے ان کا حال تو اس سے بھی زیادہ عجیب ہے اور تو اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ ماتونی منہ زور قلم کے دھنی جیتی فرقہ معتزلہ کا تھا، جسے وقتاً فوقتاً عباسی حکومت کی پشت پناہی بھی حاصل ہوتی رہی، بعض خلفاء پر بھی اعتزالی رنگ چڑھ گیا تھا اور وزراء، قاضی القضاۃ وغیرہ جیسے اقتداری عہدوں پر بھی اس فرقے کے فضلاء وعلماء قابض رہے ان کے ہاتھ میں قلم کے ساتھ تلوار، اور تلوار کے ساتھ قلم بھی تھا، معرکۃ الآراء کتابیں اپنے خیالات وعقائد کی تائید میں اس فرقہ کے اہل قلم نے لکھیں، یہ سب کچھ ہوا مگر بقول علامہ طاش کبری زادہ

کان علم الکلام بایدی المعتزلۃ مائتی سنۃ مابین المائۃ والثلاث مائۃ	معتزلہ کے ہاتھ میں علم کلام کی باگ دو سو سال تک رہی، یعنی پہلی صدی سے اور تیسری صدی کے درمیان میں
ص۳۴ مفتاح السعادہ	

گویا تیسری صدی سے معتزلہ کا زور ختم ہونے لگا، اور آج حال یہ ہے کہ بجز چند غیر کلامی کتابوں کے مثلاً زمخشری کی تفسیر کشاف، یا لغت کی بعض کتابوں کے سوا دنیا کے کتب خانوں میں فرقہ معتزلہ کے مصنفین کی ان کتابوں کا ایک ورق بھی مشکل ہی سے مل سکتا ہے جو اعتزالی عقائد و خیالات کی تائید میں لکھی گئی تھیں آج اس فرقہ کے متعلق ہم جو کچھ بھی جانتے ہیں، وہ صرف اہل السنت والجماعت کی کتابوں کا صدقہ ہے کہ تردیداً جواب دینے کے لئے انھوں نے اعتزالی عقائد کا تذکرہ اپنی کتابوں میں کر دیا تھا اور جب معتزلہ کا یہ حشر ہوا تو نسبتاً جن فرقوں کے پاس نہ معتزلہ کی قوت تھی نہ دولت، نہ علم نہ فضل، بھلا وہ بے چارے کیسے زندہ رہ سکتے تھے۔

مرا تو خیال یہی ہے کہ جیسے جیسے نسلیں گذرتی گئیں ان کا تعلق تدریجاً ان اوہام و خرافات سے کمزور ہوتا چلا گیا، جنہیں ان کے آباء و اجداد اپنے ساتھ لاتے تھے۔ خالص اسلامی تعلیمات کی روح سے پُسنت اپنے اسلاف کے اخلاف زیادہ قریب ہوتے چلے گئے تا اینکہ وہ وقت بھی آ گیا کہ سارے موروثی رجحانات، نومسلم خاندانوں سے مٹ مٹا کر ختم ہو گئے، اس راہ سے پیدا ہونے والے فرقوں کا صرف نام ہی نام اب کتابوں میں رہ گیا ہے اس سلسلہ میں معتزلہ ہی کیا دنیا کے پردے پر کرامیہ مُرجیہ جہمیہ وغیرہ وغیرہ کہاں مل سکتے ہیں؟ اس لحاظ سے بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے اور یہی کہنا چاہئے، کہ ایشیا و افریقہ بلکہ یورپ و امریکہ کے انسانوں میں "اسلامی برادری"، قرآن کی بدولت جو قائم ہو گئی ہے اور ستر کروڑ سے پچاس کروڑ تک اس قرآنی برادری میں شریک ہونے والوں کی تعداد کا تخمینہ آج کیا جا رہا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس امت میں شیعوں کے سوا صرف ایک فرقہ اہل السنت والجماعت ہی کا باقی رہ گیا ہے اس میں شک نہیں کہ خوارج کی طرح شیعوں کی تعداد ناقابل لحاظ نہیں ہے لیکن جہاں تک میرا تخمینہ ہے اہل السنت والجماعت کے مقابلہ میں ہزار میں ایک کی نسبت بھی شیعوں کی ثابت

ہو جائے تو اس سے زیادہ بڑا تخمینہ ان کے متعلق شاید کیا بھی نہیں جا سکتا گویا مسلمانوں میں ایسے فرقے جن کے اختلافات بنیادی اختلافات قرار دئے جا سکتے ہیں لے دے کر صحیح معنوں میں ان ہی دو فرقوں کے اندر منحصر ہو کر رہ جاتے ہیں اور خواہ مخواہ خوارج کا بھی اضافہ کر لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ اس نوعیت کے فرقوں کو بہر حال تین سے زیادہ تو کسی طرح آگے بڑھایا نہیں جا سکتا افسوس ہے کہ تفصیل کا موقعہ نہیں ہے ورنہ بتایا جا سکتا تھا کہ اسلام ہی کی طرح دوسرے ادیان و مذاہب بھی زمین کے اسی کرے پر موجود ہیں ماننے والے ان کے انسان ہی ہیں لیکن ان میں ہر مذہب کے ماننے والے مبالغہ نہیں کر رہا ہوں آج بھی سینکڑوں فرقوں کی شکل میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان کے اختلافات کا حال یہ ہے کہ معبود پر بھی ان میں اتفاق نہیں ہے۔ ایک اگر شیو کا پجاری ہے تو دوسرا وشنو کا، ایک اگر بیٹا کا پجاری ہے، تو دوسرا ماں کا اور تیسرا فرقہ باپ کی عبادت کرتا ہے۔ مذاہب وادیان اور ان کے مختلف فرقوں کے حالات کا مطالعہ برہان کے پڑھنے والوں میں سے جنہوں نے کیا ہے وہی میرے اس اجمالی دعویٰ کی توثیق کر سکتے ہیں۔ بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ اس عنوان پر "مستقل مقالہ" ہی کاش لکھا جاتا، دوسرے مشاغل کے ساتھ سردست میرے لئے یہ کام آسان نہیں ہے۔

آخر میں ایک بات رہ گئی یعنی مسلمانوں میں حنفی، شافعی مالکی، حنبلی ناموں سے جو کچھ سمجھا جاتا ہے کیا اس کو "فرقہ بندی" کے نیچے ہم داخل کر سکتے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ قسط میں اسی پر بحث کی جائیگی اور اسی کا جواب دیا جائے گا۔

زمینداری اور جاگیرداری کا تاریخی پس منظر

از

(جناب مولوی محمد تقی الدین صاحب سنبھلوی (بارہ بنکی))

(۲)

زمانۂ خلافت کے ابن قطائع | ذیل میں چند ان لوگوں کے نام درج کئے جاتے ہیں جن کو رسول اللہ اور خلفاء راشدین نے قطائع دئے تھے۔

(۱) رسول اللہ نے ابو بکرؓ و عمرؓ کو قطعہ دیا تھا (الخراج لابی یوسف)

(۲) حضرت علقمہؓ کو حضر موت میں ایک زمین دی تھی (ترمذی)

(۳) حضرت زبیرؓ کو زمین کا ایک بڑا حصہ دیا تھا (الخراج لابی یوسف)

(۴) حضرت بلالؓ بن حارث کو "وادیِ عقیق" عطا کیا تھا (الاموال)

(۵) فرات بن حیان عجلیؓ کو "یمامہ" میں ایک زمین دی تھی (الاموال)

(۶) یمامہ کے بعض دوسرے لوگوں کو بھی بنجر زمین دی تھی "

(۷) عبد اللہ بن مسعودؓ کو مدینہ میں مکان دئے تھے (مشکوٰۃ)

(۸) ابو رافع کے خاندان کو بنجر زمین کا ایک بڑا حصہ دیا تھا (الخراج لابی یوسف)

(۹) انصار میں سے ایک شخص سلیطؓ نامی کو زمین دی تھی (الاموال)

(۱۰) عبد الرحمٰن بن عوفؓ کو زمین دی تھی (مسند امام احمد)

بنجر زمین کو قابلِ کاشت بنانے کے لئے رسول اللہ نے عام اعلان کر دیا تھا کہ زمین اللہ کی ہے اور انسان اللہ کے بندے ہیں جو شخص بھی بنجر زمین کو زیر کاشت لا سکتا ہے لائے وہ زمین اسی کی ملک ہو گی (نصب الرایہ: الخراج لابی یوسف)

رسول اللہ کے بعد خلفاء راشدین نے بھی اس سلسلہ کو قائم رکھا اور متعدد صحابہ مثلاً سعد بن وقاصؓ عبداللہ بن مسعودؓ۔ نافعؓ۔ خبابؓ۔ زبیرؓ۔ اسامہ بن زیدؓ۔ عمار بن یاسرؓ۔ سعد بن مالکؓ وغیرہ کو قطائع دئے۔ اور عام اعلان کردیا کہ جو شخص بھی بنجر زمین کو آباد کرے گا وہ اس کی ہو جائے گی (بخاری والاموال والخراجین)

زمانہ خلافت میں اس طرح بہت سی بنجر زمینیں لوگوں کے استعمال میں آگئی تھیں اس سلسلہ میں مزید سہولتوں کا پتہ حسب ذیل تصریحات سے چلتا ہے

حضرت عمرؓ نے بصرہ کے گورنر ابو موسیٰ اشعری کو "قطائع" کے بارے میں جو فرمان لکھا تھا اس کی دفعات یہ ہیں

(۱) "قطائع" دینے میں کسی کا نقصان نہ ہو

(۲) خراجی زمین نہ ہو (جو بالعموم کاشتکاروں کی ملکیت ہوتی تھی)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے گورنر کے نام یہ فرمان لکھا تھا۔

"جتنی خالصہ (سرکاری) آراضی ہو لوگوں میں تقسیم کردو اور پیداوار کی حیثیت کے مطابق خلافت کو جتنا بھی وہ ٹیکس ادا کریں اس کو منظور کرلو۔ اگر زمین زیادہ خراب ہے تو مفت دے دو۔ اور اگر آبادکاری کے لئے کوئی شخص نہ تیار ہو تو سرکاری خزانہ کے اخراجات سے کاشت کراؤ (مگر زمین خالی نہ رہنے دو)[1]

تاریخ کے طلباء پر یہ بات واضح ہے کہ جن بزرگوں کے نام قطائع کے سلسلہ میں درج کئے گئے ہیں وہ سب خدمتِ خلق کے لئے وقف تھے۔ ان کے علاوہ اہلِ قطائع کاشتکار ہوتے جو خود کاشت کرکے خود بھی منتفع ہوتے اور سرکاری ٹیکس کی ادائیگی کے ذریعہ مفادِ عامہ کی بھی خدمت کرتے تھے۔

تاریخِ خلافت میں ایک نظیر بھی اس کے خلاف نہیں پیش کی جاسکتی کہ قطعات کسی کے پاس عیش و آرام کے سامان بنے ہوں۔ چنانچہ قاضی ابو یوسف زمانہ خلافت کے تمام قطائع کے متعلق یہ کلیہ بیان کرتے ہیں۔

---

[1] الخراج لیحییٰ ص۲۳

بہت سی روایتیں اس بات کے ثبوت کے لئے موجود ہیں کہ رسول اللہ اور آپ کے بعد خلفاء نے لوگوں کو قطائع دئے تھے۔ رسول اللہ نے تالیفِ قلوب کے لئے اور آراضی کو قابل کاشت بنانے کے لئے قطائع دئے تھے۔ ایسے ہی خلفاء نے جن لوگوں کو قطائع دئے وہ وہی لوگ تھے جن کا اسلام میں کوئی فائدہ تھا اور وہ قیام امن و امان پر مامور تھے۔ رسول اللہ اور خلفاء نے اسی میں ملک و قوم کی بہتری سمجھی تھی اگر یہ بات نہ ہوتی تو کسی کو کسی کا حق دینے کا سوال ہی نہ تھا۔[۱]

الغرض قطائع ان لوگوں کو اس لئے نہ دئے گئے تھے کہ اس کے ذریعہ وہ عیش و آرام کر سکیں بلکہ یہ قطعات ان کو معاش کی فکر سے آزاد کر کے خدمتِ خلق کے لئے وقف ہو جانے کا سامان کر دیتے تھے

خلیفہ کے اختیارات | حکومتِ الٰہی میں زمین وجائداد ذاتی وقار اور اقتدار بڑھانے کے لئے نہ ہوتی تھی بلکہ عام مفاد اور خدمتِ خلق کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی جب تک مفادِ خلق کی خدمت ہوتی رہتی خلافت کو کوئی دخل دینے کی ضرورت نہ تھی اگر اس کی خلاف ورزی ہوتی تو خلافت ہر قانون اور ہر تصرف کی مجاز تھی۔ قوم بجیلہ سے "قطائع" واپس لے لینا اور بلال بن حارث مزنی کے قبضہ سے غیر آباد آراضی نکال لینا اور اس قسم کے جتنے واقعات اوپر مذکور ہو چکے ہیں اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

اور اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر فرمایا تھا

لنا رقاب الارض[۲] — زمینیں دراصل ہماری (خلافت کی) ہیں

اور حضرت علیؓ نے ایک شخص کے اسلام قبول کرنے کے بعد فرمایا تھا۔

ان ارضک فلنا[۳] — بے شک تیری زمین ہماری (خلافت کی) ہے

انھیں تصریحات کے پیش نظر ابو بکر حصاصؒ کہتے ہیں۔

ہر وہ زمین جس کی آبادکاری سے لوگ عاجز ہیں اور حقوق عامہ پامال ہوں تو اس کے انتظام کے بارے میں خلافت کو پورا اختیار ہے۔[۴]

اور قاضی ابو یوسف کہتے ہیں

---

[۱] الخراج ص ۶۲ [۲] الاموال ص ۲۸۹ [۳] الاحکام القرآن ج ۳ ص ۵۳ [۴] حوالہ بالا

ولا یخرج من یدہ من ذلک شیئا الا بحق یجب لہ علیہ فیاخذہ بذلک الذی وجب لہ[1]	اہل قطائع کو خلیفہ (بلا وجہ) بے دخل نہ کرے ہاں اگر حقوق واجبہ کی ادائیگی نہ ہو رہی ہو تو بے دخل کرنے کا پورا اختیار ہے

قاضی صاحب کا یہ جملہ "الا بحق یجب لہ علیہ" قابل غور ہے اپنے عموم مفہوم کی بناء پر حقوق عامہ کے ہر جائز حق اور خلیفہ کے ہر جائز تصرف کو شامل ہے

امام ابو حنیفہ کے مندرجہ ذیل الفاظ سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے

ان نواحی دار الاسلام تحت ید امام المسلمین[2]	دار الاسلام کے جملہ اطراف خلیفۃ المسلمین کے زیر اقتدار ہوتے ہیں

علامہ عینی ایک موقع پر کہتے ہیں

ان حکم الاراضی الی الامام[3]	دراصل زمین کا معاملہ خلیفہ کے سپرد ہے

اسی لئے خلیفہ کو مفادِ عامہ کے پیش نظر موقوفہ آراضی میں کبھی واقف کی مقرر کردہ شرطوں کی مخالفت جائز ہے۔ چنانچہ آراضیِ موقوفہ کی بحث میں فقہ کی یہ تصریح ہے

لان اصلھا لبیت المال[4]	اس لئے کہ زمینیں حقیقۃً بیت المال (حکومت) کی ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ حکومتِ الٰہی میں زمین جائیداد پر کسی کے قبضہ ہونے کا صرف یہ مطلب تھا کہ قابض کو بحیثیت امین اس کے استعمال کا حق حاصل ہو۔ یہ امانت اس کے قبضہ میں اسی وقت تک باقی رکھی جاتی جب تک وہ خلق اللہ کے مفاد میں خلافت کا ہاتھ بٹا سکتا اور ایسی فضاء پیدا کرنے میں مددگار رہتا جو مخلوق کی خوشحالی اور ترقی کی ضامن ہو۔ جب اس کی خلاف ورزی ہوتی اور امانت میں خیانت کا اندیشہ ہوتا تو خلیفہ بلا پس و پیش اسے آراضی سے بے دخل کر دیتا یا جو بہتر صورت مناسب ہوتی عمل میں لاتا تھا۔

---

[1] الخراج صفحہ ۶۰ [2] مبسوط ج ۱ صفحہ ۹ از اسلام کے معاشی نظریے [3] عینی ج ۶ صفحہ ۲۹ [4] در المختار ج ۱

خلیفہ کے اس اقدام میں نہ حقوقِ ملکیت کا "گورکھ دھندا" حائل ہوتا اور نہ جذباتی چیزیں رکاوٹ بن سکتی تھیں چونکہ خلافت کے لئے ہر شخص کے ذاتی مفاد کا خیال رکھنا بھی ناگزیر تھا اس لئے ہر تصرف اور ہر فیصلہ میں اس کا بھی لحاظ رکھا جاتا تھا۔

صاحب زمین کے اختیارات زمانہ خلافت میں صاحب زمین کو مندرجہ ذیل اختیارات حاصل تھے

وقف وقف کا دستور قرن اول میں بکثرت پایا جاتا ہے اسلام میں سب سے پہلے واقف حضرت عمرؓ نے اپنا خیبر کا حصہ جو فوجیوں میں تقسیم کے وقت آپ کو ملا تھا فی سبیل اللہ وقف کر دیا تھا۔[1]

حضرت طلحہؓ نے اپنا محبوب ترین باغ اللہ کی راہ میں وقف کر دیا تھا۔[2]

حضرت علیؓ نے مصر میں زمین اور مکان وقف کیا حضرت عمرو بن العاصؓ نے مکہ اور مدینہ کے مکانات وقف کئے حضرت سعدؓ نے ایک مکان مدینہ میں اور ایک مکان مصر میں وقف کیا حضرت ارقمؓ نے اپنا وہ مکان وقف کر دیا جس میں رسول اللہ نے قیام فرمایا تھا حضرت ابوبکرؓ اور حضرت زبیرؓ بن العوام نے اپنے مکہ کے مکان وقف کئے۔ فاروق اعظم نے مکہ میں مروہ کے پاس کا مکان وقف کیا ان کے علاوہ بکثرت اوقاف متعدد احادیث سے ثابت ہیں۔[3]

ایک شخص نے اپنی ماں کے انتقال کے بعد ایک باغ صدقہ کر دیا تھا[4]

عینی شارح بخاری کہتے ہیں

وقف اور صدقہ دونوں قریب المعنیٰ اور دونوں کا ایک حکم ہے[5]

وقف کی صحت کے بعد واقف کو مالکانہ تصرف کا حق نہ رہتا بلکہ اس کا پورا انتظام خلافت کے ذمہ ہو جاتا تھا

رسول اللہ نے موقوفہ زمین کے متعلق فرمایا

لا تباع ولا توھب ولا تورث[6] نہ بیچی جائے نہ ہبہ کی جائے نہ وراثت جاری ہو

چونکہ آراضی کا اصل تعلق خلیفہ اور بیت المال سے ہوتا تھا اس لئے خلافت کو عام مفاد

---

[1] بخاری و مسلم [2] بخاری کتاب التفسیر [3] نصب الرایہ [4] عینی ج ۶ ص ۱۱ [5] حوالہ بالا [6] بخاری و مسلم

کے پیشِ نظر واقف کی مقرر کردہ شرطوں کی مخالفت کا بھی حق حاصل تھا۔

اس بارے میں فقہ کی یہ تصریح ہے

ان السلطان یجوز لہ مخالفۃ الشرط	جب وقف کی اکثر جہات گاؤں اور مزروعہ زمین ہو
اذا کان غالب جہات الوقف قری	تو خلیفہ کا حکم نافذ العمل ہوگا اگرچہ واقف کی شرائط
ومزارع فیعمل بامرہ وان غایر	کے خلاف ہو کیونکہ گاؤں اور زمینیں دراصل بیت المال
شرط الواقف لان اصلہا	کی ہیں۔
لبیت المال[1]	

ہبہ جائداد غیر منقولہ زمین۔ مکانات۔ باغات کا ہبہ قانوناً صحیح مانا جاتا تھا کلام عرب میں اس کے ہبہ کے لئے کئی لفظ مستعمل تھے مثلاً

عمریٰ قرآن کریم میں اس کا مادہ یہ ہے

واستعمرکم فیہا پ ۱۲ — اللہ نے تم کو زمین میں بسایا

محدثین وفقہا کے اقوال اور اہل زبان کے محاورہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ عمریٰ کے معنی "زمین۔ باغ۔ مکان کسی کو پوری زندگی کے لئے دے دینا" کے ہوتے تھے[2]

زمانۂ خلافت میں اس قسم کے عطیات عموماً تین طرح دئے جاتے تھے۔

(۱) زمین یا مکان رہنے اور کاشتکاری کے لئے کسی کو دے دیا اور یہ بات بھی صاف کر دی کہ تو اس کا مالک ہے اور تیرے بعد تیرے ورثہ مالک ہوں گے۔

(۲) صرف اتنا کہا کہ یہ تجھ کو دیتا ہوں مرنے کے بعد کا کچھ ذکر نہ کیا

(۳) دیتے وقت یہ شرط کر لی کہ تیرے مرنے کے بعد میری طرف یا میرے ورثہ کی طرف منتقل ہو جائے گا۔

ان تینوں صورتوں میں موہوب لہ (جس کو دی گئی ہے) موہوبہ شے کا مالک ہو جاتا اور

---

[1] درالمختار ج ۱ [2] ملاحظہ ہو احکام القرآن ج ۳ ص ۲۰۳

اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثہ کی طرف منتقل ہو جاتی دینے والے کا کوئی حق نہ رہ جاتا تھا

چنانچہ اس بارے میں رسول اللہ کا فرمان یہ ہے

"عمریٰ اس شخص کی ملک ہے جس کو دیا گیا پھر اس کے بعد اس کے ورثہ پر منتقل ہو جائے گا"[۱]

عام طور پر لوگ دیتے وقت واپسی کی شرط کر لیا کرتے رسول اللہ نے شرط کو باطل قرار دیا اور

اصل ہبہ کو جائز رکھا تھا[۲]

بعض حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ معاملات میں شرطوں کے مطابق فیصلہ ہونا چاہئے اور

عمریٰ میں شرط باطل قرار دی جاتی تھی اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حدیثوں میں وہی شرطیں مراد تھیں جن کے

جواز میں نص صریح ہو یا کم از کم شارع کے اقوال و افعال سے اس کی تردید نہ ہوتی ہو وہ گئیں وہ شرطیں

جو اصولاً لغو اور باطل ہوتیں یا باہمی نزاع اور فساد پر مبنی ہوتیں تو ان کے جواز کی یا باقی رکھنے کی کوئی گنجائش

نہ تھی جیسا کہ بعض روایتوں میں اس کی تصریح بھی موجود ہے[۳]

جن بعض حدیثوں میں اس قسم کے عطایا سے ممانعت آتی ہے اس کی دو وجہ ہیں۔

(۱) عام طور سے انھیں شرائط کے ساتھ عطیہ دئے جاتے جو جاہلیت میں رائج تھے[۴] اور وہ عموماً

باہمی نزاع اور فساد پر مبنی ہوتیں۔

(۲) رسول اللہ بحیثیت خلیفہ اس قسم کے تصرفات سے محض اس بنا پر روک دیتے کہ آپ کو

لوگوں کی ضرورتوں کا علم تھا ابتداءً کسی شئے کا دے دینا آسان ہوتا ہے بعد میں اس کا خمیازہ بھگتنا مشکل

ہوتا ہے۔

چنانچہ علینی کہتے ہیں

رسول اللہ کو اصل مالکوں کی ضرورت اور صبر نہ کر سکنے کا علم تھا اس بنا پر آپ نے منع فرما دیا تھا[۵]

اور علامہ نووی کہتے ہیں۔

اس ممانعت سے رسول اللہ کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو صحیح حقیقت حال سے آگاہ کر دیں کہ اس قسم کے عطایا

---

[۱] بخاری و مسلم وغیرہ [۲] مسلم ج۲ باب العمریٰ نیز عینی ج۶ صفحہ ۳۱ و احکام القرآن ج۳ صفحہ ۲۰۳ [۳] ملاحظہ ہو شرح معانی الآثار اور

نووی شرح مسلم ج۲ صفحہ ۳۸ [۴] عینی ج۶ صفحہ ۳۰ [۵] حوالہ بالا

اسلامی اصول کے مطابق تمہاری ملکیت سے نکل جائیں گے اس لئے جو کچھ کرو سوچ سمجھ کر کرو اب ایسا نہ ہوگا کہ دینے کے بعد پھر واپس لے لو جیسے پہلے کیا کرتے تھے[۱]

حاصل یہ ہے کہ زمانۂ خلافت میں عمریٰ اسی وقت قابلِ تسلیم تھا جب کہ دینے والے کے حالات اس کی اجازت دیتے ہوں ورنہ خلافت کو روک دینے کا حق حاصل تھا۔

رقبیٰ رقبیٰ کی ایک یہ صورت منقول ہے کہ

کوئی شخص کسی سے کہتا کہ میں نے اپنا گھر یا زمین تجھ کو دے دیا اگر میں پہلے مروں گا تو تیرے پاس رہے گا اور تو مرے گا تو میرا ہو جائے گا[۲]

اس صورت میں تملیک مرنے کے بعد پر معلق رہتی تھی۔

رقبیٰ کی ایک صورت یہ بیان کی جاتی ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے کہ

میں نے تجھ کو مالک بنا دیا اس شرط پر کہ اگر تو پہلے مرے تو میری طرف واپس آئے گا اور میں پہلے مروں تو تیرے ہی پاس رہے گا[۳]

اس صورت میں انتظار رجوع اور عدم رجوع کے متعلق ہوتا تھا اور تملیک فی الحال ہو جاتی تھی

رقبیٰ کے حکم کے بارے میں امام نسائی نے ابن عباس سے موقوفاً یہ روایت نقل کی ہے

العمریٰ والرقبیٰ سواءٌ[۴] — عمریٰ اور رقبیٰ دونوں برابر ہیں

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ کے زمانہ میں رقبیٰ کی جو صورت رائج تھی وہ عمریٰ سے زیادہ مختلف نہ تھی اسی لئے دونوں کا یکساں حکم بیان کیا گیا۔ اگر ایک میں فی الحال تملیک پائی جاتی اور دوسرے میں معلق رہتی تو یکسانیت کا کوئی مطلب نہیں رہ جاتا۔

کیونکہ لغوی اعتبار سے عمریٰ کے معنیٰ آباد کرنا اور رقبیٰ کے معنیٰ انتظار کرنے کے ہیں اسی لئے محققین کے نزدیک رقبیٰ کی دوسری تعریف صحیح سمجھی جاتی ہے اور زمانۂ خلافت میں رقبیٰ کی جو صورت رائج تھی اس کا حکم عمریٰ جیسا بیان کیا جاتا ہے۔

---

[۱] نووی ج ۲ ص ۳۸ [۲] عینی ج ۶ ص ۳۰۹ [۳] المختصر از فیض الباری للعلامہ انور [۴] عمدۃ القاری ج ۶ ص ۳۰

اس باب میں ممانعت کی حدیثوں کا وہی جواب ہے جو عمریٰ میں مذکور ہو چکا ہے اور ائمہ قانون کے اختلاف کی شکل حکمی اور حقیقی نہیں ہے بلکہ عرف اور رواج کی بناء پر ہے۔

یعنی جس صورت میں فی الحال تملیک نہ پائی جائے بالاتفاق ناجائز ہے اور جس میں فی الحال تملیک پائی جاتی ہو اس کو سب ائمہ جائز کہتے ہیں[۱]

منحۃ | رسول اللہ نے فرمایا

من کانت لہ ارض فلیزرعھا او یمنحھا اخاہ[۲] — جس کے پاس زمین ہو خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو مفت دے دے

ابن بطال کہتے ہیں

"منحۃ" جس میں منافع کا مالک بنایا جائے ذات کا نہیں[۳]

نوویؒ کہتے ہیں

"منحۃ" عاریۃ ہے[۴]

انور شاہؒ کہتے ہیں

"کسی کو انتفاع کے لئے مفت زمین دے دینا۔[۵]

منجد میں ہے

"المنحۃ العطیۃ۔

ان تمام تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام عرب میں ایسے موقع پر منحہ کے معنی کسی کو کاشت کے لئے مفت زمین دے دینے کے ہوتے تھے۔

زمانہ خلافت میں امداد باہمی کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ کاشت کے لئے مفت زمین دے دی جاتی کاشتکار اپنے اخراجات سے کاشت کرتا اور پوری پیداوار اسی کی ہوتی۔

---

[۱] حاشیہ شرح وقایہ وکنز الدقائق وتقریر ترمذی للشیخ الہند وفیض الباری ج۳ وعمدۃ القاری ج۶ ص۳۰۶ [۲] مسلم ابو داؤد وغیرہ
[۳] عینی ج۶ ص۳۱۶ [۴] نووی ج۲ ص۱۲ [۵] فیض الباری ج۳ ص۳۰۲

اس قسم کی زمین کا حکم یہ تھا کہ کاشتکار جب اس سے مستغنی ہو جاتا یا جتنی مدت کے لئے زمین دی گئی ہے وہ مدت ختم ہو جاتی تو زمین اصل مالکوں کے حوالہ کی جاتی تھی۔

رسول اللہ نے کھجور کا پھلدار درخت اس سے مستغنی ہو جانے کے بعد ام انس کو واپس کر دیا تھا اور مہاجرین نے انصار کے بہت سے عطایا واپس کر دئے تھے[1]۔

حق شفعہ | شفعہ دراصل ایک حق ہے جو جائداد غیر منقولہ کی بیع کے وقت شریک کو اگر وہ نہ ہوتا تو پڑوسی کو پہنچتا تھا۔

اس بارے میں رسول اللہ کا یہ فرمان ہے۔

"شریک بہ نسبت پڑوسی کے زیادہ حقدار ہے اور پڑوسی بہ نسبت غیر کے زیادہ مستحق ہے[2]۔"

دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا

"شریک زیادہ حقدار ہے اگر شریک نہ ہو تو پھر پڑوسی[3]"

حکومتِ الٰہی میں اس حق کا یہاں تک لحاظ کیا گیا تھا کہ شریک کی موجودگی میں بغیر اس کو اطلاع دئے اور اگر شریک نہ ہو تو پڑوسی کو اطلاع دئے بغیر بیچنا جائز نہ تھا۔

چنانچہ رسول اللہ نے فرمایا

"بغیر شریک کی اطلاع دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا حلال نہیں شریک چاہے تو لے لے ورنہ چھوڑ دے اگر اطلاع دئے بغیر فروخت کر دیا تو شریک کو اختیار ہے کہ بیع فسخ کر کے خود خرید لے[4]۔"

پڑوسی کے متعلق آپ نے فرمایا

"پڑوسی زیادہ حقدار ہے اگر موجود نہ ہو تو اس کا انتظار کیا جائے[5]"

حق وراثت | صاحب زمین کے انتقال کے بعد اس کی جائداد منقولہ و غیر منقولہ حسب دستور شریعت اس کے ورثہ میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ اس قانون وراثت کے ذریعہ ایک شخص کے پاس اتنی زیادہ زمین نہ رہنے

---

[1] عینی ج ۶ صفحہ ۳۱۶ [2] مصنف عبد الرزاق از نصب الرایہ و عینی [3] مصنف ابن ابی شیبہ از نصب الرایہ [4] مسلم و دارقطنی فی الاقضاء [5] نصب الرایہ صفحہ ۱۷۶

باقی جو دوسرے کی حق تلفی کی باعث بنے یا دوسروں کی محنت سے خود عیشی کے سامان پیدا ہو سکیں کیونکہ اسلامی قانون کے مطابق جائداد صرف بڑے بیٹے ہی کو نہیں ملتی بلکہ سب بیٹوں اور بیٹیوں اور بیوی میں تقسیم ہوتی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ	مردوں کے لئے حصہ ہے جو ماں باپ اور دوسرے
وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ	رشتہ دار چھوڑ جائیں عورتوں کے لئے بھی حصہ ہے
مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ	جو ماں باپ اور دوسرے رشتہ دار چھوڑ جائیں خواہ
مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ [1]	ترکہ چھوٹا ہو یا بڑا

چونکہ ایسی صورت میں اس بات کا امکان تھا کہ ترکہ میں زمین تقسیم ہوتے ہوتے گزوں اور انچوں تک نوبت پہنچ جائے اور بہت سی وہ چیزیں تقسیم کرنی پڑیں جن کے تقسیم ہونے کے بعد پھر ان سے انتفاع کی شکل باقی نہ رہے مثلاً گھر وغیرہ تو اس کے لئے وقف علی الاولاد کی شکل نکالی گئی تھی جس سے صرف اس کا منافع تقسیم ہوتا اور شی اپنی جگہ پر بدستور قائم رہتی تھی اور قانونِ شفعہ مقرر کیا گیا تھا جس کے ذریعہ پڑوسی اور شریک کو دوسروں کے مقابلہ میں ترجیح حاصل ہوتی تھی۔

بیع و شراء زمانۂ خلافت میں متعدد صحابہ سے زمین کی خرید و فروخت ثابت ہے۔ ابو رافع صحابی نے رسول اللہ کے دئے ہوئے قطائع فروخت کر دئے تھے [2]۔ عبد اللہ بن مسعود۔ عتبہ بن فرقد۔ حسنؓ حسینؓ خباب بن ارت وغیرہ نے خراجی زمینیں خریدی تھیں [2]۔

اسی بنا پر صاحب ہدایہ کہتے ہیں۔

وقد صح ان الصحابة اشتروا اراضی الخراج [3]	یہ بات صحت کو پہنچ چکی ہے کہ صحابہ کرام نے خراجی زمینیں خریدی تھیں۔

رہ گئے وہ اقوال و آثار جن سے بظاہر خراجی زمین خریدنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ عموماً فاتح قوم میں مفتوحین کے ساتھ ہر معاملہ میں ظلم و زیادتی کیا کرتی ہیں اسلام نے اس

---

[1] الخراج لابی یوسف صہ ۶۱ [2] الخراج یحییٰ صہ ۵۵ و ۵۶ [3] ہدایہ ج ا

معاملہ میں یہاں تک احتیاط برتی کہ محض احتمال کی بناء پر اس جائز حق کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا اور اعلان کر دیا کہ خراجی زمینیں خریدنا مناسب نہیں ہے البتہ جہاں اس کا اندیشہ نہیں تھا مفتوحین کی آزادی رائے کو برقرار رکھنے کے لئے خرید و فروخت کی اجازت تھی۔ جیسا کہ متعدد صحابیوں کا خرید نا مذکور ہو چکا ہے

الغرض زمانۂ خلافت میں صاحبِ زمین کو اپنی زمین پر پورے اختیارات حاصل تھے تاکہ ہر شخص آزادانہ روزی کما کر اپنی ضمیر کا استقلال باقی رکھ سکے۔

ایک شبہ کا دفعیہ | ممکن ہے بعض حضرات کو ان اقوال سے شبہ ہو جن سے بظاہر صاحب زمین کے اختیارات نہیں ثابت ہوتے ہیں مثلاً یہ روایت ہے کہ

"عتبہ بن فرقد نے فرات کے کنارے کچھ زمین خریدی حضرت عمرؓ کو جب اس کا پتہ چلا تو "عتبہ" سے پوچھا کہ یہ زمین تم نے کس سے خریدی ہے "کہا" زمین والوں سے عمرؓ نے مہاجرین اور انصار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ زمین والے تو یہ لوگ ہیں کیا ان سے خریدی ہے عرض کیا "نہیں" فرمایا جس سے خریدی ہے واپس کر کے اس کی قیمت لے لو"[1]

اور جیسا کہ حضرت علیؓ نے عراق کے ایک پرانے باشندے سے اسلام قبول کرنے کے بعد فرمایا تھا کہ تری زمین خراجی ہی رہے گی کیونکہ ہماری ہے "ان ارضک فلنا"[2]

حقیقت یہ ہے کہ عتبہ بن فرقد کا واقعہ زیادہ صحیح سند کے ساتھ اس کے خلاف منقول ہے چنانچہ "زیلعی" نے بیہقی کے حوالہ سے جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

قال لعمر انی اشتریت ارضا من ارض السواد فقال عمر انت فیھا مثل صاحبھا	عتبہؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ میں نے سواد میں ایک زمین خریدی ہے آپ نے فرمایا کہ خراج کے معاملہ میں تم سابق صاحب زمین جیسے ہو (یعنی وہ ادا کرتا تھا تم بھی ادا کرو)

ان دونوں روایتوں میں عتبہؓ سے روایت کرنے والے شعبی ہیں جن کا نام عامر ہے اور شعبی سے

---

[1] الاموال ص۸۴ [2] حوالہ بالا

روایت کرنے والے پہلی روایت میں "بکیر" ہیں جو شعبی کے صاحبزادہ ہیں اور جن کی کنیت ابو اسماعیل ہے دوسری روایت میں شعبی سے روایت کرنے والے مجالد بن سعید ہیں اصولِ روایت کے لحاظ سے بکیر ضعیف اور مجالد قوی ہے[1] اس لئے پہلی روایت دوسری کے مقابلہ میں قابل اعتبار نہ ہوگی۔

رہ گئی حضرت علیؓ کی مذکورہ روایت تو اس کی تشریح و توضیح ذیل کی روایت سے ہوتی ہے۔

ایک دھقانی (زمیندار) نے اسلام قبول کیا حضرت علیؓ نے اس سے فرمایا کہ اگر تم اپنی زمین پر قائم رہوگے تو حفاظت کا معاوضہ (جزیہ) ہٹادیں گے اور اس کا بدل زمین سے وصول کریں گے اور اگر زمین چھوڑ دوگے تو اس کے ہم زیادہ حقدار ہیں۔

بعینہٖ امیرؓ کے الفاظ یہ ہیں

وان تحولت عنها فنحن احق بها[2] اگر تو نے زمین چھوڑ دی تو اس کے ہم زیادہ حقدار ہیں

ابو بکر جصاصؒ ان الفاظ کی یہ تشریح کرتے ہیں کہ

اگر تم زمین کی آبادکاری سے عاجز ہوگئے تو ہم آباد کرائیں گے تاکہ حقوق عامہ جو زمین سے متعلق ہیں پامال ہوں

پھر آگے چل کر کہتے ہیں

یہ قانون مفتوحین ہی کی زمین کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ تمام زمینیں جن کی آبادکاری سے لوگ عاجز ہیں ان کا انتظام و بندوبست خلیفہ کے ذمہ ہے[3]

حاصل یہ ہے کہ مذکورہ اقوال سے یہ بات نہیں ثابت ہوتی کہ آراضیِ مفتوحہ میں اصل باشندوں کو اور اہلِ قطائع کو تصرفات میں آزادی حاصل نہ تھی بشرطیکہ وہ تصرفات اجتماعی مفاد کے خلاف نہ ہوتے ورنہ خلافت کو روک دینے کا حق حاصل تھا۔

نیز اسلامی جنگوں میں مفتوحہ زمین کے باشندے غلام نہ قرار دئے جاتے تھے کیونکہ اسلام تو غلامی کا طوق گردن سے اتار پھینکنے کے لئے آیا ہے نہ کہ اس کو قائم رکھنے اور رواج دینے کے لئے یہ دوسری بات ہے کہ بعض سیاسی و معاشی حالات کی مجبوری کی وجہ سے ابتداءً ممانعت کا قانون نہ نافذ کرسکا اور

---

[1] حاشیہ کتاب الخراج یحییٰ ص۵۵ [2] احکام القرآن للجصاص ج۳ ص۵۳۲ [3] حوالہ بالا

بتدریج اس کے ختم کرنے کی راہیں نکالیں ؀

جب اسلامی قبضہ کے بعد مفتوحین اپنی فطری حریت پر باقی رہتے تو آراضی اور ان کی تمام اشیاء پر فطری آزادی برقرار رہنی لازمی تھی تاکہ ہر لحاظ سے مطمئن و مامون ہو کر خوشحالی و فارغ البالی کی زندگی بسر کر سکیں اور اسلام ہر طرح سے ان کے لئے رحمت ثابت ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ ساری زمینیں حقیقۃً اللہ کی ملک ہوتیں اور خلافت کے انتظام و نگرانی میں رہتی تھیں کاشتکار و صاحب زمین کی حیثیت محض امین کی ہوتی تھی۔

جب تک مقصد (خلق اللہ کا عام مفاد) پورا ہوتا رہتا نہ خلافت کو بے دخل کرنے کی ضرورت پڑتی اور نہ تصرفات کو محدود کرنے کی حاجت ہوتی اور جب یہ مقصد پامال ہونے لگتا یا حقوقِ عامہ جو زمین سے متعلق ہیں ان کے فوت ہونے کا اندیشہ ہوتا تو بلا تخصیص و ترجیح فاتح و مفتوح مسلم و غیر مسلم صاحبِ زمین کو بے دخل کر دینے یا اس کے تصرفات کو محدود کرنے کا پورا اختیار ہوتا تھا۔

؀ ابوبکر حصاصؒ نے احکام القرآن جلد ثالث میں اصل باشندوں کے اختیارات اور اہل سواد کے غلام نہ ہونے پر نہایت محققانہ بحث کی ہے جس کے مطالعہ کے بعد پھر کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی ۱۲

غلامانِ اسلام

اسّی کے قریب ان صحابہ، تابعین، تبع تابعین، فقہا اور محدثین اور اربابِ کشف و کرامات اور اصحابِ علم و ادب کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل بڑی تحقیق و تدقیق سے جمع کئے گئے ہیں جنہوں نے غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود ملت کی عظیم الشان خدمتیں انجام دیں جنہیں اسلامی سوسائٹی کے ہر دور میں عظمت و اقتدار کا فلک الافلاک سمجھا گیا اور جن کے علمی، مذہبی، تاریخی اور سماجی کارنامے اس قدر شاندار اور اس قدر روشن ہیں کہ ان کی غلامی پر آزادی کو رشک کرنے کا حق ہے اور بجا ہے، یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی محققانہ دلچسپ اور معلومات سے لبریز کتاب اس موضوع پر اب تک کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی اس کے مطالعہ سے غلامانِ اسلام کے حیرت انگیز اور شاندار کارناموں کا نقشہ آنکھوں میں سما جاتا ہے دوسرا ایڈیشن صفحات ۴۸۸ بڑی تقطیع قیمت پانچ روپے آٹھ آنے مجلد چھ روپے

التقریظ والانتقاد

"جامع المجددین"

بحث تجدید و مجدد

(۹)

(سعید احمد)

اس وقت مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سے ان پر جو انحطاط طاری ہونا شروع ہو گیا تھا وہ ۱۸۵۷ء کے بعد انتہا کو پہنچ گیا۔ اس زمانہ میں ان کی معاشرتی حالت کیا تھی؟ اس کا اندازہ مولوی نذیر احمد دہلوی مرحوم کے ناولوں سے ہوگا۔ اور اقتصادی اور معاشی حالت کا علم مرزا غالب کے ان خطوط سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے اس ہنگامہ کے بعد اپنے خاص خاص دوستوں کو لکھے تھے اس کے علاوہ ڈاکٹر ہنٹر نے لارڈ میو کے ایما پر "ہمارے ہندوستانی مسلمان" کے نام سے ۱۸۷۱ء میں ایک کتاب لکھی تھی اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر صادق حسین نے کیا ہے اور لاہور میں چھپا ہے اس کتاب کے چوتھے باب میں مصنف نے بتایا ہے کہ مسلمان کس درجہ پریشان حال تھے حکومت میں اہم اور غیر اہم عہدوں اور ملازمتوں کے دروازے ان پر بند تھے ملک میں ایسا طریقہ تعلیم جاری کیا گیا تھا جس میں ان کے بچوں کے لئے کوئی انتظام نہیں تھا قاضیوں کو موقوف کر کے ہزاروں خاندانوں کو جو اسلامی علوم و فنون میں درک رکھتے تھے بے کار اور کنگال بنا دیا گیا تھا اور مسلمانوں کے اوقاف پر قبضہ کر کے ان کی آمدنی غلط مصارف پر خرچ ہو رہی تھی جس کے باعث افسوسناک یہ عالم تھا کہ بنگال کے بڑے بڑے امیر اور شریف مسلمان جو عیش و عشرت اور شان و شوکت کی زندگی بسر کرنے کے خوگر تھے ان کی املاک و

جائدادیں ضبط کر لی گئی تھیں اور وہ نان شبینہ تک کو محتاج ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر ہنٹر لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی مفلوک الحالی کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اگر کوئی سیاست داں انگلینڈ کے دارالعوام میں سنسنی پیدا کرنا چاہتا تو اس کے لئے صرف یہ بات کافی تھی کہ وہ بنگال کے مسلمان خاندانوں کے سچے سچے حالات بیان کردے۔

سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر جو بند کئے گئے تھے اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ۱۸۶۹ء میں اسسٹنٹ انجنیروں کے تین درجوں میں چودہ ہندو اور مسلمان صفر اس عہدہ کی تعلیم پانے والوں میں ہندو چار انگریز دو اور مسلمان صفر، سب انجنیروں اور سپروائزروں میں ہندو چوبیس اور مسلمان ایک اورسیروں میں ہندو تریسٹھ اور مسلمان دو۔ اکاونٹس کے محکمہ میں ہندو پچاس اور مسلمان صفر ڈاکٹر ہنٹر نے اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ان گزیٹڈ ملازمتوں کا ایک نقشہ درج کیا ہے جو ۱۸۷۱ء میں ہندو مسلمان اور انگریزوں پر صرف ایک صوبہ بنگال میں تقسیم کی گئی۔ اس نقشہ کا نقل کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ عدالت۔ فوج۔ پولیس۔ میڈیکل ڈپارٹمنٹ۔ پبلک ورکس۔ تعلیم۔ محاسبی۔ آب کاری رجسٹریشن۔ انکم ٹیکس وغیرہ ان سب محکموں میں چھوٹی اور بڑی دو ہزار ایک سو گیارہ اسامیاں تھیں جن میں سے ایک ہزار تین سو اٹھائیس اسامیوں پر انگریز اور چھ سو اکاسی پر ہندو مقرر کئے گئے اور مسلمانوں کے حصے میں بیانوے جگہیں آئیں اور وہ بھی بہت معمولی اور گھٹیا درجہ کی۔ متعدد محکموں کے بعض بڑے بڑے عہدے ایسے ہیں کہ مسلمان غریب کا ان میں گذر بھی نہیں (ص ۲۴۷)

آپ کا وقت تو صرف ہوگا اور دل کو دکھ بھی بہت ہوگا لیکن ذرا سینہ پر جبر کی سل رکھ کر ہنٹر کے مندرجہ ذیل دو اقتباسات بھی پڑھتے چلئے:۔

"ایک صدی قبل حکومت کے تمام ذمہ دار عہدوں پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ تھا۔۔۔۔۔ لیکن اب ان میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا مسلمانوں اور ہندوؤں کا تناسب ایک اور سات کا ہندوؤں اور یورپینوں کا ایک اور دو کا۔ مسلمانوں اور یورپینوں کا ایک اور چودہ کا اور تمام نظام حکومت میں اس قوم کا تناسب جو آج سے ایک صدی پہلے ساری حکومت کی اجارہ دار تھی کم ہوتے ہوتے ایک اور تیئیس رہ گیا اور وہ بھی ان گزیٹڈ ملازمتوں میں ہے جہاں تناسب کا خاص خیال رکھا جاتا ہے پریذیڈنسی شہر کے دفتر کی معمولی ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ تقریباً معدوم ہو چکا ہے دراصل کلکتہ کے سرکاری دفتر میں مسلمان اب اس سے بڑھ کر

اور کوئی امید بھی نہیں رکھ سکتے کہ قلی اور چپراسی، دواتوں میں سیاہی ڈالنے والا یا قلموں کو ٹھیک کرنے والا کے سوا کوئی اور ملازمت حاصل کرسکیں۔"

چند سطر بعد پھر لکھتے ہیں :۔

"جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو مسلمان ہی سب سے اعلیٰ قوم تھی وہ دل کی مضبوطی اور بازوؤں کی توانائی ہی میں برتر نہ تھے بلکہ سیاسیات اور حکمت عملی کے علم میں بھی سب سے افضل تھے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں پر حکومت کی ملازمتوں کا دروازہ بند ہے۔ غیر سرکاری ذرائع زندگی میں بھی انھیں کوئی نمایاں جگہ حاصل نہیں۔" (ص ۲۴۹)

یہ حال تو بنگال کا تھا۔ اب اڑیسہ کے مسلمانوں کا حال بھی سن لیجئے اس کے لئے صرف اس ایک درخواست کا ایک ٹکڑا نقل کردینا کافی ہے جو مسلمانان اڑیسہ نے یہاں کے کمشنر کے سامنے پیش کی تھی وہ لکھتے ہیں :۔

"ہر مجیسٹی ملکۂ معظمہ کی وفادار رعایا ہونے کی حیثیت سے ہم یقین رکھتے ہیں کہ ملک کی سرکاری ملازمتوں میں ہمارا بھی مساویانہ حق ہے۔ اگر سچ پوچھئے تو اڑیسہ کے مسلمانوں کو روز بروز تباہ کیا جارہا ہے اور ان کے سربلند ہونے کی کوئی امید نہیں۔ مسلمان اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اب بالکل نادار ہیں اور ہمارا کوئی بھی پرسان حال نہیں اب ہماری حالت ماہیٔ بے آب کی طرح ہورہی ہے مسلمانوں کی اس ابتر حالت کو ہم جناب عالی کی حضور میں پیش کرنے کی جرأت کر رہے ہیں اس یقین کے ساتھ کہ جناب عالی ہی اڑیسہ ڈویژن میں ہر مجیسٹی ملکہ معظمہ کے واحد نمائندہ ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ نسل و رنگ کے امتیاز سے بالا ہوکر ہر قوم کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے گا۔ اپنی سابقہ سرکاری ملازمتوں کے چھن جانے سے ہم اس قدر مایوس ہوچکے ہیں کہ صمیم قلب سے دنیا کے دور دراز گوشوں کا رخ کرنے کے لئے تیار ہیں ہم ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر چڑھنے کے لئے مستعد ہیں ہم سائبیریا کے بے آب و گیاہ حصوں میں مارے مارے پھرنے کے لئے آمادہ ہیں بشرطیکہ ہمیں یقین دلادیا جائے کہ ایسا کرنے سے ہمیں ۱ شلنگ (۱/۲ روپیہ) ہفتہ کی ملازمت سے سرفراز فرمایا جائے گا۔"

ڈاکٹر ڈبلو۔ڈبلو ہنٹر اس درخواست پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"یہ فقرے اس درخواست سے لیے گئے ہیں جو کچھ عرصہ ہوا مسلمانان اڑلیسہ نے کمشنر کے سامنے پیش کی ان پر تکلف فقروں پر ممکن ہے بعض لوگوں کو ہنسی آجائے مگر اس صوبہ کے سابق فاتحین کی حالت زار جس سے مجبور ہوکر انھوں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں محض روٹی کے لئے التجا کی ہے۔ بڑی ہی افسوسناک ہے اور ہمیشہ انسان کو متاثر کرتی رہے گی۔" (ص ۲۵۵)

ڈاکٹر ہنٹر نے اگرچہ یہ رپورٹ بنگال کے مسلمانوں کے متعلق لکھی ہے جن سے وہ خوب اچھی طرح واقف تھے۔ لیکن ساتھ ہی وہ سمجھتے ہیں کہ یہ حالت صرف اسی صوبہ تک محدود نہ تھی۔ چنانچہ لکھتے ہیں

"اگر میں دوسروں کو یہ یقین دلادوں اور خود میرا بھی خیال ہو کہ یہ بیانات تمام مسلمانان ہند پر صادق آتے ہیں تو مجھے اس پر معاف فرمایا جائے۔" (ص ۲۳۲)

جب کسی قوم پر اقتصادی اور معاشی زبوں حالی و پراگندگی چھا جاتی ہے تو بحکم کاد ا لفقر ان یکون کفرا" اس کی اخلاقی، روحانی دینی اور معاشرتی حالت خود بخود بگڑ جاتی ہے اور اس کا قومی جسم انتہائی متعفن اور گندہ ہو جاتا ہے۔ پھر ۱۸۵۷ء کے بعد تو ان مسلمانوں پر دوہری مار پڑی پہلے قرآن کی اصطلاح میں ان کی حالت سراکی تھی یعنی سیاسی اقتدار ان کے ہاتھ میں تھا تو حکومت اور اقتدار کے نشہ نے ان میں چند در چند اخلاقی گمراہیاں پیدا کر ہی رکھی تھیں کہ اب سیاسی زوال کے بعد ان کو "ضرا" سے دوچار ہونا پڑا تو اس نے رہی سہی کمی بھی پوری کر دی" اور یہ "تن ہمہ داغ داغ شد" کا مصداق بن کر کہیں کے نہیں رہے۔ حالی اور نذیر احمد نے ان کی اس قابل صد شرم اور لائق ہزار افسوس حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے کون کہہ سکتا ہے کہ وہ صرف شاعری ہے اور اظہار حقیقت و بیان واقعہ نہیں ہے انھیں حالات کو دیکھ کر سر سید احمد خاں نے غیرت و شرم کے مارے ایک مرتبہ ارادہ کر لیا تھا کہ ہندوستان کو خیر آباد کہہ کر مصر میں جا بسیں۔ لیکن بعد میں انھوں نے ارادہ بدل دیا۔ ایک لکچر میں اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور عزت پائے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا

مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ لیکن آخر میں نے فیصلہ کیا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں نہیں مجھ کو اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہئے۔ اور جو مصیبت پڑے اس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔

ہم جس عہد کا ذکر کر رہے ہیں یہ انیسویں صدی کے نصفِ آخر کا عہد ہے لیکن چونکہ ہمارے موضوعِ بحث کا تعلق انیسویں صدی کے نصفِ آخر سے لے کر بیسویں صدی کے تقریباً نصف اول تک کے عہد سے ہے اس لئے درجہ بدرجہ اس مدت میں مسلمانوں کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑا ان سب کو مختصراً پہلے اک ساتھ ہی سن لیجئے تاکہ پھر آپ کو ان تجدیدی کاموں کی اہمیت بھی محسوس ہو سکے جو اقتضاء حالات کے مطابق ظہور میں آتے رہے۔

مسلمانوں کے سیاسی زوال اور ان کی اقتصادی بدحالی دیکھ کر عیسائی مبلغین نے ہندوستان میں اپنا عمل دخل شروع کر دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد تو ان لوگوں نے تبلیغ عیسائیت اور اس کے ساتھ ساتھ اسلام اور داعیِ اول اسلام کی نسبت بہتان طرازی اور الزام تراشی کا جال گاؤں گاؤں اور شہر شہر میں پھیلا دیا جن لوگوں نے یہ مناظر اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں ان کا بیان ہے کہ حال یہ تھا کہ صبح اور شام جب دیکھو ایک مشنری اس سڑک پر کھڑا تقریر کر رہا ہے۔ دوسرا ادھر اس سے فاصلہ پر لوگوں کو کچھ پڑھا اور سمجھا رہا ہے۔ انجیل کے اردو اڈیشن تقسیم کر رہا ہے علاوہ بریں گھروں پر جا جا کر الگ مسلمانوں سے ملتے اور اپنے مذہب کی سچائی کا پرچار کر رہے ہیں۔

ایک طرف زبانی تبلیغ عیسائیت کرنے والے اس طرح اپنی مستعدی اور سرگرمی کا اظہار کر رہے تھے اور دوسری جانب یورپ میں خصوصاً اور ہندوستان میں عموماً کچھ کالجوں کے پروفیسر اور ارباب قلم تھے جو اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف نہایت زہریلی اور لیس بھری کتابیں لکھ رہے تھے اور اس منظم و مرتب پروگرام کا مقصد یہ تھا کہ ایک جانب مسلمانوں کو اور اسلام کو یورپ میں عقل۔ اخلاق اور انسانیت کا دشمن ثابت کر کے اس قدر بدنام رسوا اور ذلیل کر دیا جائے کہ وہاں کسی شخص کو بھی ان کے ساتھ ہمدردی نہ رہے اور کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہ ہو جو ان کی زبوں حالی پر ترس کھائے اور دوسری جانب

خود مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اسلام سے دور اور عیسائیت سے قریب لانا ان کا مطمح نظر تھا چنانچہ سر ولیم میور کی رسوائے عالم کتاب اسی زمانہ کی منحوس یادگار ہے۔ "حضرت مسیح کی ان بھیڑوں نے جو بھیڑیئے بن کر اسلام اور مسلمانوں کے جسدِ ناتواں پر جھپٹ پڑے تھے اس وقت جو گندی اور متعفن فضا پیدا کر دی تھی۔ سر سید احمد خاں جیسے ٹھنڈے دماغ کے انسان پر اس کا اثر یہ تھا کہ بقول ان کے مرجانے کو جی چاہتا تھا" میور کی مذکورہ بالا کتاب شائع ہوئی تو سر سید اس زمانہ میں لندن میں تھے وہاں سے اپنے دوست نواب محسن الملک کو کس قدر دردانگیز خط لکھتے ہیں "ان دنوں میرے دل کو سوزش ہے۔ ولیم میور صاحب نے جو کتاب آنحضرت کے حالات میں لکھی ہے اس کو میں دیکھ رہا ہوں اس نے دل کو جلا دیا۔ اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمم ارادہ کر لیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیر میں جیسے کہ پہلے بھی ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے اگر تمام روپیہ خرچ اور میں فقیر۔ بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔ قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو حاضر کرو جو اپنے دادا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا

"مارا ہمیں تمغۂ شاہنشہی بس ست"

انگریزی تعلیم کا دور شروع ہونے سے پہلے رونا اس کا تھا کہ مسلمان انڈو ایرانین تہذیب کے زیر اثر مشرکانہ عادات و اخلاق میں اس طرح جکڑ گئے تھے کہ ان کی معاشرت اور ان کے رہن سہن کا طور طریق بڑی حد تک غیر اسلامی ہو گیا تھا۔ شادی اور غمی مرنے اور جینے کی تمام تقریبات اسی مشرکانہ طریق زندگی کا مظہر ہوتی تھیں۔ عقد بیوگان کو حرام سمجھتے تھے۔ نماز روزہ کی پروا نہیں۔ لیکن عرس میں شرکت بزرگوں سے منتیں اور ان کی نذر و نیاز۔ تیجہ اور سوئم اور چہلم امام حسین کا فقیر اور بیک بننا۔ محرم کے دنوں میں سیاہ پوشی۔ بیاہ شادی کے موقع پر مہندی۔ مایوں۔ چوتھی۔ چالہ۔ آرسی مصحف یہ سب غرض عین اسلام کی سادہ اور تعلیمات حقہ کا پتہ نہیں اور بدعات و محدثات کا گھر گھر چرچا۔ اب انگریزی تعلیم کا چرچا ہوا اور اس تعلیم کے جلو میں مغربی تہذیب و تمدن کی کارفرمائی بھی شروع ہوئی تو عقیدہ اور عمل کی گمراہی کا ایک نیا دروازہ کھل گیا۔ انگریزی زبان سے واقف ہونے کے بعد جو نوجوان مسیحی مصنفین یا مغرب

کے آزاد خیال اربابِ قلم کی کتابیں پڑھتے تھے تو چونکہ ان کو براہ راست اسلام کی تاریخ اور اس کی دینیات و روایات سے واقفیت نہیں ہوتی تھی اس بنا پر وہ ان کتابوں کے اثرات کو فوراً قبول کر لیتے تھے نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ معجزات کا انکار۔ شیطان اور جن و ملائکہ کے وجود کا انکار۔ جنت و دوزخ کا انکار۔ نماز اور روزہ کی بے توقیری ان کا شعار اور ان مسائل پر تمسخرانہ گفتگو ان کا محبوب مشغلہ ہوتا تھا ایک طرف دین اور اس کے ارکان سے یہ بیزاری اور دوسری جانب صاحب بہادر بننے کا شوق۔ اردو میں بولنا ان کی شان کے خلاف۔ انگریزی میں گفتگو کرنا انگریزوں کی طرح کھانا اور پینا۔ ان کی طرح رہنا سہنا اور اٹھنا بیٹھنا لائق فخر اور سرمایۂ نازش و مباہات۔

نوبت باینجا رسید کہ انگریزی تعلیم یافتہ ہونے کے معنیٰ ہی یہ ہو گئے کہ اس کو اپنے دین اور مذہب سے لگاؤ نہیں ہے اور اعتقاداً و عملاً وہ بہ نسبت مسلمانوں کے انگریزوں سے زیادہ قریب ہے مختلف کوششوں کے زیر اثر جن کا اجمالی ذکر ہم آئندہ کریں گے اس چیز میں اصلاح ہوگئی اور یہ صورت حال اس شدت کے ساتھ قائم نہیں رہی لیکن جنگ عظیم اول کے بعد دنیا کا نقشہ ہی بدل گیا اور اس کے اثرات تمام عالم اسلام کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی اسلامی آبادی پر بھی پڑے۔ یہ اثرات ذہنی اور فکری بھی تھے اور اخلاقی اور روحانی بھی۔ ذہنی اور فکری اثر تو یہ تھا کہ دنیا یک بیک مادیت کی گود میں جا پڑی اور روحانی کیف و حظ کی کوئی اہمیت ہی نہ رہی! اس ذہنی انقلاب کا نتیجہ اخلاقی پراگندگی اور انتشار کی صورت میں ظاہر ہوا اسی زمانہ میں کارل مارکس کی اقتصادیات و معاشیات کے نظریہ نے اور روس میں اس نظریہ کے کامیاب عملی تجربات نے قدیم افکار و آرا کی مقدس عمارتوں پر ایک زلزلہ طاری کر دیا اب معجزات اور جن و ملائکہ کے وجود کی بحثیں بعد از وقت اور خارج از گفتگو تھیں اور سوال یہ تھا کہ دنیا میں حقیقی امن و عافیت قائم کرنے کے لئے کون سا نظام بہتر ہے یہ سوال آج اور زیادہ شدت اختیار کر گیا ہے اور جب تک کہ ایک اور عظیم ترین جنگ اس کا فیصلہ نہ کرے اس وقت تک اس سوال کا کوئی آخری جواب غالباً نہیں مل سکے

بہرحال جس عہد کا ہم ذکر کر رہے ہیں جہاں تک اسلام اور مسلمانوں کا تعلق ہے اس کے حالات یہ تھے اب سوچنا چاہیے کہ ان حالات کے پیش نظر اسلام کی تجدید کے لئے کیا کیا ہونا چاہیے تھا اور کیا کیا ہوا؟

(باقی آئندہ)

حالاتِ حاضرہ

سیاسیاتِ مصر

"وفد پارٹی کی شکست"

(۱)

(جناب مولانا محمد عثمان فارقلیط صاحب چیف ایڈیٹر الجمعیتہ)

مصر کا سیاسی اور فوجی انقلاب بھی حیرت انگیز ہے اس پر خود ان لوگوں کو بھی حیرت ہوتی ہے جو کسی انقلاب پر بہت کم حیرت کیا کرتے ہیں اور ہمیں اس پر لکھنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اسی انقلاب پر مشرق وسطیٰ کے دفاعی منصوبے اور اسرائیلی سلطنت کے مستقبل کا انحصار ہے، اس انقلاب کی ابتدا سابق شاہ فاروق کی معزولی اور جلاوطنی سے ہوئی سب لوگ خوش تھے کہ مصر کو ایک ایسے فرمانروا سے نجات ملی جو اب تک وطنی مفاد پر برطانی مفادات کو ترجیح دیتا رہا ہے اور جس نے بارہا ملک کو تقدم اور پیشروی سے روک کر برطانی گرفت کو مضبوط کیا ہے۔ اس نئی صورت حال سے متاثر ہو کر مصطفےٰ النحاس، سوئٹزرلینڈ سے چل کر مصر پہنچے اور قائدِ انقلاب جنرل نجیب کو مبارک باد دی کہ انھوں نے جو کچھ کیا خوب کیا اور اس راہ پر قدم اٹھایا جو انقلاب، پھر اصلاح اور پھر ترقی کی منزل پر لے جاتی ہے۔ مگر چند روز بعد ہی معلوم ہوا کہ جنرل نجیب کا مقصد بہت دور رس ہے اور وہ مصر کی تمام نمایاں اور مشہور شخصیتوں کو اپنی راہ سے ہٹا کر کوئی ایسا کام انجام دینا چاہتے ہیں جس کا ادراک تا حال کسی کو نہیں ہو سکا ہے جنرل موصوف نے مصر کی تمام سیاسی جماعتوں کو تطہیر کا حکم دیا اور یہ اعلان کیا کہ آئندہ انتخابات کے لئے ہر جماعت ناپسندیدہ اشخاص کو باہر کر دے اور ایسے اشخاص کو داخل کرے جن کا ماضی بدعنوانیوں کے داغ سے پاک رہا ہو چنانچہ یہ حکم وفد پارٹی کو بھی دیا گیا اور ایک مبہم سا الزام لگا کر پارٹی کی مجلس عاملہ سے کہا گیا کہ اگر مصطفےٰ نحاس وفد پارٹی کے صدر رہے تو حکومت اس جماعت کو تسلیم نہیں کرے گی اور اس کے نتیجہ میں اسے انتخابات

میں حصہ لینے کا موقعہ نہ مل سکے گا، اس آمرانہ حکم کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وفد پارٹی ایک تجربہ کار اور مقبول رہنما سے محروم ہو جائے یا پھر اس میں انتشار پیدا ہو اور اس کے بعد اس پر وار کرنے میں آسانی رہے ادھر یہ حکم وفد پارٹی کو دیا گیا اور ادھر سارے مصر میں ہلچل مچ گئی، مصری عوام وفد پارٹی کی خدمات سے واقف تھے اس لئے ان میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی، اور وفد پارٹی کو ہمت ہوئی کہ جنرل نجیب کے حکم کو چیلنج کرے اور اس سے ٹکر لینے کو تیار ہو جائے چنانچہ پارٹی کے ارکان نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ وہ اپنے لیڈر کو کسی حالت میں علیحدہ نہیں کریں گے اور یہ نعرہ لگایا کہ نحاس کے بغیر وفد پارٹی بے معنی ہے، خود مصطفےٰ نحاس نے ہمت کر کے جنرل نجیب کو متنبہ کیا کہ وہ وفد پارٹی سے علیحدہ نہیں ہو سکتے خدا اور عوام ہی انھیں علیحدہ کر سکتے ہیں۔ مگر جنرل نجیب کے کہنے پر وہ علیحدہ نہیں ہوں گے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں کچھ ایسے حالات پیدا ہو چکے ہیں جن کا پورا نقشہ ہمارے سامنے موجود نہیں ہے اور جس نے وفد پارٹی کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے محبوب رہنما کو اپنے سے جدا کر دے اور جنرل نجیب کے سامنے ہتھیار ڈال دے، یوں آسانی کے ساتھ وفد پارٹی شکست کھانے والی نہ تھی اب اگر اس نے شکست کھائی ہے تو حالات ہی کچھ ایسے سخت اور نازک ہوں گے جنہوں نے اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا اور جنرل نجیب وفد پارٹی کو زیر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

اب اس جدید صورت حال کے بعد بعض کا خیال تو یہ ہے کہ وفد پارٹی سے مصطفےٰ نحاس کی علیحدگی مصر کے مستقبل کے لئے انتہائی طور پر خطرناک ہوگی کیونکہ اس کی وجہ سے مصر میں جمہوریت کے بجائے آمریت کے قدم مضبوط ہوں گے اور مصری عوام کی سیاسی امنگیں وادیٔ نیل میں منتشر ہو جائیں گی لیکن ایک طبقہ کا یہ خیال ہے کہ وفد پارٹی کا فیصلہ مصر کے لئے خوشگوار ثابت ہوگا، اگر نحاس اپنی ضد پر قائم رہتے تو اس سے مصر کی وحدت و یگانگت پر بہت برا اثر پڑتا اور اندرونی خلفشار سے سارا ملک خانہ جنگی میں مبتلا ہو جاتا لیکن ہم سر دست اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اس بارے میں کسی مکتب خیال کی تائید کر سکیں البتہ ہم اپنے طور پر یہ ضرور کہیں گے کہ جب وفد پارٹی ہی جنرل نجیب کی ہمنوا ہو چکی اور خود مصطفےٰ اپنی علیحدگی پر راضی ہو گئے تو ہمارے لئے مناسب نہ ہوگا کہ جنرل نجیب کی پالیسی پر بے اعتدالی کے ساتھ تنقید کریں اور اس پارٹی کی حمایت میں حد سے آگے نکل جائیں جو خود وقت کے تقاضوں کے سامنے

ہتھیار ڈال چکی ہے اور جس نے شکست کھا کر اتنی بھی گنجائش نہیں چھوڑی کہ ہم جنرل نجیب کو ملامت کر سکیں اور اس کی حرکتوں کو عوام دشمن بتا سکیں! جب تک وفد پارٹی اپنے فیصلہ پر قائم رہی اور یہ یقین دلاتی رہی کہ سخاس کے بغیر وفد پارٹی بے معنی ہے ہمیں بھی یہ حق پہنچتا تھا کہ جنرل نجیب کی آمریت کو بے نقاب کریں اور اس کے فوجی انقلاب کو فساد اور تخریب کے ہم معنی بتائیں لیکن جب بنیاد ہی اپنی جگہ سے ہل گئی اور خود وفد پارٹی نے گھٹنے ٹیک دیے تو قدرتی طور پر ہماری مخالفت اور موافقت کا زور بھی کم ہو جانا چاہئے نہ معلوم مصر کے حالات کی رفتار کیا ہے اور وہاں کے عوام نے اپنے لئے کون سی راہ پسند کی ہے لیکن جہاں تک جنرل نجیب کی داخلی اور خارجی سیاست کا تعلق ہے ہم اسے شکوک و شبہات سے بالاتر قرار نہیں دے سکتے، نہر سویز سے برطانی افواج کا اخراج، سوڈان کا مکمل الحاق، مشرق وسطیٰ کا دفاعی منصوبہ اور اسرائیلی سلطنت کے متعلق مصر کا فیصلہ، یہ چار باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق ہم نہیں کہہ سکتے کہ مصر کی پالیسی کیا رہے گی اور جنرل نجیب ان کے لئے کیا کرنا چاہتے ہیں، اگر اجازت ہو تو ہم صاف صاف کہہ دیں کہ شاید جنرل نجیب سلطنت اسرائیل کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیں گے اور ترکی اور ایران کو آڑ بنا کر اس قصہ کو بھی ختم کر دیں گے جو برطانیہ کے لئے درد سر بنا ہوا ہے، برطانیہ مشرق وسطیٰ کے دفاعی منصوبہ کا تعلق تمام عرب سے ہے لیکن برطانیہ جانتا ہے کہ اس راہ میں صرف مصر ہی آڑے آسکتا ہے کیونکہ وفد پارٹی نے اسے رد کر کے اس کی پوری اسکیم کو خطرہ میں ڈال دیا تھا، لیکن جنرل نجیب کے سیاسی مزاج سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اس منصوبہ کو بعض شرائط کے ساتھ جوں کا توں مان لیں اور اس کی روشنی میں وادی نیل کے مسئلہ کو طے کرنے کی کوشش کریں۔ بہرحال ابھی کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے انتظار کرنا چاہئے کہ مصر کی نئی سیاست دنیا کو کس قسم کی دعوت فکر دیتی ہے اور مستقبل قریب میں کن حقائق کا ظہور ہوتا ہے۔

ایک دلچسپ خط کا اقتباس

از

(لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب)

مدت کے بعد مفصل خط بھیجا۔ ایک بار پڑھا، پھر مکرر پڑھا۔ پھر گھر جا کر بیوی کو پڑھ کر سنایا۔ بڑی مسرت ہوئی آپ سب احباب کی خیریت معلوم کر کے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے اور اپنی حفاظت کا سایہ قایم رکھے۔ آمین۔ آپ لوگ اکثر یاد آتے ہیں۔ یہ کوئی رسمی بات نہیں جو میں لکھ رہا ہوں۔ ایک حقیقت ہے جسے ہم دونوں شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ شاید آپ کو یاد ہو کہ مجھے موسیقی کا بھی شوق ہے۔ میں سینما کے گانوں کا شوقین نہیں۔ اس ضمن میں ایک بات یاد آگئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے غبار خاطر میں، شاید آخری خط ہے، جہاں ذکر موسیقی کا کیا ہے، وہاں ایک کتاب کا بھی ذکر کیا ہے جس کا نام "معارف النغمات" ہے اور راجہ نواب ٹھاکر علی خاں کی تصنیف ہے دو جلدوں میں یہ کتاب کئی برس ہوئے میرے پاس تھی۔ اس فن پر بہترین کتاب ہے۔ مگر کوئی اڑا کر لے گیا۔ جب غبار خاطر پڑھی تو پھر اسے حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ حال ہی میں کراچی سے یہ کتاب سیکنڈ ہینڈ دستیاب ہو گئی ہے۔ کوئی شخص ملتان سے آئے تھے اور ان کے پاس تھی۔ بہت مدت سے یہ کتاب نایاب تھی!! اب کچھ دنوں سے اس فن کا از سر نو مطالعہ شروع کر دیا ہے!!!)

عجیب بات ہے کہ ہمارے علماء نے کبھی اس فن سے احتراز نہیں کیا بلکہ بحیثیت ایک علم اور ہنر کے اس کا مطالعہ کیا ہے۔ امیر خسرو کو چھوڑیے ان کو تو اس فن کا موجد ہی سمجھا جاتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ اور آپ کے خاندان کے اور کئی بزرگ اس فن میں مہارت رکھتے تھے۔ ایک قصہ یاد آ گیا ہے نہ معلوم کہاں پڑھا ہے شاہ صاحب فتحپوری میں درس کے لئے نکلے تھے اور جامع مسجد کی طرف جا رہے تھے کہ کسی طوائف کے گانے کی قریب ہی سے آواز آئی۔ ساتھیوں کو کہنے لگے کہ یہ "پوریا دھناسری" گا رہی ہے! جب میں نے یہ قصہ

پڑھا تھا مجھے انتہائی خوشی ہوئی تھی۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس تشخیص کو کچھ وہی سمجھ سکتا ہے جو اس راگ سے واقف ہے اور جانتا ہے کہ پوریا۔ پوریا دھناسری۔ بسنت اور سوہنی راگوں سے اس کا امتیاز کرنا بڑی مشکل بات ہے، چلتے چلتے یہ کہہ دینا کہ "پوریا دھناسری" گایا جا رہا ہے کوئی خالہ جی کا گھر نہیں۔ پوریا راگ اور اس سے ملتی جلتی پوریا دھناسری، مارواراگ کے سمپورن اور سمپورن کھاڑو راگ ہیں اور ان سروں کی آمیزش اس طریقہ سے کی گئی ہے کہ جب تک ایک ہزار بار یہ دونوں راگ نہ سنے گئے ہوں ان کا شناخت کرنا محال ہے! خیر مجھے یہ فقرہ پڑھ کر انتہائی خوشی ہوئی۔ اپنے شوق کا جواز مل گیا!!! راگ میں ایک عجیب کیفیت ہے جس کا تعلق تصوف کے ساتھ ہے میں قوالی غزل اور گیتوں کو راگ نہیں سمجھتا اور نہ ہی کبھی سنتا ہوں۔ راگ خواہ کوئی بھی ہو اپنی شدھ شکل میں ایک سماں باندھ دیتا ہے جس کا تصور فقط ایک صوفی منش کے ذہن میں ہوتا ہے۔ یہ سات سروں کی آمیخت کا اثر ہے اور پھر یہ آمیخت موسم، تہوار، وقت پر منحصر ہے اور اپنی کیفیت رکھتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں راجہ نواب ٹھاکر علی خاں بہت بڑے صوفی ہوں گے جو اس پائے کی کتاب لکھ گئے۔ آپ میرس کالج آف میوزک لکھنؤ کے پرنسپل بھی تھے اور ۱۹۲۲ء میں میں نے آپ سے لکھنؤ ہی میں ستار بھی سنی تھی اس وقت آپ بہت بوڑھے ہو چکے تھے لیکن جب انگلیاں ستار سے نغمے جھاڑتی تھیں تو ان میں بڑی جان محسوس ہوتی تھی، جیسے تار کو کھینچ کر وہ اپنے روح کے ساتھ اس کا رابطہ قائم کر رہے ہیں۔ ماہر موسیقی جب مختلف راگوں کے مظاہرے کرتا ہے خواہ گلے سے یا انگلیوں سے تو جو شکل وہ راگ کی پیدا کرتا ہے وہ اس کے خود اپنے روحانی مدارج کا عکس ہوتا ہے اور جوں جوں مدارج بدلتے ہیں اس کی ادائیگی میں تخلیق آتی جاتی ہے اور وہ کئی کئی طریق سے سرگم کے اتار چڑھاؤ کو علم ریاضی کی طرح بدلتا جاتا ہے، درحقیقت یہ اس کی اپنی روح کی آواز ہوتی ہے ــــــــــــــــ

دیکھئے کیا لکھ گیا ہوں۔ معاف فرمایئے۔ نہ فقہ نہ حدیث نہ تفسیر نہ تاریخ! آپ کہتے ہوں گے یہ شریف آدمی منحرف ہو گیا ہے۔ نہیں صاحب یہ بات نہیں، غیر شعوری طور پر اپنی صفائی پیش کر گیا ہوں۔ عمر ڈھلتی ہے تو تصوف کی طرف لگاؤ ہوتا جاتا ہے اور تصوف ایک بے لگام سی چیز ہے! اس کا راہ و رسم کبھی کوئی نہیں جہاں سُر مل گیا بس وہیں "سم" بھی تلاش کر دیا۔!!! پھر تو طبلے کی تال میں بھی سرور معلوم ہوتا ہے جیسے لوگ گدھے کی آواز سے تشبیہ دیتے ہیں۔

ادبیات

غزل

از

جناب الم مظفر نگری

یہ طے ہے سجدے ہمیں کرینگے نگاہ سے دل سے سر سے پہلے
نیازِ الفت ہوا آشنا تو ذرا ترے سنگِ در سے پہلے

پہنچ ہی جاتا ہے تا بمنزل ہر ایک اہلِ سفر سے پہلے
جو راہ رو زندگی میں گزرے مقامِ فکر و نظر سے پہلے

اسی نے سینچا تھا گلستانِ وفا کو خونِ جگر سے پہلے
لیا تھا جس نے مزہ خودی کا مآلِ غم کے اثر سے پہلے

تجلیِ حسن کو نکھارا مری نگاہِ جواں اثر نے
کوئی بھی جلوہ نہ دل نشیں تھا نگاہِ جلوہ نگر سے پہلے

حقیقتِ سوز و ساز کے تھے اگرچہ محفل میں راز داں سب
کوئی نہ سمجھا کہ جل بجھا کیوں پتنگ شمعِ سحر سے پہلے

بہار آنے پہ لے اڑونگا قفس کو بھی کیا حدِ چمن تک
یہ مشورہ ہم صفیر کر لوں میں قوتِ بال و پر سے پہلے

ذرا ٹھہر کر ذرا سنبھل کر حریمِ فطرت میں ہونگے داخل
نگاہ کچھ لطف تو اٹھا لے جمالِ بیرونِ در سے پہلے

حقیقتہً کامیابِ منزل ہے اپنی منزل پہ وہ مسافر
سفر کا انجام سوچ لے جو ارادۂ ہر سفر سے پہلے

کہاں گوارا تھا زندگی میں جنوں کو احسانِ رنگ و بو کا
میں خود ہی دیوانہ بن گیا ہوں بہارِ دیوانہ گر سے پہلے

یہ جوشِ طوفانِ اشکِ پیہم اب اسکے روکے سے کیا رکیگا
تھی بے خبر چشمِ خونفشاں خود مذاقِ خونِ جگر سے پہلے

جہاں ہیں قصرِ شہنشہی کی بلندیاں رشکِ بامِ گردوں
وہیں تھی پستی کی حکمرانی حکومتِ بام و در سے پہلے

ذرا بھی رسمِ وفا نہ سمجھے حریفِ آدابِ محفلِ غم
اٹھا کے پروانوں کے جنازے اٹھے نمودِ سحر سے پہلے

ابھی ہے مشغول ذکرِ ہستی سنائے گا داستانِ دل بھی
ذرا الم ہو چکے تو فارغ فسانۂ مختصر سے پہلے

"سوئے منزل تیز گام!"

رات کے سائے لپکتے آرہے تھے تیز۔ اور گاؤں کی پگڈنڈیوں پر۔ برف و یخ کے درمیاں
جادہ پیما اک جواں تھا ہاتھ میں پرچم اُٹھائے یہ اٹل نعرہ تھا جس کا غیر معمولی نشان

"سوئے منزل تیز گام!"

اس کی آنکھیں اس کی سنجیدہ جبیں کے سائے میں کوندتی تھیں جیسے تیغِ تیز قدرے بے نیام
اور اک ناقوسِ سیمیں کا مسلسل زیر و بم دے رہا تھا ایک انجانی زباں میں یہ پیام

"سوئے منزل تیز گام!"

اُس نے دیکھی مسکراتی منزلوں کی روشنی۔ جل رہی تھی خانگی چولہوں میں "گرم و نرم" آگ
جگمگاتے تھے بلندی پر نظارے برف کے اس کے ہونٹوں پر مگر جاری تھا یہ دھیما سا راگ

"سوئے منزل تیز گام!"

"ٹھہر جا اللہ!" عورت نے کہا "آرام کر! اپنے بوجھل سر کا تکیہ میرے سینہ کو بنائے"
نوجواں نے معذرت کی عالمِ رخصت میں یوں آہ بر لب ـــ سُرمگیں آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے

"سوئے منزل تیز گام!"

"دیکھ! ہے سوکھی ہوئی شاخِ صنوبر پُرخطر! گر رہے ہیں برف کے پُرہول تودے ہوشیار!"
نوجواں کو یوں "خدا حافظ" کہا دہقان نے آئی اک آواز اس سے بھی بلند و بیقرار

"سوئے منزل تیز گام!"

صبح کی پو پھٹ رہی تھی، معبدوں کے بام و در محو تھے راہب کے نغماتِ فلک پرواز میں
یک بیک اک اجنبی آواز پر نبضِ صبا چونک اُٹھی بزمِ سحرگاہی کے سوز و ساز میں

"سوئے منزل تیز گام!"

پہلوئے سنگ میں ملی اک نوجواں رہرو کی زیست
دور برفستان میں ـــ برف و فنا سے ہمکنار
لیکن اس کے منجمد ہاتھوں کی برفیلی گرفت
تھی اُسی نعرہ کے پرچم پر ابھی تک استوار
"سوئے منزل تیز گام!"

دور ـــ اک بجھتی ہوئی ٹھنڈی شفق کے سائے میں ـــ اُس نے پایا "خوبصورت موت" کا کیفِ دوام
نیلگوں افلاک سے ٹوٹے ستارے کی طرح ـــ آرہا تھا پُر مسرت، دور افتادہ پیام
"سوئے منزل تیز گام!"

(ہنری ورڈسورتھ لونگ فیلو) ـــ مترجمہ شمس نوید

شئون علمیہ

جوہریات

آج ۷ برس ہوئے کہ جاپان میں ہیروشیما پر جوہری بم برسائے گئے۔ جوہری اشعاع کے جو اثرات اس وقت پیدا ہوئے تھے وہ آج بھی لوگوں میں بیماریوں کا سبب بنے ہوئے ہیں ان لوگوں کے علاج سے جو تجربے حاصل ہوئے ہیں ان کی بنا پر امریکی ڈاکٹر علاج تجویز کریں گے اگر امریکہ پر جوہری بم برسائے گئے۔ لیکن اس کے لئے جو کمیٹی کام کر رہی ہے اس کو توقع ہے کہ سارے واقعات کو جمع کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے کے لئے ابھی دس برس اور لگیں گے۔ اس کمیٹی کی جانب سے ایک شفاخانہ بھی کھولا گیا ہے جہاں ہزاروں جاپانی جو جوہری بم سے متاثر ہوئے ہیں علاج کے لئے آتے رہتے ہیں۔

جو لوگ بچ گئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ان کی طاقت کم ہو گئی ہے، وہ جلد تھک جاتے ہیں اور جلد جلد بیمار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹروں کا یہ کہنا ہے کہ جو لوگ اس انوکھے تجربے سے دوچار ہوئے ہیں وہ اپنی بعد کی بیماریوں کو اسی کا نتیجہ بتلاتے ہیں۔ حالانکہ اس کی قطعی شہادت نہیں بہم پہنچ سکی ہے کہ جوہری اشعاع کا اثر عام کمزوری کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

امریکی حکومت کی طرف سے دعویٰ کیا گیا ہے کہ اب ایسے مکانات بنانا ممکن ہیں جو جوہری بم کو برداشت کر سکیں۔ ایسے مکانات کی تفصیلات ایک کتابچے میں بیان کی گئی ہیں جو حکومت کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

ان مکانات کی تعمیر میں یہ اصول ملحوظ رکھا گیا ہے کہ جوہری بم سے جو جھکڑ پیدا ہوتا ہے اس کا دباؤ ایک سکنڈ کے اندر صفر ہو جاتا ہے۔ اس لئے عمارتیں ایسی ہوں گی کہ جھکڑ کا مقابلہ کرنے کی بجائے وہ اس کا ساتھ دیں گی یعنی عمارتیں جھونکے کے ساتھ آہستہ آہستہ جھک جائیں گی اور اس طرح اس کو جذب

کریں گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ عمارت بدشکل ہو جائے لیکن ویسے برقرار رہے گی۔

انگلستان میں حال ہی میں سر رچرڈ گریگوری کا انتقال ہوا ہے۔ ان کی عمر ۸۸ سال کی تھی، اور ان کی خصوصیت یہ تھی کہ آخر دم تک جوہری جنگ کے خلاف رہے۔

آنجہانی ایک موچی کے بیٹے تھے لیکن اپنی قابلیت کی بنا پر وہ ایک سربرآوردہ ماہر فلکیات تھے وہ برٹش ایسوسی ایشن کے صدر بھی تھے۔ ۱۹۴۶ء کے جلسہ کے خطبۂ صدارت میں انھوں نے کہا تھا کہ "جوہری بم یا اس جیسے کسی اور حربے سے انسانوں کی بستیوں کی بستیاں برباد کردینے کے لئے کوئی اخلاقی جواز حاصل نہیں ہے۔ یہ "نار" حقیقت میں "نور" کے خلاف ہے اور جرم ہے"

آنجہانی مشہور ہفتہ وار رسالہ "نیچر" کے ایڈیٹر بھی تھے۔ ان کا ایقان تھا کہ "فطری اور مافوق فطری صداقت کی تلاش ہی انسان کا سب سے بڑا جوہر ہے"

آنجہانی برسٹل میں پیدا ہوئے تھے۔ مدرسہ کی تعلیم ختم کرکے وہ رائل کالج آف سائنس میں شریک ہوئے لیکن مدرس زیر تربیت کی حیثیت سے۔ وہاں ان کی ملاقات مشہور سائنسی افسانہ نویس ایچ۔ جی۔ ویلز سے ہوئی۔ دونوں میں گہری دوستی ہو گئی۔ دونوں نے مل کر ایک کتاب لکھی اور اس کو ۲۶۰ روپے میں فروخت کردیا۔ جب ویلز کا انتقال ہو گیا تو اس نے اپنے "دوست قلبی" کے لئے ۲۶۰ روپیکی رقم چھوڑی۔

آنجہانی کچھ عرصہ تک کونس کالج لندن میں فلکیات کے پروفیسر بھی رہے۔ ۱۹۱۹ء میں ان کو سر کا خطاب ملا۔ ۱۹۳۳ء میں ان کو رائل سوسائٹی کا فیلو منتخب کیا گیا۔

ہارول (انگلستان) میں برطانیہ کا جوہری توانائی کا تحقیقی ادارہ قائم ہے۔ یہاں سے تابکار ہمجا (Radioactive Isotopes) ہندوستان کو مہیا کئے جاتے ہیں۔ ہارول میں ایک ہمجائی مدرسہ (آئسوٹوپ سکول ISOTOPE SCHOOL) بھی ہے جہاں ہندوستانی سائنسداں تابکار اشیاء کے استعمال کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔

امن کی اغراض کے لئے تابکار اشیاء کی برآمد میں برطانیہ ہی پیش پیش ہے۔ چنانچہ سال مختتمہ جون ۱۹۵۲ء میں ۳۷ ملکوں کو ہوا کے ذریعہ ہجاؤں کے ۳۰۰۰ سے زیادہ مرسلات روانہ کئے گئے۔

یہ ہمجاتہ صرف طبی ضروریات میں کام دیتے ہیں بلکہ سائنسی تحقیق اور صنعتی اداروں میں بھی ان کا استعمال روز افزوں ہے

جوہری توانائی کے کارخانوں سے جو "فضلہ" بچتا ہے اس کے متعلق امریکی سائنسدانوں نے دریافت کیا ہے کہ یہ "فضلہ" بعض غذاؤں اور تلف ہو جانے والی اشیاء کو نہایت خوبی کے ساتھ جراثیم سے پاک کر دیتا ہے۔ چنانچہ مچیگن اور کیلیفورنیا کی جامعات میں اس کے تجربی مظاہرے ہو چکے ہیں۔

تابکار اشیا سے ان غذاؤں پر جو شعاعیں ڈالی گئیں تو غذا کو خراب کرنے والے جراثیم ہلاک ہو گئے اور یہ کام بغیر حرارت کی مدد کے انجام پایا۔ اس سے مفید جراثیم ہلاک ہونے نہیں پاتے ان تجربوں میں جو شعاعیں استعمال کی گئیں وہ تابکار کوبالٹ کے ایک اسطوانے سے خارج ہوتی تھیں خود کوبالٹ کو تابکار بنانے کے لئے اس پر جوہری بمباری کی گئی۔ ان شعاعوں سے سائنس دانوں کو محفوظ رکھنے کے لئے سیسے کا ایک موٹا غلاف استعمال کیا گیا۔

فضائیات انگلستان میں ہیڈلے پیج کے ہوائی جہاز کے کارخانے میں ایسے ہوائی جہاز تیار ہو رہے ہیں جو ۲۴ گھنٹوں میں تین مرتبہ لندن سے نیویارک کا سفر کریں گے۔ ان میں ۱۴۰ مسافروں کی گنجائش ہو گی۔

اس جہاز کا نام ایچ۔ پی ۹۷ ہے۔ ابھی یہ ابتدائی منزلوں میں ہے اور اس کی تفصیلات ابھی راز میں ہیں۔ لیکن کارخانے والوں نے اتنا بتایا ہے کہ اب یہ جہاز ۵۰۰۰۰ پونڈ کا بوجھ اٹھا سکے گا۔ اس کی پرواز بڑی بلندی پر ہو گی اور اس کی رفتار تقریباً آواز کی رفتار ہو گی یعنی قریب ۷۵۰ میل فی گھنٹہ اس رفتار کی وجہ سے یہ جہاز لندن سے نیویارک تک ۳ چکر ۲۴ گھنٹوں میں کر لے گا۔ اور اگر ایسے تین ہوائی جہاز چلیں تو سال بھر میں وہ اتنے لوگوں کو لے جائیں گے جتنے کو پانی کے بڑے بڑے

جہازوں میں بھی نہیں جاتے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ نیویارک سے لندن تک کا ۳۴۵۵ میل کا سفر، ۱۲۲ مسافروں اور سامان کے ساتھ بغیر ٹھیرے ساڑھے چھ گھنٹوں میں طے ہوگا۔ اور لندن سے نیویارک کا سفر، ۱۱۷ مسافروں اور سامان کے ساتھ ساڑھے ۷ گھنٹوں میں طے ہوگا۔ اسی طرح سڈنی اور سنگاپور کے درمیان ۳۹۱۵ میل کا سفر ۹۴ مسافروں اور سامان کے ساتھ یہ جہاز ۸ گھنٹوں میں طے کرے گا۔

جہاز کے اعلیٰ درجے میں ۹۶ نشستیں الگ الگ اوپر کے عرشہ میں پھیلی ہوں گی۔ سیاحوں کے لیے اوپر کے عرشے میں ۱۵۰ اتہری نشستیں ہوں گی۔ نیچے کے عرشے میں صرف ۱۶ مسافروں کے لئے جگہ ہوگی اعلیٰ عرشے میں ڈریسنگ روم ہوں گے اور شراب خانہ بھی ہوگا۔

خطبہ افتتاحیہ برطانوی انجمن ترقی سائنس

ملبعاسٹ (آئرستان) میں برطانوی انجمن ترقی سائنس کے سالانہ جلسہ میں انجمن کے صدر پروفیسر اے۔ دی۔ ہل نے اپنے خطبہ افتتاحیہ میں کوئی ۴۰۰۰ ارکین کے سامنے یہ سوال پیش کیا کہ کیا دنیا میں سائنسدانوں نے خیر سے زیادہ شر پیدا کیا ہے؟

پروفیسر موصوف کی عمر اس وقت ۶۵ سال کی ہے اور وہ یونیورسٹی کالج لندن میں پروفیسر ہیں۔ وہ اس وقت ورزشی فعلیات (Physiology) پر سند کا درجہ رکھتے ہیں ان کو نوبل انعام بھی مل چکا ہے ان کا خیال ہے کہ سائنس اپنی حدود سے آگے نکل گئی ہے۔ اخباروں نے خبر دی ہے کہ جلسہ کے شریک ہونے والوں سے جب سوال کا جواب مانگا گیا تو انھوں نے اعتراف کیا کہ شر کا پلڑا جھک رہا ہے گو اس میں قصور سائنس دانوں کا نہیں ہے۔

ان لوگوں کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ سائنسی انکشافات کو روکا نہیں جا سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کا غلط استعمال کیا جائے۔ جیسا کہ جراثیمی جنگ اور جوہری بم سے ظاہر ہوتا ہے۔

پروفیسر موصوف نے اپنے خطبہ میں ذکر کیا ہے کہ حفظان صحت، ضبط وبا، شیر خواروں کی شرح اموات میں کمی، اور اوسط عمر کے اضافہ نے دنیا کی آبادی کو بہت بڑھا دیا ہے۔ ابھی برسوں تک قدرتی

وسائل بالخصوص غذا کی کمی کا اثر ظاہر ہوتا رہے گا۔

عالمی قحط پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر موصوف یہ سوال قائم کرتے ہیں کہ کیا یہ مناسب ہے کہ ڈاکٹر اور سائنس داں گنجان آبادی اور کم غذا والے علاقوں میں شرح اموات کی کمی کو روک دیں تا آنکہ لوگوں میں اتنا احساس پیدا ہو جائے کہ ضبط تولید کے ذریعہ وہ اپنی تعداد کم کر دیں؟ پھر خود ہی پروفیسر موصوف جواب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ اس سوال کا جواب قطعی "ہاں" میں نہیں دیا جا سکتا۔

آگے چل کر انھوں نے فرمایا کہ

"آج کل انسانی حقوق کا بہت چرچا ہے لیکن کیا انسانی حقوق میں بے حد حساب تکثر بھی شامل ہے جو محتاط تر لوگوں کے لئے ایک گراں بار ہے۔"

انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ کم غذا والے ملکوں میں لوگوں کی زندگیوں کو طویل تر کر دینے سے یہ اندیشہ ہے کہ ان کی اولاد کی عمریں کم ہو جائیں اور ان کی اولاد در اولاد قحط کا شکار ہو جائے اس پر پروفیسر موصوف ایک دوسرا سوال کرتے ہیں۔

"اگر اخلاقی اصول ہم کو شر کے ارتکاب سے باز رکھتے ہیں تاکہ "خیر" حاصل ہو تو کیا ہم "خیر" کرنے میں حق بجانب ہوں گے اگر اس "خیر" کا نظر آنے والا نتیجہ "شر" ہو۔

موصوف کی تجویز یہ ہے کہ بیماریوں کو قابو میں رکھنے کے ساتھ ساتھ دنیا کے لوگوں بالخصوص عورتوں کو خاندانی منصوبہ بندی کے لئے بھی تعلیم دینے کی اتنی ہی ضرورت ہے۔ [ع]

نقشِ حکمت

جناب احمق پھپوندی کے نام سے ہندوستان کا تقریباً ہر پڑھا لکھا واقف ہے۔ آپ کا شمار ہندوستان کے معدودے چند شعراء میں ہے۔ آپ کے کلام کا انداز ظرافت رنگینی اور شوخی کے ساتھ پُر حکمت بھی ہوتا ہے "نقشِ حکمت" احمق صاحب کے کلام کا بہترین اور تازہ ترین مجموعہ ہے۔ مجموعہ کو تین عنوانوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ اشارات، اعبارات، خطابات، آخر میں منتخب غزلیات کا حصہ رکھا گیا ہے صفحات ۱۰۳ قیمت مجلد عہ

تبصرے

حکیم الامت از مولانا عبدالماجد دریابادی۔ تقطیع کلاں ضخامت ۷۱۴ صفحات کتابت وطباعت بہتر۔ قیمت پہلے آٹھ روپے آٹھ آنے پتہ:-(۱) دارالمصنفین اعظم گڈھ (۲) صدیق بک ایجنسی کچہری روڈ لکھنو

مولانا عبدالماجد دریابادی کو حضرت مولانا تھانوی سے شرف ملاقات ونیاز پہلی بار ۱۹۲۸ء میں حاصل ہوا تھا۔ اس پہلی ملاقات کا نقش اتنا گہرا ہوا کہ اس میں روز بروز جلاہی ہوتی رہی اور حضرت مولانا کی وفات جولائی ۱۹۴۳ء تک برابر قایم رہا اس مدت میں مولانا کو بارہا تھانہ بھون میں کبھی طویل اور کبھی مختصر قیام کرکے مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے بالمشافہہ اکتسابِ فیض وسعادت کا موقعہ ملا اور خط وکتابت کا سلسلہ تو برابر جاری رہا لیکن اس کتاب سے عام خیال کے برخلاف یہ پہلی بار معلوم ہوا کہ فاضل مرتب باقاعدہ مرید حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب سے ہیں مولانا تھانوی سے ان کا علاقہ صرف ارادت وعقیدت اور استفاضہ واستفادہ کا تھا اگرچہ یہ تعلق پیری اور مریدی کے رشتہ سے بھی کہیں زیادہ گہرا اور عقیدتمندانہ تھا) یہ مراسلت دینی۔ تفسیری۔ فقہی اور کلامی مسائل سے متعلق ہوتی تھی اور چونکہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ فاضل مرتب کے لئے ایک خاندانی بزرگ۔ اعلیٰ درجہ کے مشیر کار اور مربی وسرپرست کی حیثیت بھی رکھتے تھے اس بنا پر خطوط میں نجی معاملات اور امورِ خانگی کا تذکرہ بھی بے تکلف ہوتا تھا۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ جہاں تک امراضِ نفس اور ان کے علاج کا تعلق ہے واقعی حکیم الامت تھے۔ اس بناء پر ادھر سے ان نجی معاملات کی نسبت جو ارشادات اور مشورے ہوتے تھے وہ بے شبہ نسخہائے شفا کی حیثیت رکھتے تھے۔ فاضل مرتب نے انھیں بالمشافہہ ملاقاتوں کے تاثرات اور باہمی مراسلات ومکاتبات کے موتے قلم سے مولانا تھانوی کے علمی وعملی اور اخلاقی

وروحانی کمالات و فضائل کا یہ مرقع تیار کیا ہے جو دیدہ زیب بھی ہے اور روح پرور بھی۔ جو سبق آموز بھی ہے اور بصیرت افروز بھی؛

ان مراسلات میں تفسیر۔ حدیث۔ فقہ۔ کلام۔ معاشرت۔ سلوک و تصوف کے سینکڑوں مسائل اور کہیں کہیں ادب اور شعر و سخن کے لطیف نکات زیر گفتگو آ گئے ہیں جو عوام ہی نہیں علماء اور طلباء کے لئے بڑے کام کی چیزیں ہیں۔ علی الخصوص مراسلات کا وہ حصہ جو مولانا تھانوی کی تفسیر بیان القرآن اور فاضل مرتب کے انگریزی اور اردو ترجمہ و تفسیر قرآن سے متعلق ہے علوم عربیہ کے طلبا اور قرآن مجید کا ذوق رکھنے والے حضرات کے لئے بہت مفید اور کار آمد ہے یہ حصہ صرف حضرت مولانا کے علم و فضل کا آئینہ دار نہیں، بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مرتب نے ایک طرف تو بیان القرآن کا انتہائی دیدہ ریزی سے مطالعہ کر کے اس کے لفظی و معنوی خامیوں کی نشاندہی کی ہے اور مولانا نے ان کو انتہائی خوشی اور جذبہ شکر گزاری کے ساتھ قبول فرما کر تنبیہات کے عنوان سے ان کی تصحیح فرما دی ہے اور دوسری جانب قرآن مجید کے تاریخی قصص اور جغرافیائی مقامات کی تحقیق و تلاش کے سلسلہ میں تاریخ عہد قدیم۔ اور کتب یہود و نصاری کا بڑے استقلال اور صبر و تحمل کے ساتھ وسیع مطالعہ کیا ہے اور اس طرح قرآن جو کہ "مصدق لما معکم" ہے اس کی تصدیق خود ان لوگوں سے کرانی چاہی ہے۔ جو اسے کتاب الٰہی نہیں مانتے یہ تفسیر ہماری نظر سے گذری نہیں ہے۔ اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ فاضل صاحب تفسیر کو اس مقصد میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اگر وہ اس وادی ہفتخواں کو عبور کر گئے ہیں تو اس زمانہ میں قرآن مجید کی خدمت کا یہ بہت اہم اور ضروری گوشہ تھا جو پورا ہو گیا۔

اس کتاب سے حضرت مولانا تھانوی کے اخلاق و عادات کی نسبت ایک نیا اور خوشگوار انکشاف بھی ہوتا ہے۔ عام طور پر مشہور یہ ہے اور بقول مولانا عبدالماجد کے اس تشہیر کے لئے بڑے ذمہ دار خود مولانا کے بعض مرید اور خلفا بھی ہیں ـــــ کہ مولانا درشت مزاج۔ تشدد پسند اور خشک طبع تھے لیکن زیر تبصرہ کتاب کے مرقع میں نظر آتا ہے کہ مولانا اپنے مریدوں کے لئے بے شک ایک سخت گیر

استاد تھے لیکن عام تعلقات اور معاشرتی معاملات میں بڑے نرم خو۔ شگفتہ مزاج۔ خندہ جبیں اور بامروت و متواضع تھے اور اختلافِ خیال و مسلک کے باوجود تعلقات اور لوگوں کی حیثیت و مراتب کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مولانا عبدالماجد چونکہ مولانا سے باقاعدہ بیعت نہیں تھے اسی بنا پر موصوف کے ساتھ مولانا کا برتاؤ اس سے مختلف تھا جو مولانا اپنے باقاعدہ مریدوں کے ساتھ ان کے تذکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن کی غرض سے کرتے تھے۔

اس اعتراف کے ساتھ اس کتاب میں دو باتیں ایسی بھی ہیں جو ہمیں کھلتی ہیں ایک یہ کہ اگرچہ مولانا تھانوی بار بار فرماتے ہیں کہ مجھ کو تعبیرِ خواب سے مناسبت نہیں پھر ہر خواب قابلِ اعتبار بھی نہیں لیکن اس تنبیہہ کے باوجود فاضل مرتب نے کتاب میں اپنے اور اپنی اہلیۂ محترمہ کے خواب جگہ جگہ اس کثرت سے نقل کیے ہیں کہ ان سے حقیقت پسند طبیعت اکتا جاتی ہے اور خود فاضل مرتب کا دامن خودرائی کے داغ سے بے عیب نہیں رہتا۔ مولانا تھانوی نے ان تمام خوابوں کا جواب بہت مختصر اور بے اعتنائی کے ساتھ دیا ہے اور جو کچھ فرمایا ہے اس سے بھی سلوک و تصوف کا یا دین کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا، اس بناء پر ان خوابوں کی نقل سے اس علم کے سوا کہ فاضل مرتب کی قوتِ متخیلہ بڑی حساس ہے اور کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔

علاوہ بریں دوسری بات یہ ہے کہ فاضل مرتب نے تفسیر قرآن کے بعض تاریخی اور جغرافیائی مباحث کی نسبت جو اشکالات و ایرادات مولانا تھانوی کو لکھے ہیں وہ علمی اعتبار سے بہت قوی اور وزنی ہیں اور مولانا چونکہ تاریخ عہد قدیم اور جغرافیہ سے آشنا نہیں تھے اس بناء پر مولانا کے جوابات اعتراض کے مقابلہ میں ہلکے اور کم وزن ہیں۔ یہ وہی بات ہوگئی جو امام رازی کی تفسیر کبیر کے متعلق کہی جاتی ہے کہ امام نے فرقِ باطلہ کی طرف سے اس قدر پُرزور گفتگو کی ہے کہ پھر خود ان کے جوابات اس زور کے نہیں ہو سکے ہیں مولانا عبدالماجد صاحب کو چاہیے تھا کہ یا تو ان اشکالات کا اس کتاب میں ذکر ہی نہ کرتے اور اگر کیا تھا تو ان سے متعلق خود اپنی تحقیق بکمال و تمام نقل کر دیتے ان کی طرف محض اشارہ کرنا کافی نہیں تھا۔

کتاب کی زبان و بیان کا کیا کہنا ہے! اس کے لئے خود فاضل مرتب کا نام سب سے بڑی ضمانت ہے۔ اس بنا پر اس کا مطالعہ دینی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے ہم خرما و ہم ثواب کا مستحق ہوگا۔

تاریخ ہندی قرون وسطیٰ۔ جلد دوم از جناب قاری محمد بشیر الدین صاحب پنڈت بدایونی ایم۔ اے علیگ تقطیع کلاں ضخامت ۴۷۵ صفحات

کتابت و طباعت بہتر قیمت ہے پتہ: (۱) مولوی عبدالہادی خاں تاجر کتب بازار بہادر گنج شاہجہاں پور

(۲) مولوی محمد ابراہیم جنرل مرچنٹ بازار کٹرہ سواروں ضلع ایٹہ۔

ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ پر اردو اور انگریزی میں بہت کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن جس نقطہ نظر اور جس ترتیب اور معلومات کے ساتھ یہ کتاب لکھی گئی ہے اس کے اعتبار سے یہ سب سے الگ ہے، فاضل مصنف انگریزی اور فارسی کے علاوہ سنسکرت اور ہندی زبان کے بھی فاضل ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اس دور سے متعلق معلومات کا اصل ذخیرہ فارسی، سنسکرت اور ہندی میں ہی ہے اس بنا پر فاضل مصنف نے انھیں زبانوں کے آخذ کی روشنی میں ہند کے قرونِ وسطیٰ کی تاریخ تین جلدوں میں مرتب کی ہے لیکن بعض مصالح کی بنا پر اشاعت جلد دوم کی مقدم رکھی گئی ہے جلد اول و سوم بھی مکمل و مرتب ہیں ان کی اشاعت بعد میں ہوگی۔ یہ جلد سلطان محمد غوری سے لے کر سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے عہد تک پر مشتمل ہے جس میں بادشاہوں کے شخصی و درباری حالات اور ان کے جنگی کارناموں کے ذکر کے ساتھ ساتھ مستند ذرائع معلومات کی بنیاد پر بڑی تفصیل سے یہ بھی بتایا ہے کہ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے قبل مسلمانوں کی علمی۔ ادبی۔ اخلاقی اور سماجی حالت کیا تھی اور اس کے بالمقابل خود اس ملک کے اصل باشندوں کے مذہبی۔ اخلاقی اور معاشرتی احوال کیا تھے ان میں کیا کیا رسوم اور کن کن عادات و خصائل نے جڑ پکڑ لی تھی ان میں مذہبی اور روحانی فرقے کتنے تھے۔ ان کے عقائد اور اعمال و افعال کیا تھے اور ان کے علوم و فنون کا معیار کیا تھا، علاوہ بریں سیاسی اور تمدنی و معاشرتی اعتبار سے وہ کس سطح پر تھے پھر جب مسلمان آئے تو انھوں نے اپنی مذہبی تعلیم اور اسلامی کلچر کے زیر اثر یہاں کے لوگوں کے ساتھ جنگ اور صلح دونوں حالتوں میں کیا معاملہ کیا۔ انھوں نے یہاں کے تمدن پر

کیا اثر ڈالا۔ اور اس ملک کے اقتصادی و معاشی حالات کو بہتر بنانے کے لئے کیا کیا اور یہاں کے علوم و فنون۔ ادب اور آرٹ۔ مذہب اور کلچر کے ساتھ کیا برتاؤ برتا۔ اس سلسلہ میں فاضل مصنف نے سنسکرت اور ہندی کے ماخذ کی مدد سے جو معلومات بہم پہنچائی ہیں وہ اس لحاظ سے بہت قابل قدر ہیں کہ یہ معلومات اس درجہ تنوع و رنگارنگی کے ساتھ اور اس قدر مستند طریقہ پر کسی دوسری کتاب میں اس ترتیب کے ساتھ یکجا نہیں مل سکتیں ہم فاضل مصنف کو ان کے اس علمی کارنامہ پر مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ باقی دو جلدیں بھی جلد شائع کریں گے۔ البتہ یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اسلامی معلومات کے فراہم کرنے میں موصوف نے کسی قدر سہل انگاری سے کام لیا ہے اگر وہ اردو کی چند کتابوں اور رسالوں پر قناعت کرنے کے بجائے عربی کے اصل ماخذ کی طرف رجوع کرتے تو غالباً اپنے موضوع بحث کے لئے اور زیادہ اچھا اور متنوع مواد حاصل کر سکتے تھے۔ فاضل مصنف کی سادہ طبعی کا یہ حال ہے کہ اردو کے بہت ہی گھٹیا درجہ کے بعض روزناموں تک کے حوالے درج ہیں۔ اگر کتاب کے آئندہ اڈیشن میں اس کی اصلاح کر دی جائے تو علمی اور تحقیقی اعتبار سے کتاب میں یک رنگی اور یکسانیت پیدا ہو جائے گی۔

کتاب کے شروع میں پروفیسر محمد حبیب مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا ایک مقدمہ بیس صفحات کا اصل انگریزی میں اردو ترجمہ کے ساتھ شریک اشاعت ہے جس میں موصوف نے اپنے مخصوص انداز فکر کے مطابق فلسفہ تاریخ کے موجودہ مادی نقطہ نظر کے ماتحت اس عہد کے معاشی احوال کا سراغ لگا کر واقعات متعلقہ کی تحلیل و توجیہ کی ہے اور اس طرح ایک متاع کہنہ کو جدید آئینہ پیمائش سے ناپنے کی سعی کی ہے۔ پروفیسر صاحب کے اس نقطہ نظر سے موافقت کرنا تو آسان نہیں ہے البتہ اس میں شبہ نہیں کہ یہ مقدمہ ایک مستقل بلند پایہ۔ علمی مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے جو بہر حال تاریخ کے ایک طالب علم کے لئے فکر و نظر کی ایک نئی راہ کھولتا ہے اس سلسلہ میں ہم اس پر تعجب و حیرت اور کسی قدر افسوس کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پروفیسر محمد حبیب انگریزی کی طرح اردو کے بھی بہت اچھے لکھنے والے ہیں۔ چنانچہ شمع آگرہ کی ادارت کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی وہ طویل افسانے اردو میں لکھتے رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ایک اردو کتاب کا مقدمہ انھوں نے بجائے اردو کے انگریزی میں ہی لکھنا پسند کیا ہے اس کے جواب میں اگر یہ کہا جائے کہ پروفیسر صاحب نے مقدمہ میں بعض ایسی باتیں ارشاد فرمائی ہیں کہ اگر وہ اردو میں ہوتیں تو ممکن تھا کہ اس پر ہنگامہ برپا ہو جاتا تو اس میں شک نہیں کہ یہ بات پروفیسر صاحب کے لئے بڑی حد تک ایک عذر بن سکتی ہے لیکن اس کا کیا جواب ہوگا کہ جناب شیخ عبدالرشید صاحب صدر شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی نے بھی اپنے دو صفحہ کی تقریظ انگریزی میں ہی لکھی ہے حالانکہ صرف یہ تقریظ ہی ہے اور بس! ص

بُرہان

جلد بست ونہم شمارہ نمبر ۵

نومبر ۱۹۵۲ء مطابق صفر المظفر ۱۳۷۲ھ

فہرست مضامین

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

ہندوستان میں مسلمانوں نے عظیم جانی و مالی نقصانات اٹھا کر اور ان پر صبر کر کے اس ملک میں رہنے اور اس کو اپنا وطن عزیز سمجھنے کی جو قیمت ادا کی ہے اس کی وجہ سے انسانیت، شرافت اور انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ ان کے ساتھ ہمدردی کی جاتی ان کی دلجوئی اور دلداری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جاتا اور ان کے گہرے زخموں پر رحم و کرم کے مرہم کا پھایہ رکھنے کی کوشش کی جاتی۔ لیکن افسوس ہے کہ گنگا الٹی ہی بہہ رہی ہے ملک کے بعض نامور لیڈر جو اس ملک کی پرانی تہذیب اور یہاں کے کلچر کی نمائندگی کرنے کے دعویدار ہیں اور جو مستقبل کے نگار خانہ کو فراموش شدہ ماضی کے نقش و نگار سے پھر از سر نو آراستہ کرنے کے لئے ہر وقت بے تاب و مضطرب نظر آتے ہیں کوئی دن نہیں جاتا کہ وہ مسلمانوں کے زخموں پر مرہم کا پھایہ رکھنے کے بجائے اور ان پر نمک پاشی کی کوشش نہ کرتے ہوں وہ اپنی تقریروں اور بیانات میں جلی کٹی باتیں کہہ کر مسلمانوں میں اور بد دلی اور بیزاری نہ پیدا کرتے ہوں۔ جس کلچر اور جس تہذیب کی علمبرداری کا وہ دعویٰ کرتے ہیں اگر ان کی یہ ذہنیت اور ایک کمزور و غیر موثر اقلیت کے ساتھ ان کا یہ رویہ اس کلچر اور اس تہذیب کا صحیح نمونہ ہے تو کسی کو اس میں شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ دنیا اس کلچر کی نسبت کیا رائے قائم کرے گی اور عدل و انصاف کے محکمہ سے اس کے متعلق کیا فیصلہ صادر ہو گا۔

تو نیکو نشیتن چہ کردی کہ ما بکنی نظری   بجز آنکہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

اتر پردیش میں اردو کو علاقائی زبان تسلیم کرانے کے لئے دستخطوں کی جو ایک مہم چند ماہ سے جاری ہے وہ ایک بالکل لسانی تحریک ہے۔ اور اس کو کسی طرح بھی فرقہ وارانہ تحریک نہیں کہا جا سکتا اس میں ہندو، مسلمان، عیسائی اور سکھ جن کی مادری زبان اردو ہے سب ہی برابر کے شریک ہیں لیکن انگریزی میں ایک مثل مشہور ہے کہ کتے کا کوئی برا نام رکھ دو اور اسے مار ڈالو، شری پرشوتم داس ٹنڈن ایسے بعض نامور لیڈروں کا اردو کے بارے میں رویہ یہی ہے اور وہ انگریزی کی مذکورہ بالا کہاوت پر

عمل کر رہے ہیں دوپہر کے سورج کی طرح یہ روشن حقیقت ہے کہ اردو عرب، ایران، شام و فلسطین اور مصر و عراق وغیرہ کسی اسلامی ملک سے اپنا نسلی اور خاندانی تعلق نہیں رکھتی۔ وہ اسی ملک میں پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی اور جوان ہو کر پروان چڑھی یہی ملک اس کی جنم بھومی ہے اور یہاں کی سب قوموں نے اس کی تعمیر و تشکیل اور اس کی تربیت و ترقی میں برابر کا حصہ لیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جس طرح عربی میں ہر باشندۂ ہند کو ہندی کہتے ہیں اور ہندو کو ہندو کی یا ہندوسی کہتے ہیں اسی طرح اردو کو عربی میں ہندیہ کہا جاتا ہے، اگر اردو زبان کے افعال و اسماء اور حروف کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں ۷۵ فی صدی الفاظ خود ہندوستان کی پرانی بھاشاؤں کے ملیں گے اور ۲۵ فی صدی الفاظ عربی فارسی اور ترکی وغیرہ کے پائے جائیں گے لیکن اس ضد اور ہٹ کا کچھ ٹھکانا ہے کہ ان سب کھلی کھلی حقیقتوں اور وضاحتوں کے باوجود ٹنڈن جی یو پی کی اس خالص لسانی تحریک کو ہندوستان میں عربی تمدن کی بنیاد قائم کرنے کا مرادف سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جو لوگ اس تحریک کی مدد کر رہے ہیں وہ ملک میں پھر دو قومی نظریہ کی تخم ریزی کرنا چاہتے ہیں۔!!

تعجب کی بات یہ ہے کہ ٹنڈن جی اکثریت کے فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن باتیں وہ اس شخص کی سی کرتے ہیں جو احساس کمتری میں مبتلا ہو جس شخص میں برتری کا احساس ہوتا ہے اس میں بلند نظری عالی حوصلگی اور ایک بے نیازی و درگذر کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن احساس کمتری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس مرض کے مریض میں تنگ دلی، چڑچڑا پن اور جھنجھلاہٹ کے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں۔ ٹنڈن جی کا اردو کی لسانی تحریک کو ہندی کی مخالفت پر محمول کرنا درآنحالیکہ ہندی پورے ملک کی ریاستی زبان ہے اور بلا اختلاف رائے اس کو ہر ایک نے تسلیم کر لیا ہے اور اس پر عمل بھی ہو رہا ہے۔ نفسیات کی زبان میں بجز احساس کمتری کے اس کو اور کس چیز پر محمول کیا جائے وہ آخر ہندی کو اس قدر کمزور کیوں سمجھتے ہیں کہ حکومت اور اہل ملک کی ہر ممکن امداد و اعانت کے باوجود اگر اردو کو اتر پردیش میں ایک علاقائی زبان کی حیثیت دے دی گئی تو اس سے ہندی پر زوال آ جائے گا اس ملک میں اردو کی طرح اور بھی تیرہ زبانیں ہیں جو بولی جاتی ہیں اگر ان زبانوں کی علاقائی حیثیت ہندی کے لئے

کوئی خطرہ نہیں ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ غریب اردو کی علاقائی حیثیت اس کو کیا نقصان پہنچا سکتی ہے

ٹنڈن جی اپنے بعض کمالات و اوصاف کے اعتبار سے قابل قدر آدمی ہیں لیکن ہم کو ان کی انصاف پسندی سے یہ توقع تھی کہ جس طرح انھوں نے اردو کی نسبت اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے اسی طرح یوپی اور دوسرے صوبوں میں جو بعض اخبارات و رسائل نے اسلام اور پیغمبر اسلام کی توہین کرکے ہندو شرافت و کلچر کو رسوا کیا ہے ان کی نسبت بھی وہ دو چار الفاظ مذمت کے کہہ دیتے کیونکہ ہندو تہذیب و کلچر اور ہندو روایات و مذہب کے لئے اگر کوئی کلنگ کا ٹیکہ اور اس کے لئے بدنامی اور رسوائی کا باعث اگر کوئی چیز ہے تو وہ دوسرے مذاہب کو برا بھلا کہنا اور ان کے پیغمبروں کی توہین و تذلیل کرنا ہے۔ ٹنڈن جی بار بار وفاداری اور غیر وفاداری کا چرچا کرتے ہیں لیکن انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ دنیا کی آنکھوں میں خاک نہیں جھونک سکتے ہر وہ شخص جس کی آنکھیں بند نہیں اور کان کھلے ہوئے ہیں فیصلہ کر سکتا ہے کہ غیر وفادار وہ ہیں جو اپنی مادری زبان کا حق منوانا چاہتے ہیں یا وہ جو ملک کے دستور کے خلاف ایک بڑے طبقہ کو اس کے طبعی حق سے محروم کرنا چاہتے ہیں اور جو اس مقصد کے لئے باشندگان ملک میں باہمی نفرت و عناد پیدا کرکے قومی یکجہتی کو صدمہ پہنچا رہے ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے کروروں روپیہ کے اوقاف جگہ جگہ اس کثرت سے ہیں کہ اگر ان کو ایک مرکزی نظام کے ماتحت رکھ کر ان کی قرار واقعی آمدنی اور خرچ کی نگرانی کی جائے تو آج مسلمانوں کی قومی تعمیر کا کوئی کام ایسا نہیں ہے جو حسن و خوبی کے ساتھ انجام نہ پا سکے لیکن عام طور پر اوقاف جس زبوں حالی کا شکار ہیں ان کی وجہ سے وہ مقاصد حاصل نہیں ہو رہے ہیں جن کے لئے وہ قایم کئے گئے تھے۔ اسی خرابی کو دور کرنے کے لئے مولوی محمد احمد صاحب کاظمی نے پارلیمنٹ میں ایک بل پیش کیا ہے۔ حکومت نے رائے عامہ طلب کرنے کے لئے اس بل کو شائع کر دیا ہے۔ کسی مسلمان کو اس بل کی افادیت۔ اہمیت اور ضرورت سے انکار نہیں ہو سکتا اس لئے امید ہے کہ مسلمان عام طور پر اس کی تائید کریں گے اور اپنی رائے اپنے اپنے صوبوں کے چیف سکریٹری کو بھیج دیں گے۔

خطبۂ صدارت

از

(مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی)

برادر محترم جناب مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی ناظم ندوۃ المصنفین نے جمعیۃ علمائے ہند کی حالیہ تعلیمی کانفرنس میں جو بتاریخ ۱۸ / ۱۹ / ۲۰ / اکتوبر احمد آباد میں منعقد ہوئی تھی۔ بحیثیت صدر جو فاضلانہ خطبہ پڑھا تھا وہ اگرچہ متعدد اخبارات میں شائع ہو چکا ہے لیکن اول تو اب اس میں بہت سے اہم اور ضروری اضافہ ہو گئے ہیں پھر یہ صرف ہنگامی اور وقتی چیز نہیں بلکہ ایک مفید اور پر از معلومات علمی مقالہ بھی ہے اور اس میں وقت کے ایک نہایت اہم اور ضروری مسئلہ یعنی مسلمانانِ ہند کی تعلیمی اور دینی ضرورت پر بڑی خوبی کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اس لئے ہم اس کو قارئین برہان کی ضیافت کے لئے ذیل میں تمامہا درج کرتے ہیں۔ "اڈیٹر"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہٗ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہٗ المبعوث الی کافۃ الناس بشیراً ونذیراً وداعیاً الی اللہ باذنہ وسراجاً منیراً۔

امابعد اساطین امت، علماء اعلام، محترم بزرگو اور دوستو! میری پہلی اخلاقی ذمہ داری یہ ہے کہ اس عزت افزائی کے لئے دل کی گہرائیوں سے آپ حضرات کا شکریہ ادا کروں، جو منصب از راہِ حسنِ ظن آپ نے مجھے سونپا ہے سچ یہ ہے کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں، تاہم تعمیلِ حکم کو اپنا خوشگوار فرض سمجھ کر حاضرِ خدمت ہو گیا ہوں۔

بزرگانِ ملت!

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے یہ کانفرنس جس کو کامیاب بنانے کے لئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں، وقت کی ضرورتوں اور تقاضوں کے لحاظ سے نہایت اہم تعمیری مقاصد اپنے اندر رکھتی ہے۔

۱۹۴۷ء کے انقلاب اور ملک کے بدلے ہوئے حالات کے بعد یہ پہلا تاریخی اجتماع ہے جو خاص اسی مقصد اور اسی مطمحِ نظر کے مختلف گوشوں پر غور کرنے کے لئے وجود میں آیا ہے، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے آزاد ہندوستان میں بنیادی جبری تعلیم کے ساتھ بنیادی دینی تعلیم کا مسئلہ فی الحقیقت وقت کا سب سے اہم اور نازک مسئلہ بن گیا ہے جس پر ہمیں اس اجتماع میں غور کرنا ہے۔

بے شبہ آج کی سیاست جس میں بھوک کے نام پر بڑے بڑے کھیل کھیلے جاتے ہیں اس میں روٹی کا مسئلہ بھی کچھ کم اہم نہیں رہا ہے لیکن میں عرض کروں گا کہ اگر انسان جوہرِ انسانیت سے محروم ہو اور انسانیت کا دامن شرافتِ انسانی سے خالی ہو جائے تو پھر صرف روٹی اور پیٹ کے مسئلہ کے حل ہو جانے سے یہ مظلوم دنیا اس امن و سکون سے آشنا نہیں ہو سکتی جس کے لئے آج ہر شخص بے چین و مضطرب نظر آتا ہے۔

حضراتِ کرام! آپ کا یہ بابرکت اجتماع جس میں عام مقاصدِ تعلیمی کے علاوہ مسلمان بچوں اور بچیوں کی تعلیمی ضرورتوں اور نزاکتوں کے ایک ایک پہلو پر خاص طور سے غور کیا جا رہا ہے، اس کی حقیقی عظمت کی کھلی ہوئی دلیل یہ ہے کہ خود زبانِ وحی نے بھی اسی چیز کو انسانی مجد و شرف کا مدار بنایا ہے وہ صرف علم کی روشنی تھی جس کے سامنے فرشتوں کو سربسجود ہونے کا حکم دیا گیا اور فرمایا گیا۔

اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ — فرشتو! آدم کے سامنے پیشانی رکھ دو

اپنے سے بظاہر پست مخلوق کو جس کی فطرت خیر کے ساتھ شر سے بھی آشنا ہو فرشتے جو خیر محض اور عصمت و عفاف اور طاعت و تقدس کا پیکر ہیں کیوں سجدہ کریں؟ اس لئے کہ آدم کو ایک ایسی خصوصیت بخش دی گئی ہے جس سے فرشتے محروم ہیں اور یہ شرف و خصوصیت تمام فضیلتوں پر بھاری اور خاک کے پتلے آدم کو خدا کا نائب اور خلافتِ الٰہی کا مستحق بنانے والی ہے وہ خصوصیت کیا ہے صرف "علم" چنانچہ

فرشتے بہت جلد حقیقت کی تہ تک پہنچ گئے اور علم و حکمت سے اپنی درماندگی اور محرومی کا نہایت خوبصورت لفظوں میں اقرار کرلیا اور کہہ اٹھے سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ

اسی دولت کو انبیاء علیہم السلام کا ترکہ قرار دیا گیا۔ اِنَّ الانبیاءَ لم یورثوا دیناراً ولا درھماً انما ورثوا العلم[1] یعنی اللہ کے پیغمبر جو چیز ترکے اور وراثت میں چھوڑتے ہیں وہ چاندی سونے کے ڈھیر نہیں ہوتے صرف علم ہوتا ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ یہی تعلیم و تعلم ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت اور تشریف آوری کے مقاصد میں ایک اہم مقصد ٹھہرایا۔ ایک مرتبہ مسجد کے ایک کنارے پر کچھ اصحاب وظیفہ میں مشغول تھے اور کچھ حضرات دوسری طرف حلقہ بنائے علمی مذاکرہ کر رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے آپ نے دونوں مجلسوں کو پسند فرمایا، لیکن اس مجلس کو افضل قرار دیا جس میں علمی مذاکرہ ہو رہا تھا پھر آپ اسی مجلس میں رونق افروز ہو گئے اور فرمایا

انی بعثت معلماً[2]

میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں

---

[1] اس حدیث کے باقی ٹکڑے یہ ہیں، مشہور صحابی ابوالدرداء جامع دمشق میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہنے لگا ابوالدرداء! میں آپ کی خدمت میں مدینۃ الرسول سے صرف ایک حدیث کی روایت کے لئے حاضر ہوا ہوں ابوالدرداء نے اس شخص سے دریافت کیا تو پھر کیا تمہیں یہاں اور کوئی کام نہیں تھا۔ کیا تم صرف طلب حدیث کے لئے اتنی مسافت طے کرکے آئے ہو، سائل نے جواب دیا یقیناً میں یہاں کسی دوسرے کام کے لئے نہیں آیا، نہ تجارت کے لئے اور نہ کسی دوسرے مقصد کے لئے رسول اللہ کے برگزیدہ صحابی نے سوال کرنے والے کی طلب صادق کا امتحان لینے کے بعد یہ حدیث اس کو سنائی من سلك طریقاً یطلب فیه علماً سلك اللہ به طریقاً الی الجنة وان الملائكة لتضع اجنحتها رضاً لطالب العلم وان العالم لیستغفر له من فی السموٰت ومن فی الارض والحیتان فی جوف الماء وان فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلة البدر علی سائر الکواکب وان العلماء ورثة الانبیاء وان الانبیاء لم یورثوا دیناراً ولا درهماً (الحدیث) ابوداؤد و ترمذی۔ اس باب میں صفوان بن عسّال کی مشہور حدیث بھی یاد رکھنے کے لائق ہے اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ صفوان آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضور اس وقت مسجد میں تشریف رکھتے تھے، صفوان نے عرض کیا یا رسول اللہ طلب علم کے لئے حاضر ہوا ہوں، حضور نے فرمایا مرحباً لطالب العلم طالب علم کا کیا کہنا۔ اللہ کے فرشتے اس کو اپنے پروں کے سایہ میں لے لیتے ہیں (جامع بیان العلم صـ۳۲)

[2] اس سے پہلے یہ الفاظ ہیں اما هؤلاء فیدعون اللہ ویرغبون الیه فان شاء اعطاهم وان شاء منعهم واما هؤلاء فیتعلمون ویعلمون الجاهل وانما بعثت معلماً (جامع بیان العلم ص[illegible])

بنابریں جمیتہ علماء کی زیر نگرانی تعلیمی کانفرنس کا یہ انعقاد نہایت ہی برمحل ہے، کیوں کہ انبیاء علیہم السلام کے اس مقدس ترکہ کے وارث حضرات علماء ہی ہو سکتے ہیں۔

علم و مراتب علم | حضرات! علم اپنے لفظی معنے کے لحاظ سے بہت وسیع لفظ ہے اس کے دامن زندگی اور اس کی ضرورتوں کے تمام گوشوں تک پھیلے ہوئے ہیں، آفتاب کے روشن ہوتے کا علم بھی علم ہے جس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جس کی صداقت کا پورا یقین رکھتے ہیں اور زمین کی گردش کا علم بھی علم ہے جس کو ہم نے کبھی نہیں دیکھا اور جس کے متعلق دنیا کے ارباب علم کی رائے بھی ایک نہیں ہے، چاند کی روشنی اور ستاروں میں مریخ کے وجود کا علم بھی علم ہے، ارباب علم کہتے ہیں کہ اس ستارے میں ذی روح اور باحواس مخلوق موجود ہے جو ہم سے تعلق قایم کرنا چاہتی ہے اور ان تمام باتوں کا علم بھی علم ہی کہلاتا ہے جو وہم و گمان کی سرحد سے آگے نہیں بڑھتیں اسی طرح کھانا پکانے کے طریقوں کا جاننا بھی علم کہلاتا ہے، کھیت بونے اور درخت لگانے کے طریقوں کو بھی علم ہی کہا جاتا ہے۔ ایک انجنیر کو عظیم الشان عمارتوں اور فلک بوس قلعوں کی تعمیر کے جو طریقے سکھائے جاتے ہیں وہ بھی علم ہے، ہوائی جہاز اور دخانی جہاز جو فضاؤں اور سمندروں کی موجوں کو چیرتے ہوئے مشرق اور مغرب کے ڈانڈے ملاتے ہیں، ان کو بنانے اور چلانے کا علم بھی علم ہی ہے، زہریلی گیس، تار بیڈو، اٹیم بم اور ہائیڈروجن کا علم بھی علم ہے، حکومتوں کا نظم و نسق سنبھالنے اور فوجوں کی پریڈ اور جنگی داؤ پیچ سکھانے کا علم بھی علم ہے۔ سائنس، کیمیا، حساب اور جغرافیہ کا علم بھی علم ہے، پھر زمین و آسمان کی پیدائش کی حکمت معلوم کرنے اور رات، دن کی گردش سے عبرت حاصل کرنے کا علم بھی علم کہلاتا ہے، لیکن سب کو معلوم ہے کہ یہ تمام علم یکساں نہیں ہیں جس طرح یقین اور وہم و گمان میں کھلا ہوا فرق ہے اسی طرح معلومات کے لحاظ سے بھی علم کے بے انتہا مراتب قایم ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے باورچی خانہ کے علم کے مقابلہ میں کشیدہ کاری اور زردوزی کے علم کا درجہ اونچا ہے اور فن خیاطت کے مقابلہ میں حساب و جغرافیہ کے فن کو اہمیت حاصل ہے۔

فن تعمیر ایک شریف اور قابلِ قدر فن ہے، مگر اس وقت دنیا کے تمدن میں اس سے زیادہ بلند مرتبہ کیمسٹری اور سائنس کو حاصل ہے۔ جہاز رانی اس وقت تمام دنیا کے لئے رشتہ اتصال کا حکم رکھتی ہے

لیکن دنیا جانتی ہے کہ سیاست اور جہاں بانی کا مرتبہ جہاز رانی سے کہیں اونچا ہے، پھر جس طرح مادہ اور روح، مخلوق اور خالق کے درمیان کھلا ہوا امتیاز ہے، اسی طرح وہ علم جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اس کے صحیح تصور اور اس کے احکام وارشادات سے ہو، اس کا مرتبہ دنیا کے تمام علوم سے بلند ہے اتنا بلند کہ ہر مقام پر پکار پکار کر کہا جا سکتا ہے ۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک

علم کی عظمت شرافت کا تقاضا شریعتِ مقدسہ نے اجازت دی ہے کہ آپ جو علم چاہیں، حاصل کریں۔ آپ بے تکلف حساب، سائنس، منطق، فلسفہ، جغرافیہ غرض ہر علم حاصل کر سکتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ ایسے علوم کی تحصیل آپ کے لئے جائز ہوگی، بلکہ اگر کسی خاص علم سے اجتماعی زندگی کی منفعت اور ملت کا مفاد وابستہ ہے تو شریعت کی تعلیم کے مطابق اس علم کی تحصیل اور اس میں مہارت پیدا کرنا ضروری ہو جائے گا، کون نہیں جانتا کہ مردِ مجاہد کے لئے فنِ سپہ گری حاصل کرنا ہر چیز سے زیادہ ضروری ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ دہقانی امت ــــ جس نے پیشۂ زراعت اختیار کر کے پورے ملک کی فراہمی غذا کا بار اپنے ذمہ لیا ہے، اس کے لئے زراعت کے طریقوں کو جاننا اور اس میں مہارت پیدا کرنا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں نہایت محمود و مستحسن ہے، اس پر اس کو اجر و ثواب ملتا ہے، انتہا یہ کہ درختوں کے پھلوں اور کھیتوں کی بالوں سے خدا کی مخلوق جو نفع اٹھاتی ہے اس کا اجر بھی کاشتکار کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے چنانچہ ارشادِ نبوی ہے ۔

ما من مسلم یزرع زرعاً او یغرس غرساً فیاکل منہ انسان او طیر او بھیمۃ الا کانت لہ صدقۃ[1]	جو مسلمان کھیتی بوئے یا پودا لگائے پھر کوئی انسان یا پرندہ یا مویشی اس میں سے کچھ کھائے تو وہ اس کے لئے صدقہ ہوگا[1]

اسی طرح پارچہ بافی، نجاری اور چرم سازی وغیرہ وہ تمام صنعتیں جو تمدن اور رہن سہن کی ضروریات

---

[1] ترمذی شریف باب ما جاء فی فضل الغرس [2] ایک دوسری حدیث میں جس کے راوی ابو ایوب انصاریؓ ہیں یہ الفاظ ہیں ما من رجل یغرس غرساً الا کتب اللہ لہ من الاجر قدر ما یخرج من ذالک الغرس (مجمع الزوائد ج ۴) ایک حدیث میں فرمایا جس نے کھیتی لگائی اور اس سے کسی پرندے یا کسی بھی ضرورت مند نے کچھ کھا لیا تو یہ اس بونے والے کے حق میں صدقۂ جاریہ ہوگا عن خلاد بن السائب عن ابیہ بحوالہ مجمع الزوائد ج ۴ ص ۶۷

کو پورا کرتی ہیں ان کا علم حاصل کرنا بھی باعث اجر ہے اور مذہبی خدمت کے درجے میں آجاتا ہے۔ ارشادات نبوی میں یہ تمام تصریحات موجود ہیں، نوجوانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور بشارتوں کو معلوم کریں اور جس علم کے حاصل کرنے میں بھی وہ مصروف ہیں اس میں پوری مہارت اور کمال پیدا کریں۔

اس مرحلہ پر دو باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اول یہ کہ اسلام نے خود علم کو مطلوب و مقصود ٹھہرایا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے

الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن فحیث وجدھا فھو احق بھا[1] یعنی حکمت و دانش کی ہر ایک بات مسلمان کا گم شدہ سرمایہ ہے، وہ جس جگہ بھی ملے سب سے زیادہ وہی اس کا مستحق ہے منشاء یہ ہے کہ جس طرح اپنے گم شدہ سرمایہ کی تلاش میں انتہائی جدوجہد صرف کی جاتی ہے، اور جب وہ مل جاتا ہے تو اس کو اپنی چیز اور اپنی دولت سمجھ کر محفوظ رکھا جاتا ہے اور اس کو ترقی دینے کی فکر ہوتی ہے ایسے ہی حکمت (علم و دانش کی باتیں)، ایک مسلمان کا قیمتی سرمایہ ہے۔ ضروری ہے کہ اس کی تلاش و جستجو میں ممکن حد تک جدوجہد صرف کر دی جائے۔ اور جب وہ ہاتھ لگ جائے تو اس کو محفوظ رکھنے اور ترقی دینے کی کوشش کی جائے۔

دوسرے یہ کہ شرف علم کا قدرتی تقاضا ہے کہ اس کا نصب العین بلند ہو، بے شبہ دنیوی علوم دنیوی آپ اس لئے حاصل کر سکتے ہیں کہ ان کے ذریعہ دنیوی ترقی حاصل کی جائے لیکن اگر آپ نے اپنے نصب العین کو صرف اپنے ذاتی مفاد تک محدود کر دیا اور اپنی منفعت ہی آپ کے سامنے رہی، تو اسے خود غرضی کہا جائے گا۔ علم جیسی گراں قدر دولت کو آپ صرف اپنے ذاتی اغراض پر خرچ کر رہے ہیں تو یہ علم کی تعظیم نہیں، توہین ہوگی۔

آں حضرتؐ نے اس حقیقت کو اس طرح ظاہر فرمایا

ان اشر الناس یوم القیامۃ عالم لا ینتفع بعلمہ — یعنی اللہ تعالیٰ کے یہاں بدترین شخص وہ ہوگا جس کا علم نفع بخش نہ ہو (مشکوٰۃ شریف)

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوا

---

[1] ترمذی شریف صفحہ ۹۶ ج ۲۔ آخر کتاب العلم

"جس شخص سے علم کی کوئی بات دریافت کی جائے اور وہ ازراہ بخل اس کو نہ بتائے تو قیامت میں سزا کے طور پر اس کے منہ میں آگ کا لگام ڈالا جائے گا۔ (ابوداؤد)

ایک جگہ فرمایا

مثل علم لا ینتفع بہ کمثل کنز لا ینفق منہ (مسند احمد و دارمی)

جس علم سے دوسروں کو نفع نہ پہنچے اس کی مثال ایک ایسے خزانہ کی ہے جس میں سے خرچ بھی کچھ نہ کیا جائے اور وہ یوں ہی زمین میں گڑ کر رہ جائے۔

پس دنیوی علوم و فنون کی تحصیل کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ اس کے ذریعہ پورے ملک کے سرمایہ کو ترقی دی جا سکے اور یہ نہ صرف اپنے عروج اور ترقی کا بلکہ ملک و ملت کی فلاح و نجاح کا ذریعہ بن سکے۔

پھر وہ علوم جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے اوامر و احکام سے ہے چوں کہ ان کا مرتبہ فقہا کے تمام علوم سے برتر ہے پس ضروری ہے کہ ان کا نصب العین بھی سب سے بلند و بالا ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی مخلوق کی بہترین خدمت۔

تعلیم و تعلم اسلام کی نظر میں | بزرگان کرام! علم و دانش کو مسلمان کی گم شدہ پونجی قرار دے کر جس اثر انگیز پیرایہ میں اس کی جستجو کی حرص پیدا کی گئی ہے، اس کے لئے کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے

منہومان لا یشبعان طالب علم وطالب مال (ترمذی شریف)

دو حریص ایسے ہیں جن کا پیٹ کبھی نہیں بھر سکتا۔ ایک طالب علم اور دوسرا طالب مال۔

ایک دوسری حدیث میں فرمایا

ان اللہ اوحیٰ الیّ انہ من سلک مسلکا فی طلب العلم سہلت لہ طریق الجنۃ (بیہقی فی شعب الایمان)

اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ وحی کی ہے کہ جو طالب علم کے راستے پر پڑ گیا میں اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہوں

اس باب میں وسعت نظر کی انتہا یہ ہے کہ ذوق طلب کو حکمت و دانش تک ہی محدود نہیں رکھا

گیا بلکہ اسرائیلیات کے متعلق بھی ارشاد ہوا حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج (بخاری شریف وغیرہ)

اہل علم اور اشاعت تعلیم کی حوصلہ افزائی کی یہ کس قدر روشن مثال ہے کہ غزوۂ بدر میں جو لوگ قید ہوئے تھے ان سے فدیہ لے کر ان کو رہا کیا گیا، لیکن وہ نادار قیدی جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان کا فدیہ یہ مقرر کیا گیا کہ چند لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں اور رہائی حاصل کرلیں۔ چنانچہ کاتب وحی حضرت زید بن ثابت رضؓ نے اسی طرح لکھنا سیکھا تھا[۱]۔

جن علوم کا تعلق اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، دین کے بنیادی عقائد اور مکارم اخلاق سے ہے چونکہ عالم انسانیت کا امن اور انسان کی حقیقی ترقی ان سے وابستہ ہے ان کو حاصل کرلے۔ ان کو محفوظ رکھنے اور ان کو دوسروں تک پہنچانے کی خاص طور پر ترغیب دی گئی، فرمایا گیا

نضر اللّٰہ عبداً سمع مقالتی	اللہ تعالیٰ اس کو تروتازہ رکھے جس نے میری بات سُنی،
فحفظھا ووعاھا واداھا[۲]	اس کو پوری طرح یاد رکھا اور اس کو ٹھیک ٹھیک دوسروں تک پہنچا دیا۔

جو لوگ ان علوم کی اشاعت اور تعلیم و تعلم سے امنِ عالم کے قیام میں مدد دیں گے ان کے متعلق ارشاد ہے کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں یہاں تک کہ آسمانوں کے فرشتے، بلوں میں رہنے والی چیونٹیاں اور دریا کی مچھلیاں بھی ان کے لئے دعاء خیر کرتی ہیں[۳]۔

—— ان علوم کو حاصل کرنے والے طلبۃ العلم کے متعلق اعلان ہے کہ ان کی یہ تمام جدوجہد اللہ کے راستے میں ہے[۴]۔ جب وہ پڑھنے جاتے ہیں تو فرشتے ان کے لئے اپنے پر بچھاتے ہیں۔ اور اگر وہ اس جدوجہد میں وفات پاجاتے ہیں تو شہادت کا مرتبہ حاصل کرتے ہیں[۵]۔

مسلمان اور علمی خدمات ہمارے بزرگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو سینہ سے لگایا۔ اور ان کی تعمیل کو زندگی کا نصب العین بنالیا۔ چنانچہ ایک جماعت ایسی پیدا ہوئی جس نے اسلامی دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کو جمع کیا، ان کے منشا اور مقصد کو سمجھا، جس جگہ کسی عالمِ دین،

---

[۱] مسند احمد و طبقات ابن سعد [۲] ترمذی و ابوداؤد [۳] ترمذی شریف و مسند احمد وغیرہ [۴] ترمذی شریف و ابوداؤد شریف [۵] ترمذی شریف

حافظِ حدیث اور مفسرِ قرآن کی خبر سُنی اس کے یہاں پہنچے، اس سے استفادہ کیا اور پھر علوم و اخلاقِ اسلامی کے امین بن کر دنیا کے دوسرے گوشوں میں پہنچے۔ اور جو کچھ حاصل کیا اس کو دنیا کے کونے کونے میں پہنچا دیا یہی وجہ ہے کہ آج نہ صرف مصر و شام اور عراق و ایران، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے آشنا ہیں بلکہ چین و جزائر شرق الہند اور افریقہ کے صحرائی علاقوں میں بھی قال اللہ و قال الرسول کے نغمے سنے جا رہے ہیں۔

اسی کے ساتھ ایک دوسری جماعت پیدا ہوئی جس نے حکمت و دانش کی جستجو میں دنیا کی طنابیں کھینچ دیں یورپ اور ایشیا کے ذخیروں کو تلاش کیا اور وہ بوسیدہ اوراق جو مقفل صندوقوں میں بند تھے ان کو دوبارہ شیرازہ بند کیا، دنیاء قدیم کے فلسفیوں اور عقل مندوں نے جو نظریات قایم کئے تھے۔ سائنس، کیمیا، فلسفہ اور منطق وغیرہ کے متعلق جو تحقیقات فراہم ہو چکی تھیں۔ اور وہ کِرم خوردہ کتابوں میں اس وجہ سے سمٹی ہوئی تھیں۔ کہ ان کے قدردان دنیا سے مٹ چکے تھے ان کو دوبارہ بساطِ تحقیق پر جلوہ افروز کیا اور دنیا کے ترقی پذیر تمدن کی بنیادیں از سرِ نو استوار کر دیں۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے کیا خوب کہا ہے؛

مورخ جو ہیں آج تحقیق والے — تفحّص کے ہیں جن کے آئیں زالے
جنھوں نے ہیں عالم کے دفتر کھنگالے — زمیں کے طبق سر بسر چھان ڈالے

عرب ہی نے دل اُن کے جا کے اُبھارے
عرب ہی سے وہ بھرنے سیکھے ترارے

وہ لقمان و سقراط کے دُرِّ مکنوں — وہ اسرارِ بقراط و درسِ فلاطوں
ارسطو کی تعلیم، سولن کے قانوں — پڑے تھے کسی قبرِ کہنہ میں مدفوں

یہیں آ کے مہرِ سکوت ان کی ٹوٹی
اسی باغِ رعنا سے بو ان کی پھوٹی

یہ تھا علم پر واں توجہ کا عالم — کہ ہو جیسے مجروح جویائے مرہم
کسی طرح پیاس اُن کی ہوتی نہ تھی کم — بجھاتا تھا آگ ان کی باراں نہ شبنم

حریمِ خلافت میں اونٹوں پہ لد کر!

چلے آئے تھے مصر و یوناں کے دفتر!

لئے علم و فن اُن سے نصرانیوں نے — کیا کسبِ اخلاق روحانیوں نے

ادب ان سے سیکھا صفاہانیوں نے — کہا بڑھ کے لبیک یزدانیوں نے

ہر اک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا

کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

اور پھر کہتے ہیں۔

سُنے گوشِ عبرت سے گر جا کے انساں — تو واں ذرہ ذرہ یہ کرتا ہے اعلاں

کہ تھا جن دنوں مہر اسلام تاباں — ہوا یاں کی تھی زندگی بخش دوراں

پڑی خاکِ اسپتھنز میں جاں یہیں سے

ہوا زندہ پھر نام یوناں یہیں سے

آج دنیا غزالی، ابن رشد، ابن حزم، فارابی، بوعلی سینا، ابن مسکویہ، ابن خلدون، ماوردی اور راغب وغیرہ محققوں سے نہ صرف واقف ہے بلکہ ان کے خوانِ علم کی خوشہ چیں ہے جو قدیم فلاسفہ اور دورِ حاضر کے ماہرین کے درمیان واسطہ بنے اور جنہوں نے پرانے ذخیروں کو بنا سنوار کر اور ان میں بہت کچھ اضافہ کر کے نئے ہاتھوں میں دے دیا۔

هندوستان اور مسلمان — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت اور تعلیم سے مسلمانوں کے خمیر میں طلب علم کا جو ذوق بے پناہ پیدا ہو گیا تھا دنیا کے دوسرے ملکوں پر اس کا کیا اثر پڑا۔ اس کی داستان نہایت طویل ہے اور اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی اس وقت زبانِ قلم پر نہیں آ سکتا۔ صرف ہندوستان کی تاریخ سے ہی شہادت طلب کی جائے تو اس یقین کے لئے کافی وجوہ موجود ہیں کہ سلطنتِ مغلیہ کے آخری دور تک ہندوستان کی علمی حالت آج کل کے کسی متمدن اور مہذب ملک سے کم نہیں تھی۔

چنانچہ سلطان عالم گیر جن کو یورپین مورخین نے خاص طور پر نشانۂ ملامت بنایا ہے، ان کے عہد حکومت کے یورپین سیاح کپتان الگزنڈر ہملٹن کی شہادت یہ ہے، شہر ٹھٹھہ (سندھ) میں چار سو کالج مختلف

علوم و فنون کے موجود تھے۔ یہ ٹھٹہ کی حالت تھی جو پایہ تخت دہلی سے بہت دور تھا اور خود دہلی کی حالت یہ تھی کہ مقریزی کی شہادت کے مطابق سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے اساتذہ کی تنخواہیں شاہی خزانے سے مقرر تھیں۔ تعلیم اس قدر عام تھی کہ کنیزیں تک حافظ قرآن اور عالم ہوتی تھیں۔ خود سلطان بڑا فاضل تھا۔ قرآن مجید کے علاوہ اکثر فنون کی کتابیں حفظ یاد تھیں، ہدایہ جیسی کتاب کی چاروں جلدیں تو اس کو ازبر تھیں۔[۱] سلطنت بیجاپور کے مشہور حکمراں سلطان محمد عادل شاہ نے اپنے ممالک محروسہ میں جو مدرسے قایم کئے تھے ان میں حکومت کی جانب سے طلبہ کو عام کھانے کے علاوہ خاص کھانے بریانی وغیرہ بھی دی جاتی تھی اور ایک طلائی سکہ ماہانہ وظیفہ میں ملتا تھا سلطان محمد فیروز شاہ تغلق نے جس شان و شوکت کے مدرسے اپنے زمانۂ حکومت میں تعمیر کرائے تھے دہلی کے ایک مدرسہ فیروز شاہی سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، مورخ ضیاء برنی کے بیان کے مطابق پایہ تخت دہلی کی کوئی عمارت خوبصورتی اور محل وقوع کے لحاظ سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی اور حسن انتظام اور تعلیم کی عمدگی کے اعتبار سے یہ مدرسہ اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ دیہات میں تعلیم کے متعلق سر تھامس منرو نے لکھا تھا۔

"ہر گاؤں میں ایسے مدرسے موجود ہیں جن میں نوشت و خواند اور حساب کی تعلیم ہوتی ہے۔"

ان نامور سلاطین کے بعد خاص اس زمانہ میں جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے قدم ہندوستان میں جم چکے تھے اور دہلی کا تخت سیاسی شعبدہ بازوں کا تماشہ گاہ بنا ہوا تھا یعنی اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل تک بقول پروفیسر ماکس میلز بنگال میں اسی ہزار مدرسے تھے انڈیا ڈسٹرکٹ اسکولوں سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کمپنی کی اجارہ داری کے زمانے میں جو غیر آئینی حکومت قایم ہوئی۔ وہ اپنی خود غرضیوں پر اسی طرح پردہ ڈال سکتی تھی کہ ہندوستان کو تعلیم کی روشنی سے محروم رکھا جائے، قدیم درس گاہیں جن کے مصارف کے لئے بڑے بڑے اوقاف مقرر تھے کمپنی کی حکومت نے ان تمام اوقاف کو ضبط کر لیا وظائف پہلے ہی بند ہو چکے تھے اس وقت تعلیم و تدریس کا تمام ذمہ داریہی اوقاف تھے۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر اپنی مشہور و معروف کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں تاریخی حقائق کی روشنی

[۱] الخطط ج ۲ ص ۱۳۴ (ریونٹ وارثی)

میں اس رازِ درونِ پردہ کو اس طرح فاش کرتا ہے۔

"آخر ۱۸۳۸ء میں مقدمات چلا کر ان معافیات اور اوقافِ تعلیم پر حکومت نے قبضہ کر لیا صرف ان اوقاف سے حکومت کی آمدنی میں ۳ لاکھ پونڈ کا اضافہ ہو گیا" ص۵۵ و ص۲۵۶

یہ واضح رہے کہ یہ بیان صوبہ بنگال کے متعلق ہے اور اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب صرف ایک ایسے پسماندہ اور دور افتادہ صوبے میں جس کو اس وقت کے لحاظ سے کوئی خاص تعلیمی امتیاز حاصل نہیں تھا تعلیم کے لئے چالیس لاکھ روپے سالانہ آمدنی کے اوقاف موجود تھے تو ملک کے دوسرے صوبوں میں علی الخصوص ان مقامات میں جن کو تعلیمی مرکزیت حاصل تھی کس قدر اوقاف ہوں گے۔ اس بے رحمانہ غارت گری کا ہندوستانیوں کی زندگی پر کیا اثر پڑا، اس کے متعلق بھی خود ہنٹر ہی کی شہادت سنئے

"مسلمانوں کا تعلیمی نظام جس کا دار و مدار انہی معافیات اور اوقاف پر تھا، تہ و بالا ہو گیا اور مسلمانوں کے تعلیمی ادارے اٹھارہ سال کی مسلسل غارت گری کے بعد یک قلم مٹ گئے بے شبہ ہم نے ان کے اوقاف کا ناجائز استعمال کیا، اس حقیقت کو چھپانے سے کیا فائدہ کہ اگر ہم اس جائداد کا جو خاص اسی مصرف کے لئے تھی ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے تو بنگال میں آج بھی ان کے پاس اعلیٰ اور شاندار تعلیمی ادارے ہوتے ص۲۵ و ص۲۵۸"

بہر حال ایک عرصہ تک یہی پالیسی چلتی رہی کہ تعلیم کے تمام چشموں کو خشک کر دیا جائے۔ یہ پالیسی کامیاب رہی اور بقول مسٹر الفنسٹن ہندوستانیوں کی ذہنیت کے چشمے خشک کر دئے گئے۔ مگر ایک مدت کے بعد جب یہ دقت پیش آئی کہ دفتر کے لئے کلرک ملنے مشکل ہو گئے یورپ سے اتنے ارزاں کلرک بلائے نہیں جا سکتے تھے۔ اور ہندوستان کے تمام لکھے پڑھے کچھ تو اس وجہ سے کہ علمی چشموں کو خشک کر دیا گیا تھا۔ اور کچھ اس لئے کہ سرکاری زبان فارسی کے بجائے انگریزی کر دی گئی تھی۔ ختم ہو گئے تھے تو یہ پالیسی طے کی گئی کہ ایسے کلرک پیدا کئے جائیں جو رنگ و نسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہوں مگر ذہن اور فکر کے اعتبار سے یورپین ہوں تاہم اس قسم کے کلرکوں کی ضرورت محدود تھی۔ اس لئے ان کے بنانے کی مشینیں یعنی اسکول اور کالج بھی محدود دائرے میں قائم کئے گئے اور تعلیم کا خرچ اتنا بڑھا دیا گیا کہ افلاس زدہ ہندوستانیوں کی ہمتیں پست ہو کر رہ گئیں اور ایک دو نسل کے بعد نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان جو تہذیب و تمدن کی ترقیوں میں تمام دنیا سے آگے تھا اور جس کا چپہ چپہ علم و فضل کی روشنی سے چمک رہا تھا۔ دنیا کا پسماندہ ملک بن کر رہ گیا اور جہاں سترھویں صدی کے آخر تک سو فیصدی باشندے نوشت و خواند سے واقف ہوتے تھے۔ وہاں بیسویں صدی میں

لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد صرف آٹھ فی صدی رہ گئی۔

یہ تھا نتیجہ انگریزی کی ڈیڑھ سو سال کی غلامی کا۔

ترا ناداں امید غمگساری ہا ز افرنگ است ۔ دلِ شاہیں نہ سوزد بہر آں مرغے کہ در چنگ است

حضرات! یہ ہماری کتاب ماضی کا ایک چھوٹا سا ورق ہے جس سے اگر دور غلامی کے بدنما دھبوں کو مٹا دیا جائے۔ تو صاف نظر آئے گا کہ ہمارے علمی ذوق اور ہماری علمی خدمات کی حیثیت آسمان تاریخ کے چمکتے ہوئے ستاروں سے کم نہیں تھی یہ چمکتے ہوئے تارے دیکھنے والوں کو آج بھی دعوت نظارہ دے رہے ہیں۔ اب ہم آزاد ہیں ہمارا ملک آزاد ہے اور اس آزاد ملک نے جو مختلف مذہبوں، مختلف زبانوں اور رنگ و نسل کے بہت سے فرقوں کا گہوارہ ہے۔ اپنے لئے جمہوری نظام حکومت پسند کیا ہے ایک ایسے ملک کا دستور جس میں مذہب و عقائد اور رسوم و رواج کے بے شمار اختلافات موجود ہوں لامحالہ سیکولر ہی ہونا چاہیے۔ یعنی یہ کہ وہ مذہبی معاملات میں غیر جانبدار رہے گا اور ملک کے تمام رہنے والوں کی آزادیِ رائے اور آزادیِ فکر کسی اونچ نیچ کے بغیر تسلیم کرے گا۔ چنانچہ آج سیکولرزم کی زمین پر جمہوریہ ہند کی تعمیر ہو رہی ہے۔ اور اسی کو ملک کی مضبوطی اور ترقی کا شاہراہ کہا جا رہا ہے۔

اس دور میں ہمارے فرائض

آزاد ہندوستان جہالت کی تاریکی کو اپنے لئے عار خیال کرتا ہے۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ جہالت کی وبا ملک سے جلد از جلد دور ہو۔ اور ہندوستان ان متمدن ملکوں کی صف میں شانہ سے شانہ ملا کر کھڑا ہو جائے جن کا ہر ایک باشندہ پڑھا لکھا ہے، ہم اس خواہش کو خوش دلی کے ساتھ لبیک کہنے کے لئے تیار ہیں۔ اور پورے وثوق کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں کہ بنیادی تعلیم اور نوشت و خواند کی جد و جہد کو عام کرنے میں مسلمان نہ صرف یہ کہ ملک کے کسی فرقے سے پیچھے نہیں رہیں گے بلکہ مکمل جذبۂ خدمت اور ولولہ و شوق کے ساتھ اس مہم کو کامیاب بنانے میں پیش پیش ہوں گے۔

تاہم یہ ظاہر ہے کہ ایسا ملک جس میں تعلیم پانے والے بچوں اور نوجوانوں کی تعداد بارہ تیرہ کروڑ ہو۔ تعلیم کا ایسا نظام قائم کر دینا کہ ہر ایک بچہ ابتدائی نوشت و خواند کے لائق ہو جائے کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے بے شمار اسکولوں، لاکھوں استادوں اور ٹیچروں اور کروڑوں بلکہ اربوں روپیہ کی

ضرورت ہوگی۔ اور اگرچہ اس نظام کو چلانے کی مالی ذمہ داری قانونی طور پر براہِ راست حکومت کے سر ہوگی لیکن جیسا کہ معلوم ہے انجام کار اس کا بار جمہوریہ کی جیبوں پر پڑے گا، وہ جمہور جن کا پچھتر فی صدی حصہ آج بھی غربت اور فاقہ کشی کی آندھیوں میں گھرا ہوا دم توڑ رہا ہے۔

بنیادی جبری تعلیم کے ساتھ دوسرا مسئلہ جو مسلمانوں کے نقطۂ خیال سے وقت کا اہم تر اور نازک تر مسئلہ ہے بنیادی دینی تعلیم کا مسئلہ ہے جس کی ذمہ داری سیکولر اسٹیٹ اپنے اوپر لینے کے لئے تیار نہیں ہے اس مرحلے پر ہم اس خطرہ کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے کہ مثلاً ۶ سال سے گیارہ سال تک جب بچہ مذہبی تعلیم سے ناآشنا رہے گا اور ایسے ماحول میں پرورش پائے گا جو سیکولرزم کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہوگا تو جوان ہو کر اس کے مذہبی عقائد کیا ہوں گے اور آنے والی نسلوں میں اسلام کی حقیقی تعلیم کس طرح باقی رہ سکے گی۔

پس بنیادی جبری تعلیم کی اس منزل میں مختلف نزاکتوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ جو مسئلہ سب سے پہلے سامنے آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمان بچوں اور بچیوں کی مذہبی تعلیم کا کیا بندوبست ہوگا اور آنے والی نسلوں میں دین حنیف کی بقا اور ایمان و اسلام کی حفاظت کے لئے کیا چارۂ کار اختیار کیا جائے گا۔ اس وقت یہی معاملہ ہے جو پوری اہمیت کے ساتھ جمعیۃ علماء ہند کے سامنے ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد سے جمعیۃ علماء اپنی مجلسوں میں بار بار اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کر چکی ہے اور اس کے متعلق جو تجویزیں اس نے منظور کیں ان کی تفصیلات پر اربابِ حکومت سے متعدد بار گفتگو بھی ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کی یہ مقتدر ترین جماعت اس وقت اس مسئلہ کو سب سے بڑا مذہبی اور اجتماعی مسئلہ سمجھتی ہے اور اسی اہمیت کے ساتھ اس کو حل کرنے اور کسی قابلِ اطمینان نتیجے تک پہنچنے کی فکر میں ہے۔

آج یہ مسئلہ اپنی گوناگوں پیچیدگیوں کے ساتھ کانفرنس کے ارکان کے سامنے بھی پیش ہے اور اگر اس کانفرنس نے اس کو کامیابی کے ساتھ حل کر لیا تو بے شبہ یہ وقت کا شاندار کارنامہ ہوگا جو تاریخ

کے سینے پر سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا۔

حضرات! میں پھر عرض کروں گا کہ آج ہمارے سامنے ایک طرف پورے ملک کو تعلیم یافتہ بنانے کی خاطر بیسک تعلیم کا مسئلہ ہے جو آئندہ چند سالوں میں بلا استثناء رائج کردی جائے گی۔ جس کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ عام تعلیم کا دنیا کے تمام ترقی یافتہ ملکوں میں ایک اہم اور نمایاں مقام ہے، بنا بریں ملک کے کسی خاص فرقہ کی جانب سے اس قانون سے علیحدگی کا مطالبہ اور اس کے لئے کسی طرح کا احتجاج مضحکہ خیز ہوگا اور اس کو کوئی وقعت نہیں دی جائے گی۔

دوسری طرف ہم اس بھیانک مستقبل سے بھی صرفِ نظر نہیں کر سکتے جو مذہبی تعلیم کا باضابطہ بندوبست نہ ہونے کی صورت میں زیادہ سے زیادہ خطرناک بن کر ہمارے سامنے آسکتا ہے۔

پس وقت کی سب سے بڑی پکار یہ ہے کہ ہم پوری توجہ اور زبردست جدوجہد سے مستقبل کے خطرات کو دور کرنے کی سعی کریں۔ اور کوئی ایسی بنیاد رکھ دیں جس پر ایک صحیح العقیدہ امت مسلمہ کی حفاظت کا مضبوط قلعہ تعمیر کیا جاسکے۔

یقین ہے اصحابِ فکر جو اس کانفرنس میں رونق افروز ہیں، مجالس مضامین میں ان تمام الجھنوں اور نزاکتوں پر غور فرمائیں گے۔ اور کوئی خاطر خواہ حل ملت کے سامنے پیش کرسکیں گے۔

اس اجتماع سے فائدہ | میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر چند باتیں اربابِ نظر کی خدمت میں پیش کردوں، ممکن ہے وہ ان کے غور و فکر کے لئے نشانِ منزل اور چراغِ راہ کا کام دے سکیں۔

(۱) آج جب کہ یہ بات نکھر کر سامنے آچکی ہے کہ مذہبی تعلیم کی تمام تر ذمہ داری خود مسلمانوں پر ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس ذمہ داری کو اپنی جگہ پوری طرح محسوس کریں اور پوری مستعدی کے ساتھ اس کو اپنے کاندھوں پر اٹھا لیں۔ اگر ہم اپنے شاندار ماضی کے کارناموں سے سبق لے سکتے ہیں تو پھر ہمارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

اسلاف کرام کی لاثانی خدمات تو ایک طرف رہیں برطانوی سامراج کے دور میں بھی جو علمی خدمتیں مسلمانوں نے انجام دیں ——— ہمارے لئے وہ بھی کچھ کم حوصلہ افزا نہیں ہیں۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ اور شمس الہدیٰ پٹنہ جیسے مدرسوں کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ سرکاری امداد واعانت کے سہارے چلتے رہے۔ لیکن دارالعلوم دیوبند اور ہندوستان کے اُن سینکڑوں عربی مدرسوں کے متعلق کیا کہا جائے گا جنہوں نے اپنی پوری زندگی میں ایک لمحہ کے لئے بھی حکومتِ وقت سے مالی اعانت حاصل نہیں کی۔ ان کا تمام تر سرمایہ اعتماد علی اللہ رہا۔ اور وہ صرف عام مسلمانوں کی ہمت کے بل بوتے پر خدمتِ علم و مذہب میں منہمک رہے اور لیل ونہار کی تیز و تند گردشوں کے باوجود آج بھی اسی طرح زندہ ہیں۔

یہ تمام مدارس جو درحقیقت دینی علوم کی یونیورسٹیاں اور کالج ہیں۔ اس کے مستحق ہیں کہ ان کو محفوظ اور باقی رکھنے کے لئے پہلے سے زیادہ جدوجہد، ایثار اور مالی قربانیوں سے کام لیا جائے۔

البتہ ان تمام مدرسوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ کم از کم ابتدائی درجات کے نصاب میں ایسی تبدیلی ضرور کرلیں جو اس وقت کے تقاضوں کو کسی حد تک پورا کر سکے۔ اور مذہبی تعلیم کی خصوصیتوں کو باقی رکھتے ہوئے جبری بنیادی تعلیم کی ہم آہنگ ہو سکے۔

(۲) جمعیۃ علماء ہند اور بعض صوبوں کی جمعیتیں اپنی تجویزوں میں بار بار توجہ دلاتی رہی ہیں کہ بچوں کی دیگر بنیادی ضرورتوں کی طرح ان کی مذہبی تعلیم کا انتظام بھی ایک اہم ذمہ داری ہے۔ آیت قرآنی يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا۔ اس باب میں ہماری صاف وصریح رہنمائی کرتی ہے۔

جمعیۃ علماء نے اس فرض کی طرف توجہ دلا کر اپیل کی ہے کہ ہر ایک مسلمان بالخصوص جمعیۃ علماء کا ہر ایک معاون اور رکن اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لئے کم از کم ایک گھنٹہ اپنے بچوں اور قرب و جوار کے بچوں کی مذہبی تعلیم پر صرف کرے اور اس خدمت کو ایک قومی اور ملی پروگرام کی حیثیت سے انجام دے، اس طرح وہ نہ صرف وقت کی ایک اہم اور بنیادی ضرورت کو پورا کرے گا بلکہ معلم الخیر کے لقب کا مستحق ہوگا جس کے متعلق رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ حق بنیاد ہے کہ زمین و آسمان کی ہر ایک چیز اس کے لئے دعاء خیر کرتی ہے۔

(۳) مسلمان بادشاہوں کے دورِ حکومت میں تعلیم کی جس عمومیت کا ذکر کیا گیا ہے کہ نہ صرف شہروں اور قصبوں میں بلکہ دیہات میں بھی ہر شخص نوشت و خواند سے واقف ہوتا تھا، اس میں خاص طور پر سبق آموز بات یہ ہے کہ تعلیم کا یہ نظام خود عام پبلک کی طرف سے تھا اور باشندگان ملک کا علمی ذوق حکومت کی امداد سے بے پروا رہا کرتا تھا، پڑھانے والے عام طور پر مسلمان ہوتے تھے وہ صرف خدا کے نام پر خدا کے لئے یہ خدمت انجام دیتے تھے اور عام مسلمان ان کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے، وہاں نہ کسی انسپکٹر تعلیمات کی ضرورت ہوتی تھی نہ کسی ہیڈ یا سپر وائزر کی۔ خدمت علم کا یہ جذبہ خود ان پر حکومت کیا کرتا تھا اور ان کو بچوں کا مہربان استاد اور مشفق و مربی بنا دیا کرتا تھا، ہندو مسلمان کا امتیاز ان اساتذہ کے یہاں نہیں ہوتا تھا انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد یعنی ۱۸۶۰ء اور ۱۸۶۱ء تک جب کہ برطانوی شہنشاہیت کا اقبال نقطۂ عروج پر تھا، اس وقت بھی مسٹر آرنلڈ کو رشک تھا کہ "معلمی کی حیثیت سے میدان مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ معلمی کے پیشہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہے، ہندو لڑکے مسلمان استادوں پر اعتماد کرتے ہیں اور ان کے اسکولوں (مکتبوں) میں فارسی پڑھنے کے لئے آتے ہیں۔"

بہرحال تعلیم کا عام طریقہ یہی تھا کہ پرائیویٹ طور پر معلمین اشاعتِ علم اور اصلاح و تربیت کے جذبہ سے سرشار ہو کر بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے اور بچوں کے سرپرست اپنی استطاعت کے مطابق ان کی خدمت کیا کرتے تھے، بادشاہ اور امراء عام تعلیم کے ذمہ دار نہیں ہوتے تھے، ان کی طرف سے اس سلسلہ میں صرف یہی امداد ہوتی تھی کہ جن پر کسی وجہ سے نظرِ کرم ہو جاتی، ان کو جاگیر بخش دی جاتی تھی، لیکن انھیں میں کچھ ایسے بلند ہمت اور قناعت شعار بھی ہوتے تھے جو شاہی عطیات قبول نہیں کرتے تھے۔ یہ وہ عالی حوصلہ پیشوایانِ دین ہوتے تھے جو دولت استغنا اور سرمایہ توکل کو دنیا کی ہر ایک دولت سے زیادہ قیمتی سمجھتے تھے۔ تاریخ ہم سے آج پھر اسی جذبۂ صادق کو بروئے کار لانے کا مطالبہ کر رہی ہے، ہمارا کام یہ ہونا چاہئے کہ اپنے اکابر کی طرح ہر ایک محلہ اور ہر قریہ میں پرانے طرز کے مکتبوں کا جال بچھا دیں۔ عزیز طلبہ جو اس وقت عربی مدارس میں تعلیم پا رہے ہیں وہ بھی اپنی ہمت اور حوصلے بلند کریں اور اشاعت علم اور اصلاح و تربیت کو نصب العین بنا کر دیہات کی دور دراز بستیوں میں اقامۂ دین کے لئے ڈیرے ڈال دیں۔

(۴) اب ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب جبری تعلیم کے لئے بچوں کا سرکاری اسکولوں میں داخل ہونا ضروری ہو گا تو اگر دیہات وقصبات میں دینی تعلیم کا بندوبست کیا بھی جائے اور عام مسلمان اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے آمادہ بھی ہو جائیں تو اس کے لئے وقت کہاں سے آئے گا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے گجرات کے مسلمان نہ صرف یہ کہ اس سوال کا حل تلاش کر چکے ہیں بلکہ ایک زمانہ سے وہ اس پر عمل بھی کر رہے ہیں، یعنی گجرات کے بہت سے دیہات میں صباحی مکاتب قایم ہیں، جہاں بچے صبح کے وقت قرآن شریف اور دینیات کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ پرائمری اسکولوں میں پہنچتے ہیں اور ان کا کورس پورا کرتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ہر بچہ نہ اتنا مستعد ہو سکتا ہے کہ پرائمری اسکول میں چھ گھنٹے دینے کے بعد صباحی یا شبینہ مکاتب میں تعلیم حاصل کر سکے اور نہ ہر سرپرست کو یہ دلچسپی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ان مکاتب میں داخلہ پر مجبور کرے۔

اس دشواری کو حل کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں جن پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اول یہ کہ ہم خود اپنے اسکول اور مکتب قایم کریں اور ان کا نصاب ایسا تجویز کریں جس میں دینی تعلیم کے ساتھ بیسک تعلیم کے ضروری مضامین کو بھی لازمی قرار دیا جائے اور ان مکاتب کو سرکاری محکمۂ تعلیم سے منظور کرانے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح دینی تعلیم کا سلسلہ بھی قایم رہ سکے گا۔ اور عام تعلیم کے سلسلہ میں حکومت کا جو طریق کار ہے اس پر بھی کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

دوم یہ کہ محکمۂ تعلیم اسکولوں کے نظام الاوقات میں یہ گنجائش رکھ دے کہ کم از کم ایک گھنٹہ یومیہ یا ہفتہ میں دو تین پیریڈ مذہبی تعلیم کے لئے رکھ دئے جائیں۔ ان خالی گھنٹوں میں مذہبی تعلیم کا انتظام مسلمان اپنی طرف سے کریں یعنی اپنی جانب سے ایسے اساتذہ مقرر کریں جو اسکولوں میں جا کر دینیات کی تعلیم دیں۔ اگر محکمۂ تعلیم کے ذمہ داروں کی طرف سے اشتراکِ عمل کیا جائے گا تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی استاد چند اسکولوں میں کام کر سکے۔ لیکن یہ دونوں صورتیں اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہیں جب کہ حکومت بھی ان کو تسلیم کرے اور مذہبی تعلیم کے لئے اس کے قلب میں جذبۂ خیر سگالی موجود ہو جب کہ جمہوریۂ ہند کے دستورِ اساسی میں ہر فرقہ کو مذہب کی آزادی دی گئی ہے اور ہر فرقہ کے مذہب

اور کلچر کی حفاظت کا یقین دلایا گیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر حکومت کے سامنے یہ سوال باضابطہ رکھا جائے گا تو اس کا جواب اثبات میں ملے گا۔ اور اس طرح مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم کے انتظام کے لئے ایک راستہ نکل آئے گا اگرچہ یہ راستہ بھی کچھ کم دشوار گذار نہیں ہوگا اور اس کو ہموار کرنے کے لئے بھی کمر ہمت چست کرنی ہوگی۔

جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے اس سلسلہ میں جو جدوجہد اب تک کی جاچکی ہے وہ بفضلہٖ تعالیٰ امید افزا ہے۔

میری خواہش ہے کہ اس کانفرنس میں بھی ان پہلوؤں پر احتیاط سے غور کیا جائے اور اس کی جانب کوئی عملی قدم اٹھایا جائے۔

(۵) سلسلۂ کلام ختم کرنے سے پہلے ایک اور ضروری بات کی جانب توجہ دلانا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ جب ہندیونین کی سرکاری زبان ہندی قرار دی جاچکی ہے تو ہمیں محسوس کرنا چاہیئے کہ جس طرح ہم نے انگریزی زبان اور رسم الخط میں مہارت حاصل کی، ہندی زبان سیکھنے اور اس میں مہارت پیدا کرنے میں بھی آگے بڑھیں اس سلسلہ میں سرکاری حلقوں کی طرف سے دوسری علاقائی زبانوں، بالخصوص اردو کے ساتھ جو درحقیقت ہمارے ملک کے مشترک کلچر کی سب سے بڑی نشانی ہے جس ذہنی پستی اور تنگ دلی کا اظہار کیا جارہا ہے۔ اس سے صرف یہی نہیں کہ ہندی کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہورہی ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ عام تعلیم کے راستہ میں بھی یہ تنگ نظری سنگِ گراں بن کر رکاوٹ ڈال رہی ہے۔

اس کے باوجود سرکاری اور قومی زبان کی اہمیت کی طرف سے ہمیں آنکھ بند نہیں کرنی چاہئے اس کو اپنی اور اپنے ملک کی زبان سمجھ کر نہ صرف اپنانا چاہئے بلکہ اس میں امتیاز اور مہارت پیدا کرکے ان فرقہ پرستوں کی تنگ دلی اور تاریک دماغی کو چیلنج کرنے کی ضرورت ہے جو اپنے ہی وطن اور اپنی ہی سرزمین کی دوسری محبوب و مقبول زبان سے صرف اسلئے عداوت رکھتے ہیں کہ اس کو اپنے خیال میں مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہیں۔ اگرچہ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ حقائق کی ٹھوس چٹانوں کی مضبوطی کے سامنے ان کے اس بے محل جوش اور ضد کو سرپٹخ پٹخ کر پیچھے ہی ہٹنا پڑے گا، اور کوئی اندھا تعصب اردو کو اس کے قدرتی حقوق سے محروم نہیں کرسکے گا۔

بہرحال میری غرض یہ ہے کہ جب کہ حکومت کی زبان کی حیثیت سے ہندی کی تعلیم لازمی ہوگی اور ہندیونین میں ہندی زبان اور ہندی رسم خط "بین صوبجاتی" حیثیت اختیار کرے گا تو ہماری قومی بصیرت اور دوراندیشی کا تقاضا یہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے عام مذہبی لٹریچر کو ہندی میں منتقل کرنے کی کوشش شروع کردیں،

اس سلسلہ کا پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ دینیات کا جو نصاب جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے اردو میں شائع کیا جارہا ہے، اس کو ہندی رسم الخط میں شائع کیا جائے اور پھر رفتہ رفتہ اصلاحی اور تبلیغی نقطۂ نظر سے مختلف رسالے اور ٹریکٹ مرتب کئے جائیں اور ہندی کے ساتھ ان کو انگریزی میں بھی شائع کیا جائے۔ یہی ہے وقت کی آواز۔

مرکزی جمعیۃ علماء ہند اس طرح کی تمام تجویزوں کو عمل میں لانے کے لئے بے چین ہے اور اس مرحلے پر اس کی نظریں بار بار اربابِ خیر کی جانب اٹھ رہی ہیں۔

اسی کے ساتھ صوبائی جمعیتوں کا کام یہ ہے کہ وہ اس لٹریچر کا اپنی صوبائی زبانوں میں ترجمہ کرائیں اور اس کو زیادہ سے زیادہ شائع کرنے کی سعی کریں۔

جمعیۃ علماء صوبہ گجرات نے جمعیۃ علماء ہند کا دستور اساسی گجراتی میں شائع کرکے اور جمعیۃ علماء ہند کی کارگزاری کی رپورٹ گجراتی میں طبع کراکر ایک لائقِ تقلید خدمت انجام دی ہے، اللہ تعالیٰ اس کے کارکنوں کی مخلصانہ مساعی کو بارآور فرمائے۔

حضراتِ گرامی! کہنے کے لئے ابھی بہت کچھ ہے، بہت سی باتیں کہی جاسکتی ہیں، خوش نما تجویزوں اور پروگراموں کے انبار لگائے جاسکتے ہیں، لیکن جہاں تک آپ کی تعلیمی کانفرنس کا تعلق ہے اس کے لئے یہی کچھ کم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو کہنے سے زیادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ مجھے یقین ہے کہ ہر طرح کی ناسازگاریوں اور دشواریوں کے باوجود مسلمان اگر آج بھی اپنی جماعت (جمعیۃ علماء) کے مقام کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس کے طریقِ عمل کو کامیاب بنانے کا عزمِ صمیم کرلیں تو وہ اپنے مستقبل پر مکمل اعتماد کرسکتے ہیں اور ان کی عظمت کی بساط جسے گردشِ لیل ونہار نے اس ملک میں الٹنے کی کوشش کی ہے، پھر اسی شان کے ساتھ قائم ہوسکتی ہے

قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا ھو مولانا وعلی اللہ فلیتوکل المومنون۔ فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولئک الذین ھداھم اللہ واولئک ھم اولوا الالباب فقط والسلام

اسلام کا نظامِ عفت و عصمت

از

(جناب مولوی محمد ظفیر الدین صاحب استاذ دارالعلوم معینیہ سانچر)

(۳)

علوم مادیہ کا ایک اور ماہر ژول سیمان اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے۔

"عورت کو چاہیئے عورت رہے، ہاں بے شک عورت کو چاہیئے عورت رہے، اسی میں اس کے لئے فلاح ہے، اور یہی وہ صفت ہے جو اس کو سعادت کی منزل تک پہنچا سکتی ہے۔ قدرت کا یہ قانون ہے اور قدرت کی یہ ہدایت ہے، اس لئے جس قدر عورت اس سے قریب ہوگی، اس کی حقیقی قدر و منزلت بڑھے گی، اور جس قدر دور ہوگی، اس کے مصائب ترقی کریں گے۔ بعض فلاسفہ انسانی زندگی کو..... پاکیزگی سے خالی سمجھتے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ انسان کی زندگی دلفریب، پاک اور بے حد پاکیزہ ہے اگر ہر مرد اور ہر عورت اپنے ان مدارج سے واقف ہو جائے جو قدرت نے اس کے لئے قرار دیئے ہیں اور اپنے ان فرائض کو ادا کرے جو قدرت نے اس کے متعلق کر دیئے ہیں"[1]

عورت اپنے جنسی فرائض سے آگے

اسی حد تک نہیں بلکہ تجربات نے ثابت کر دیا ہے اور علمائے یورپ کو اس بات کے ماننے پر مجبور کر دیا کہ جو عورت اپنے جنسی فرائض انجام نہیں دیتی، وہ عورت نہیں ہے چنانچہ یہی ژول سیمان ایک موقع پر لکھتا ہے۔

"جو عورت اپنے گھر سے باہر کی دنیا کے مشاغل میں شریک ہوتی ہے اس میں شک نہیں کہ وہ ایک عامل بسیط کے فرائض انجام دیتی ہے مگر افسوس ہے کہ عورت نہیں رہتی"[2]

---

[1] مسلمان عورت صفحہ ۵۸ صفحہ ۵۹ [2] ایضاً

سماج کا فریضہ | آج بہت سے مسلمانوں کو اسلامی پردے کی شکایت ہے، وہ مغربی تہذیب سے متاثر ہوکر اپنے دین کی ان ہدایات پر چراغ پا ہوتا ہے، مگر غور کیجئے، کہ خود علمائے یورپ اس سلسلہ میں کیا رائے رکھتے ہیں، اگسٹ کونٹ "النظام السیاسی" میں لکھتا ہے۔

"شوہر یا کسی قریبی رشتہ دار کی عدم موجودگی میں سوسائٹی کا فرض ہے کہ عورت کی ضروریات کا اپنی دولت سے انتظام کرے، تاکہ معاش کی ضرورت سے مجبور ہوکر اسے گھر سے باہر کی زندگی میں اپنے آپ کو مبتلا کرنا پڑے، کیونکہ حتی الامکان عورت کی زندگی کو منزلی دائرے میں محدود رہنا چاہیے، اور ہماری کوشش ہونی چاہیئے کہ عورت خارجی زندگی کے مصائب اور تکلیفوں سے محفوظ رہے، اور قدرت نے اسے جس دائرہ میں محدود کردیا ہے، اس سے باہر نکلنے پر مجبور نہ ہو۔"[1]

آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ اسلام نے عورتوں کے لئے جو قانون اول دن مرتب کیا تھا آج دنیا پھر پھراکر اسی پر آرہی ہے، اسلام نے بے کس و مجبور عورت کا بار مسلمانوں کے بیت المال پر ڈالا تھا، کچھ پہلے لوگ سمجھ رہے تھے کہ یہ ملک پر بار ہے جو نہ ہونا چاہیے، مگر اسے کیا کہئے کہ خود علمائے یورپ، اس حد تک آگئے ہیں، کہ مجبور عورتوں کا بار سوسائٹی پر ڈالتے ہیں۔

عورتوں کی آزادی خود اس کے حق میں | کون نہیں جانتا کہ عورتوں کی آزادی ملک کو تباہ کر ڈالتی ہے، قوم کی ریڑھ کی ہڈی توڑ ڈالتی ہے، اور خود عورتوں کو جنت سے جہنم میں پہنچا دیتی ہے، عورت اس بیسویں صدی میں خوش ہے کہ اسے حقوق مل رہے ہیں وہ ہر محکمہ میں ملازمت حاصل کر رہی ہے مگر اسے پتہ نہیں کہ مردوں نے اسے بیل گائے کی طرح استعمال کرنا شروع کردیا ہے، اسے ذرہ برابر چین نہیں، اپنے قدرتی فرائض سے دن بدن دور ہوتی چلی جارہی ہے، مردوں کی تفریح کے لئے عورتوں کو سینما کے پردوں پر آنا پڑا، مردوں کی دلبستگی کا سامان مہیا کرنے کے لئے تھیٹر کی ناپاک زندگی قبول کرنی پڑی، مردوں کی ہوس پوری کرنے کے لئے ان کو کلب اور ناچ گھروں میں ناچنا پڑا اور حد یہ ہے کہ محض مردوں کی شہوت پرستی کے سلسلہ میں عورتوں کو عریاں کلب بنانا پڑا، مگر اب تک

---

[1] مسلمان عورت ص ۷۹

عورت یہی سمجھ رہی ہے کہ مردوں کی غلامی سے ہمیں نجات مل گئی ؎

بریں عقل و دانش بباید گریست

عورتوں کی آزادی مردوں کے حق میں مرد نہیں سوچتا کہ عورت کی آزادی سے اس کو کیا نقصان ہو رہا ہے، کتنی شریف زادیاں سینما اور تھیٹر وغیرہ کی نمائش بن گئیں، کتنے شریفوں کی بہو بیٹیاں گھر سے نکل گئیں اور کتنی پاکدامن عورتوں کی عصمت رسوا ہو رہی ہے، کالج یونیورسٹی اور کلبوں میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے، ہر پڑھا لکھا جانتا ہے،

اسلام نے عورتوں کی قدم قدم پر اسی وجہ سے عصمت میں رہنمائی کی ہے کہ نظام تمدن برقرار رہے اور مرد و عورت دونوں اپنے فرائض منصبی بحسن و خوبی انجام دے سکیں جہاں شریعت کی بتائی ہوئی راہ کے خلاف عورت و مرد کا اجتماع ہوتا ہے وہاں یقینی طور پر جلد یا بدیر فتنے اٹھتے ہیں اور دونوں ہی اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہ اور کاہل ثابت ہوتے ہیں۔

عورت کہاں سے کہاں پہنچتی ہے ہمیں جناب ماہر القادری صاحب کی اس رائے سے پورا اتفاق ہے کہ

"ذوق بے حجابی اور شوق تبرج صرف چہرے کی بے نقابی پر ہی قناعت نہیں کرتا، پہلے نقاب اٹھتی ہے، پھر جھکی ہوئی نگاہیں آہستہ آہستہ بلند ہوتی ہیں پھر لباس میں تخفیف ہونا شروع ہوتی ہے، پھر آرائش اور بناؤ سنوار میں یہ جذبہ کار فرما ہوتا ہے، کہ لوگ دیکھیں اور شوق و قدر دانی کی نگاہ سے دیکھیں، ہوسناکیوں بے اعتدالیوں اور برائیوں کا یہ سلسلہ شاخ در شاخ ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ جو عورت پہلی بار چہرہ کو بے نقاب کرتے ہوئے فرط شرم و غیرت سے پسینہ پسینہ ہوگئی تھی، وہ آگے چل کر کلب گھروں میں غیر مردوں سے بغلگیر ہو کر ناچتی اور تھرکتی ہے"[1]

پردہ میں ضعف اعصاب کا شکوہ غلط جو لوگ پردہ کے نقصانات میں اعصاب کی کمزوری، شہوت کا ابھار اور تعلیم وغیرہ سے محرومی بتاتے ہیں وہ سراسر غلط ہے خود کشی کے اعداد و شمار نے ثابت کر دیا ہے کہ اعصاب کس کے کمزور ہوتے ہیں، شہوت پرستی کا مسئلہ بھی مغرب و مشرق کی بدکاری و زناکاری

---

[1] فاران دسمبر ۱۹۵۱ء صک

کے واقعات نے عیاں کر دیا ہے، تعلیم کے سلسلہ میں عرض ہے کہ اسلام میں اہل علم عورتوں کی تاریخ پڑھیں، جو لوگ کہتے ہیں کہ پردہ میں رہ کر جو شادی ہوتی ہے اس میں طلاق کی نوبت بکثرت آتی ہے اس سلسلہ میں گذارش ہے کہ یورپ و ایشیا یا پردہ دار اور غیر پردہ والے ملک کے طلاق کے اعداد و شمار جمع کر لئے جائیں۔[1]

ہمیں تو صرف یہ بتانا ہے کہ عفت و عصمت کی حفاظت پردہ ہی میں ہے، جس کی اسلام نے ہدایت کی ہے۔ جس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ یورپ کے بیشتر ممالک میں پردہ سے متعلق عام چرچا شروع ہو گیا، جرمنی میں "عورتیں گھروں کی طرف واپس ہوں" کی تحریک شروع ہوئی، امریکہ میں ہر سال ایک لاکھ خود کشی کے واقعات ہوتے ہیں جن میں کامیابی سترہ ہزار کو ہوتی ہے اور ان میں نمبر عورتوں ہی کا بڑھا ہوا ہوتا ہے۔[2] جو عشق و محبت کی ناکامی کا نتیجہ ہے۔

عورت کی حالت مرد سے بیان نہ کی جائے

اسلام نے ان راستوں پر بھی پہرہ بٹھا دیا ہے جو غیر محسوس طور پر عفت و عصمت کے لئے خطرناک ہیں، مثلاً رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت جب عورت سے ملے اور اسے دیکھے تو وہ جا کر دوسری عورت کا حال کھول کر اپنے شوہر سے بیان نہ کرے کہ ممکن ہے اس کے شوہر کے دل میں دوسری عورت کی خوبی اور اس کا حسن و جمال گھر کر جائے اور وہ اس کے پیچھے پڑ جائے، ارشاد نبوی ہے۔

لا تباشر المرأة المرأة فتنعتها لزوجها كأنه ينظر اليها (مشکوٰۃ باب النظر الی المخطوبۃ بخاری و مسلم)	عورت عورت کے ساتھ اس طرح نہ رہے سہے کہ وہ اپنے شوہر سے اس کی حالت اس طرح کھل کر بیان کرے کہ گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے۔

مرد اپنی بیوی کا راز نہ بولے

اس طرح شہوت میں ابھار پیدا ہونے کا امکان بلا شبہ ہے اور پھر اس سے فتنہ کے برپا ہونے کا، اسی طرح رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد کو بھی منع کیا ہے کہ وہ اپنے زن و شو کی باہمی راز کی بات کسی غیر مرد سے بیان کرے، ارشاد نبوی ہے

---

[1] اس سلسلہ میں المرأۃ المسلمہ (فرید وجدی) کا مطالعہ کریں یا اس کا اردو ترجمہ "مسلمان عورت" [2] صدق جدید ۲۶ / اکتوبر ۵۱ء

ان من اشر الناس عند اللّٰہ منزلۃ الرجل یفضی الی امرأتہ وتفضی الیہ ثم ینشر سرھا	اللہ تعالیٰ کے پاس بدتر وہ شخص ہے کہ وہ اور اس کی بیوی یکجا ہوا اور پھر مرد اس بھید کو کھول دے۔

(حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۳۵ ج ۲)

عورت کو جس طرح دوسری عورت کی ہیئت جسمانی وغیرہ کے بیان سے روکا گیا ہے اسی طرح یہاں مرد کو روکا گیا ہے کہ اپنی بیوی کے پرائیویٹ پہلو کو کسی کے سامنے بیان کرے یہاں بھی اور باتوں کے ساتھ ایک بات یہ ہے کہ دوسرے کے جذبات کو برانگیختہ نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ انسانی شہوت کا حال یہ ہے کہ جہاں کہیں اس طرح کی کوئی بات ہوتی ہے فطرتاً اس میں تلاطم کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور تھوڑی ہی دیر کے لئے سہی انسانی دماغ کہاں کہاں کی چکر لگانے لگتا ہے، اس لئے عقل وشعور کا تقاضا یہ ہے کہ اس طرح کی بیہودہ باتوں سے پرہیز کیا جائے، اور شہوت انگیز باتوں سے مکمل اجتناب برتا جائے۔

ہیجانی کیفیت پیدا کرنے والی باتوں سے اجتناب شریعت نے اسی وجہ سے ہر اس طریقہ سے منع کیا ہے، جو انسانی طاقت میں ہیجان پیدا کرسکتا ہے اور جس سے کسی فتنہ وفساد یا گناہ اور معصیت کا اندیشہ سامنے آسکتا ہے، سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے دواعی پر کڑی نگرانی فرمائی ہے کوئی بھی داعیہ جو عقل وشعور میں معصیت کا موجب ہوسکتا ہے، اس کو عمل میں لانے سے منع فرمادیا ہے چنانچہ آپ نے ایک مرتبہ فرمایا۔

لا ینظر الرجل الی عورۃ الرجل ولا المرأۃ الی عورۃ المرأۃ رواہ مسلم	ایک مرد دوسرے مرد کی ستر نہ دیکھے اور نہ عورت ہی دوسری عورت کا ستر دیکھے۔

(مشکوٰۃ باب النظر الی المخطوبہ)

انسانی فطرت ہے کہ ستر کے دیکھنے سے شہوت میں ہیجان پیدا ہوتا ہے، مرد مرد کا ستر دیکھے یا عورت عورت کا، یا یہ شکل ہو کہ مرد عورت کا ستر دیکھے اور عورت مرد کا ستر دیکھے، اور شہوت میں

جب ہیجان پیدا ہوتا ہے، تو خطرہ منڈلانے لگتا ہے انسانی طبیعت بے قرار ہو جاتی ہے اور پھر ایک غلط جذبہ اس کے دل میں گھر کر لیتا ہے، کبھی مرد کو مرد سے عشق ہو جاتا ہے اور طبیعت میں گندگی ہے تو موقع پا کر گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے کبھی اس کی شہوت کا زور اسے کسی اجنبی عورت کی طرف مائل کر دیتا ہے اور کم و بیش یہی حال عورت کا ہوتا ہے کہ کبھی وہ آپس میں عشق و محبت کی داستان چھیڑ دیتی ہے اور کبھی کسی غیر مرد سے وہ نظر لطف و کرم کی متمنی ہوتی ہے اور یہ دونوں ہی طریقے غلطی میں بلکہ معصیت میں مبتلا کر دیتے ہیں پھر یہ بھی بات ہے کہ ستر پوشی اسلام میں ضروری ہے اور دیکھنا اس کے خلاف ہوتا ہے یوں بھی رسم و رواج میں ستر پوشی ایک ضروری چیز سمجھی جاتی ہے اور اس کے خلاف کرنا ذلت کی بات۔

ایک کپڑے میں دو مرد یا دو عورت نہ لیٹے — اور انسانی طبیعت اور اس کی قوت شہوت ہی کے پیش نظر اسلام نے اس بات سے بھی روکا ہے کہ دو مرد ایک کپڑے میں سوئے یا لیٹے اسی طرح دو عورت ایک کپڑے میں لیٹے یا سوئے، اسی حدیث کا آخری حصہ ہے۔

ولا یفضی الرجل الی الرجل فی ثوب واحد ولا تفضی المرأة فی ثوب واحد رواہ مسلم	کوئی مرد دوسرے مرد کے ساتھ ایک کپڑے میں نہ آئے اور نہ کوئی عورت ہی دوسری عورت کے ساتھ ایک کپڑے میں سوئے یا لیٹے۔

(مشکوٰۃ باب ایضاً)

ایک ساتھ دو مرد یا دو عورت کا لیٹنا نفسیات نے بھی غلط ثابت کر دیا ہے کیونکہ اس کا نتیجہ خوشگوار نہیں ہوتا حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا یہ فرمانا بھی درست ہے کہ یہ چیز شہوت میں بہت زیادہ ہیجان کا باعث ہو جایا کرتی ہے جس سے کبھی کبھی سحاق کی رغبت ہوتی ہے اور کبھی لواطت کیعہ جو نہایت مبغوض فعل ہیں۔

ستر اور اس کی پردہ پوشی — مرد کا ستر ناف سے لے کر گھٹنا تک ہے جس کا چھپائے رکھنا مرد کے لئے ضروری ہے، سوائے بیوی اور کسی پر ظاہر نہیں کر سکتا، اور آزاد عورت کا ستر چہرہ اور ہتھیلی چھوڑ کر سارا جسم

عہ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث بعد میں آئے گی انشاء اللہ ۱۲

ہی ہے مگر عورت کا سترِ عورت کے لئے بھی ناف سے لے کر گھٹنا تک ہی ہے، اتنا حصہ عورت کا عورت بھی نہیں دیکھ سکتی سوائے بچہ کی پیدائش کے موقع کے، جس میں معذوری ہے، یا پھر شوہر کے لئے انسانی فطرت میں بڑی حد تک یہ بھی داخل ہے کہ اپنی شرمگاہ دیکھنے سے بھی شہوت بھڑکتی ہے اس لئے اسلام نے اس سے بھی روکا ہے کہ آدمی تنہائی میں بھی ننگا نہ ہو، پھر یہ مروت کے خلاف بھی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

ایاکم والتعری فان معکم من لا یفارقکم الا عند غائط وحین یفضی الرجل الی اھلہ فاستحیوھم واکرموھم (حجۃ اللہ صفحہ ۱۲۶ ج ۲)

ننگا ہونے سے بچو اس لئے کہ تمہارے ساتھ وہ بھی ہیں جو جدا نہیں ہوتے مگر پاخانہ کے وقت یا جماع کے وقت، لہذا ان سے شرم کرو اور ان کی عزت کرو

دوسری حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے فرمایا

احفظ عورتک الا من زوجتک اوماملکت یمینک فقال افرأیت اذا کان الرجل خالیا؟ قال فاللہ احق ان یستحیا منہ (حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۲۶)

اپنے ستر کی دیکھ بھال کرو ہاں اپنی بیوی یا لونڈی کے پاس ہو تو اور بات ہے اس نے پوچھا اگر کوئی تنہا ہو تو؟ فرمایا تو اس وقت اللہ سے شرمانا حق ہے

ادب کا تقاضا تو بلاشبہ یہی ہے کہ تنہائی میں کراماً کاتبین فرشتے اور خود رب العزت کی موجودگی کا تصور و خیال غالب ہو، اور حیا اور شرم کا پاس باقی رہے، مگر ساتھ ہی بالکل ننگے ہونے میں جذباتِ نفس میں بھی ہیجان کی کیفیت کبھی پیدا ہو جاتی ہے، بہرحال ادب اور حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ جب بالکل مجبوری نہ ہو، ننگے ہونے کی جرأت نہ کی جائے۔ اور اس طرح بے حیائی کو راہ نہ دی جائے۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ع۔ یوپی میں عام طور پر اس حدیث پر عمل نہیں ہوتا غسل خانوں میں عموماً لوگ ننگے ہو کر نہاتے ہیں، اور اس طرح ننگے ہوتے ہیں کہ بدن پر ایک دھاگہ بھی نہیں رہتا، یہ مروت کے بھی خلاف ہے، اہلِ علم کے لئے اس طرف توجہ کی ضرورت ہے۔

الا لا یبیتن رجل عند امرأة ثیب　　کسی بیاہی عورت کے پاس کوئی غیر مرد رات نہ گذارے

الا ان یکون ناکحا او ذا محرم (رواہ　　مگر یہ کہ وہ نکاح کرنے والا ہو یا محرم

مسلم (مشکوۃ صفحہ ۲۶۸)

یہ سب حفظ ماتقدم کے طریقے ہیں، اور کوئی شبہ نہیں سب ہی خطرات کے مقام ہیں، اس لئے اجتناب بہرحال ضروری ہے، اور عفت پر حرف آنا اور معصیت میں مبتلا ہونا بڑی حد تک ممکن ہے۔

عورت تنہا سفر نہ کرے | اسلام نے عفت وعصمت کو کہیں بھی بے سہارا نہیں چھوڑا ہر جگہ گنجائش بر اس کے تحفظ کی سعی کی، زندگی میں اگر کبھی عورت کو سفر کی ضرورت درپیش آتی ہے تو اسلام سفر میں بھی اس کی عصمت کا سامان کرتا ہے، چنانچہ قانون الٰہی ہے کہ عورت سفر میں اس وقت تک نہیں جا سکتی جب تک کوئی محرم اس کے ساتھ نہ ہو، حج جو عبادات میں داخل ہے اور اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ایک رکن ہے، اس کی ادائیگی بھی بغیر محرم کے وہ نہیں کر سکتی، ظاہری احتیاط کو بھی اسلام نے اس باب میں فراموش نہیں کیا ہے، ارشاد نبوی ہے۔

لا یحل لامرأۃ تؤمن باللہ والیوم　　مومنہ عورت کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ بغیر محرم کو

الآخر تسافر مسیرۃ یوم ولیلۃ　　ساتھ لئے ایک دن اور ایک رات کی مسافت میں

الا مع ذی محرم علیھا متفق علیہ　　تنہا سفر کرے

(ریاض الصالحین باب تحریم السفر المرأۃ وحدہا)

محرم وہ شخص ہے، جس سے کبھی بھی اس کی شادی جائز نہ ہو جیسے اپنا بھائی باپ وغیرہ یا شوہر ساتھ ہو، بغیر محرم کے تنہا عورت کا سفر کرنا حرام ہے، محرم کے علاوہ کوئی غیر محرم ساتھ ہو اس کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں ہے، عقل میں بھی بات آتی ہے، کہ گھر چھوڑ کر عورت جب باہر جاتی ہے تو اسے خطرات سے ہو کر گذرنا پڑتا ہے، راستہ میں نیک و بد ہر طرح کے آدمیوں سے ہو کر راستہ طے کیا جاتا ہے، خلقتاً عورتیں کمزور ہوتی ہیں، جذبات کی نازک ہوتی ہیں، ان کے عقل وشعور میں نسبتاً وہ

تنگی نہیں ہوتی جو ہونی چاہئے، اس لئے ایسے موقع پر کسی خاص آدمی (جیسے شوہر باپ بیٹا بھائی وغیرہ) ہی کا ساتھ ہونا ضروری ہے، جو اس کی ہر موقع پر مناسب امداد کر سکے، اور کبھی رفیق سفر کی امداد و اعانت سے متاثر ہو تو کوئی غلط جذبہ ابھارنے والا نہ ہو،

ایک دفعہ آپ نے ارشاد فرمایا

لایخلون رجل بامرأۃ الا ومعھا ذومحرم ولا تسافر المرأۃ الا ذی محرم فقال رجل یارسول اللہ ان امرأتی خرجت حاجۃ وانی اکتتبت فی غزوۃ کذا وکذا قال انطلق فحج مع امرأتک متفق علیہ

کوئی مرد کسی ایسی عورت سے نہ ملے جس کا محرم اس کے ساتھ نہ ہو، اور کوئی عورت بغیر محرم کے سفر نہ کرے ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ میری بیوی حج کو جا رہی ہے اور میں نے غزوہ کی شرکت کا ارادہ کر لیا ہے آپ نے فرمایا تو اپنی بیوی کے ساتھ حج کے لئے جا۔

(ریاض الصالحین باب ایضاً)

اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے اس سے عورتوں کے متعلق قانون الٰہی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، کہ ان کی عفت وعصمت اور دوسری ضروریات کا کتنا لحاظ اور پاس ہے، جہاد کے مقابلہ میں اس بات کو ترجیح دی گئی کہ مرد اپنی بیوی کے ساتھ سفر حج میں جائے، عورت بغیر محرم کے سفر نہ کرے، جہاد کی شرکت سے بھی ضروری اس وقت عورت کے ساتھ جانا ہے،

سفر میں جاتے ہوئے گھر کی حفاظت

مرد سفر میں جاتا ہے تو وہاں بھی عورتوں کو فراموش نہیں کر سکتا اپنی اور بیوی و بال بچوں کی عفت وعصمت اور دوسری ضرورتوں کا لحاظ پاس کرنا ضروری ہے سفر کے لئے گھر سے نکلتا ہے تو اس کے لئے مسنون طریقہ یہ ہے کہ ایسی دعائیں پڑھے جس میں اپنے اور اپنے بال بچوں کا تحفظ اور آرام کی درخواست ہو خود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کے لئے نکلتے تو دعا پڑھتے جس کا ایک حصہ یہ ہے۔

اللّٰھم انت الصاحب فی السفر

اے اللہ! تو سفر میں مالک ہے اور اہل وعیال میں

والخلیفة فی الاھل، اللھم انی اعوذ بك من وعثاء السفر وکابة المنظر وسوء المنقلب فی المال والاھل	خلیفہ، اے اللہ میں تری پناہ میں آتا ہوں، کہ سفر کی مشقت اور برا منظر پیش آئے اور اس سے کر مال اور اہل و عیال میں برائی دیکھوں۔

(ریاض الصالحین باب مایقولہٗ اذارکب الخ)

اور امت کو بھی ہدایت ہے کہ نکلتے ہوئے یہ پڑھے، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ تمام اور باتوں کے ساتھ رب العزت تو مرے بال بچوں اور بیوی کی محافظت کرنا، الہ العالمین! اس بات سے پناہ مانگتے ہیں کہ سفر سے واپسی پر مال اور بال بچوں میں کوئی ناگوار بات دیکھنے میں آئے، گویا اس طرح وہ اپنے بال بچوں کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی محافظت میں دیتا ہے یوں تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ محافظ ہی ہے، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جہاں سفر کی ضرورت پوری ہو جائے فوراً اپنے بال بچوں میں واپس آؤ، ارشاد نبوی ہے

السفر قطعة من العذاب یمنع احدکم طعامه وشرابه ونومه فاذا قضی نھمته من سفرہ فلیعجل الی اھله متفق علیه	سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے تم کو کھانے پینے اور سونے سے روک دیتا ہے لہذا جوں ہی سفر کی ضرورت ختم ہو جلدی سے بال بچوں میں پلٹ آؤ۔

(ریاض الصالحین باب تعجیل السفر)

مجاہدین کے گھروں کی عفت کا خیال مجاہدین اسلام کی بیویاں جو شوہروں کے جہاد میں چلے جانے کے بعد تنہا رہجاتی ہیں ان کا درجہ اور ان کی حرمت کو عام مسلمانوں کی عورتوں سے بہت بڑھا کر رکھا گیا ہے، ان کو ماں کا درجہ دیا گیا ہے، اور ان کی عفت و عصمت کا لحاظ ہر مسلمان پر ضروری قرار دیا گیا ہے۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

حرمة نساء المجاھدین علی القاعدین	مجاہدین کی بیویوں کی عزت گھر پر رہنے والوں کے

كحرمة امهاتهم ما من رجل من	نے ان کی ماں کی برابر ہے کوئی گھر میں رہنے والا مجاہدین
القاعدين يخلف رجلا من	میں سے کسی کے اہل میں خیانت کا ارتکاب کرے گا
المجاهدين في اهله فيخونه فيهم	تو قیامت کے دن اس مجاہد کو لایا جائے گا اور وہ
الا وقف له يوم القيامة فيأخذ	اس خائن کی جتنی نیکی لے کر خوش ہو گا لے گا
من حسناته ما شاء حتى يرضى	

(ریاض الصالحین باب تحریم الخلو بالاجنبیۃ ص۶۲)

قوانین استیذان | اسلام نے جہاں تمام جزئی وکلی امور کے لئے قوانین وضع کئے اور ضابطے مقرر کئے، وہاں یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ گھروں کے داخلہ کے لئے کوئی باضابطہ دستور نہ بناتا، چنانچہ اس نے عفت وعصمت کے تحفظ اور دوسری حکمتوں کے پیش نظر یہ ضابطہ قرار دیا کہ کوئی کسی غیر کے گھر میں اس کے مالک کی اجازت کے بغیر داخل نہ ہو، اور پھر حصول اجازت کا طریقہ بتایا، کہ اسے عمل میں لاکر اجازت طلب کرے،

سوائے ان گھروں کے جو رہن سہن کے لئے نہیں ہے یا ہے مگر وہ عام ہے، آنے کی کسی کو کوئی رکاوٹ نہیں جیسے خانقاہ کا وہ حصہ جو عوام وخواص ہر ایک کے لئے ہے، مدرسہ جہاں کسی کو ممانعت نہیں، سرائے جو ہر ایک شخص کے لئے برابر ہے، دروازہ اور دالان جو عام لوگوں کے لئے بنایا ہی گیا ہے یا وہ گھر جس میں کوئی رہتا نہیں ہے بلکہ اس میں سامان وغیرہ ہے۔ اس طرح کے گھر وغیرہ میں تو بلاشبہ بغیر حصول اجازت بھی آسکتا ہے کہ یہ اپنے وضع ہی کے اعتبار سے عام ہیں چنانچہ ارشاد باری ہے

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَدْخُلُوا	اس میں تم پر گناہ نہیں کہ تم ان گھروں میں داخل ہو،
بُيُوتًا غَيْرَ مَسْكُونَةٍ فِيهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ	جس میں سامان ہے کوئی بستا رہتا نہیں، اور جو کچھ تم
وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ	ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو اللہ کو معلوم ہے۔

ہاں جن لوگوں کو ایسے عام گھروں سے روک دیا گیا ہے وہ البتہ نہیں جا سکتے ہیں۔

گھروں میں بغیر اجازت داخلہ ممنوع

بقیہ اور دوسرے گھروں کا حکم یہ ہے کہ بغیر اجازت داخل نہ ہو، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا	اے ایمان والو اپنے گھروں کے سوا کسی گھر میں
بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا	داخل نہ ہو جب تک اجازت نہ لے لو اور اس گھر
وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ذَٰلِكُمْ	والے کو سلام نہ کر لو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے تاکہ
خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (نور-۴)	تم یاد رکھو۔

غیر کے گھر میں داخل ہونا چاہے، تو پہلے شرعی طریقہ پر اجازت حاصل کر لی جائے، یہ گھر خواہ اس کی ملکیت میں ہو یا وہ کرایہ پر رہتا ہو اور یا وہ عاریۃً اس میں گذر بسر کرتا ہے، پھر اس گھر میں محارم ہوں یا غیر محارم، مرد رہتے ہوں یا عورت، تمام شکلوں میں جو مختار خانہ ہے اس سے اجازت لینی چاہئے بغیر اس کے کوئی چارہ کار نہیں، خود گھر والا اجازت دے یا اس نے جس کو اجازت دینے کا اختیار دیا ہے وہ اجازت دے۔

طلب اجازت کا شرعی طریقہ

حصول اجازت کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ وہاں پہنچ کر سلام کرے اور پوچھے کیا میں اندر آؤں؟ جانے کی اجازت مل جائے اندر جائے۔ اجازت نہ ملے یعنی گھر کے مختار نے کہا کہ ابھی نہیں آسکتے، تو ایسی صورت میں فوراً پلٹ آئے اصرار نہ کرے اور نہ زبردستی کرے، اور اگر آواز دی جواب نہیں ملا تو تین مرتبہ اذن کے لئے شرعی طریقہ اختیار کرے، تیسری مرتبہ بھی کوئی جواب نہیں ملے تو پلٹ آئے اور ایسا گھر جس کے متعلق صراحت کے ساتھ معلوم نہیں ہے کہ اس میں کوئی ہے یا نہیں، تو اس طرح کی مشکوک حالت میں بھی بغیر اجازت اندر داخلہ کا حکم نہیں ہے، ارشاد رب العالمین ہے۔

فَإِن لَّمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا	پھر اگر اس میں کسی کو نہ پاؤ، تو اس میں داخل نہ ہو، جب
حَتَّىٰ يُؤْذَنَ لَكُمْ ۖ وَإِن قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا	تک تم کو اجازت نہ مل جائے، اور اگر جواب دیا جائے
فَارْجِعُوا ۖ هُوَ أَزْكَىٰ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ (نور-۴)	کہ لوٹ جاؤ، تو پھر جاؤ، اس میں تمہارے لئے پاکیزگی ہے

فرض کر لیا جائے، کہ گھر میں کوئی نہ ہو، تو سوال ہے کہ دوسرے کے یہاں تم جانے کا کیا حق رکھتے ہو جب کہ وہ گھر ایسا ہے جہاں اذن عام نہیں، اور گھر والے نے جب کھل کر کہہ دیا کہ واپس جائیے تو پھر کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، اس کے بعد زبردستی جانا کسی کو ایذا دینا ہے، اور ایذا دینا سخت جرم ہے، دوسرے اپنی رسوائی بھی ہے کہ

آراضی مفتوحہ

از

(جناب مولوی محمد تقی الدین صاحب شیخوی رباڈ نبکی)

مفتوحہ زمین سے متعلق جو قوانین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے رائج تھے وہ نہایت ظالمانہ تھے۔ جنگوں کا مقصد یہی دوسروں کو غلام بنانا اور ان کے مال و دولت اور ذرائع پیداوار کو لوٹ کر غصب کرنا ہوتا تھا[۱]۔

قرآن سب سے پہلی کتاب ہے جس نے قوانین جنگ مرتب کئے[۲]۔ اور دنیا پر یہ واضح کر دیا کہ جہاد بھی رحمت الٰہی کا ایک پہلو ہے جس کا نتیجہ لازمی طور سے عام انسانیت کے لئے امن و سلامتی کا پیغام ہوتا ہے[۳]۔

رحمۃ للعالمین نے کن اصول کے ماتحت رحمت کو عام کرنے کی کوشش کی، خلفاء راشدین کس قدر لوگوں کے لئے رحمت ثابت ہوئے اس پر قانون جنگ کی دفعات اور اس زمانہ کے تاریخی واقعات روشنی ڈالتے ہیں۔

فتح ہونے کے بعد جو سلوک مفتوحین کے ساتھ کیا گیا۔ جو نظام قائم ہوا اور پھر وہ جس طرح رحمت الٰہی عام ہوئی تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی اس سے واقف ہے۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ عام طور پر لوگوں نے یقین کر لیا تھا کہ اسلام خوف و دہشت کی طاقت نہیں ہے جس سے بھاگا جائے یا اس کا مقابلہ کیا جائے بلکہ سر تا پا نیکی و عدالت اور مجسم رحمت کا پیام ہے۔

---

[۱] جمہوریہ افلاطون مقالہ پنجم
[۲] "The laws of war between Belligerents" by Percy Bordwell Callaghan & Co. Chicago
[۳] وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ ۲/۱۹۳

اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد قوموں نے بلاوے بھیجے۔ شہروں نے پھاٹک کھول دئے۔ قلعوں نے اپنی کنجیاں آگے رکھ دیں اور وقت کی ساری مظلوم آبادیوں نے نجات دہندہ سمجھ کر اس کو خوش آمدید کہا۔

اسلام سے پہلے دستور تھا کہ جنگ میں جو کچھ حاصل ہو لڑنے والوں کا حق ہے قرآن کریم نے اس دستور کو ختم کر کے مفتوحہ تمام اشیاء کو اللہ کی ملک قرار دیا۔[۱]

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ؕ — لوگ آپ سے غنیمت کے متعلق پوچھتے ہیں آپ کہہ دیجیے مال غنیمت اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔

اَلْاَنْفَالُ الْغَنَائِمُ[۲] — انفال سے مراد غنائم ہیں

امام بخاریؒ نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ آیت غنیمت میں رسول کا ذکر تنظیم و تقسیم کے لئے ہے کہ آپ بحیثیت خلیفہ عام مفاد کے پیش نظر قانون شریعت کے مطابق مال غنیمت لوگوں میں تقسیم کریں۔ تملیک کے لئے نہیں ہے[۳]

ذیل کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے آپ نے فرمایا

واللہ انی لا اعطی احداً ولا امنعہ انما انا قاسم اضع حیث امرت[۴] — خدا کی قسم نہ اپنی خواہش سے کسی کو دیتا ہوں اور نہ روکتا ہوں میں صرف قاسم ہوں وہیں تقسیم کرتا ہوں جہاں کا حکم دیا گیا ہوں۔

بہر حال اسلامی نظریہ کے مطابق مفتوحہ زمین اللہ کی ملک قرار دی جاتی تھی، کسی خاص جماعت یا افراد کی نہیں۔ اور خلیفہ عام مفاد کے لئے مندرجہ ذیل لوگوں میں اس کو تقسیم کرتا تھا۔

(۱) غازیوں میں۔

(۲) اصل باشندوں میں۔

---

[۱] الاحکام السلطانیہ صفحہ ۱۳۶ [۲] بخاری ج ۲ ص ۶۸۵ والاموال صفحہ ۳۰۵ [۳] بخاری ج ۲ [۴] زاد المعاد ج ۲

چونکہ حفاظت ملک و قوم کی خدمت فوجیوں کے سپرد ہوتی ہے اس لئے ان خدمات کے عوض مفتوحہ زمینوں کا کچھ حصہ ان کے حوالے کردیا جاتا تھا کہ اس کے ذریعہ وہ اپنی معاش کے خود کفیل ہوں۔ بقیہ زمین بالعموم اصل باشندوں ہی کے پاس رہنے دی جاتی تھی۔ اس زمین پر ان لوگوں کو پورے اختیارات حاصل ہوتے تھے اور خلافت ان سب سے سرکاری ٹیکس وصول کرتی تھی۔

یہ صورت اس وقت ہوتی کہ لڑائی کے بعد فتوحات ہوئی ہوں اگر جنگ کئے بغیر فتح ہو جاتی تو کل آراضی مفتوحہ خلافت کے انتظام میں رہتی اور اصل باشندے حسب سابق کاشت کرتے رہتے اس صورت میں بھی انھیں ہر قسم کے تصرف بیع۔ ہبہ وغیرہ کا اختیار ہوتا خلافت طریقہ کاشت وغیرہ پر نگرانی رکھتی اور سرکاری ٹیکس کے علاوہ کچھ وصول نہیں کرتی تھی۔

اس طرح تمام مفتوحہ زمینوں کی دو قسمیں ہوتیں۔

غنیمت۔ جو لڑائی کے بعد فتح ہوئی ہو۔

فے۔ جو بغیر جنگ کے فتح ہوگئی ہو

غنیمت کا انتظام دو طرح ہوتا تھا

(۱) فوجیوں میں تقسیم کردی جاتی

(۲) اصل باشندوں کے پاس رہنے دی جاتی

"فے" میں جنگ کی نوبت نہیں آتی تھی اس لئے تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا چنانچہ زمین اصل باشندوں ہی کے پاس رہنے دی جاتی تھی۔

چونکہ مجموعی حیثیت سے تمام مفتوحہ زمینیں اللہ کی ملک قرار دی جاتیں اور عام مفاد کے لئے خلافت کے انتظام اور نگرانی میں ہوتی تھیں اس لئے اگر اصل باشندے یہ زمینیں چھوڑ کر چلے جاتے یا مفاد عامہ میں خلل واقع ہونے کی وجہ سے کسی حصۂ زمین سے انھیں بے دخل کردینا پڑتا تو "خلافت" مفاد عامہ کے پیش نظر بہتر تنظیم و تقسیم کی مجاز تھی صرف کاشت کے لئے زمین دینے میں مفاد خلق زیادہ ہوتا تو اس کو اس کا بھی اختیار حاصل تھا۔ کسی کو "قطیعہ" دینے میں مفادِ خلق معلوم ہوتا تو اس کے لئے

بھی کوئی روک نہ تھی بہرحال سرکاری ٹیکس دستور کے مطابق ہی وصول کیا جاتا تھا خلافت کو اس بات کا بھی حق تھا کہ کسی کو زمین دئے بغیر اپنے اخراجات سے کاشت کرائے اور پیداوار خود ہی لوگوں میں تقسیم کردے۔[1]

مفتوحہ زمین سے متعلق قرآن حکیم میں دو طرح کے احکام ملتے ہیں جن کی بنیاد مندرجہ ذیل آیات پر ہے پہلی آیت غنیمت کہلاتی ہے اور دوسری کو آیات "فے" کہتے ہیں۔

وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ	اور جان لو کہ جو کچھ تمہیں "غنیمت" میں ملے اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے اور رسول۔ اقربا۔ یتیموں۔ مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔
مَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ ۚ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ	جو "فے" اللہ نے بستی والوں سے اپنے رسول کو عطا فرمایا وہ اللہ و رسول کے لئے اور اقرباء۔ یتیم۔ مسکین مسافر کے لئے ہے تاکہ تم میں سے دولتمندوں کے درمیان ہی سمٹ کر نہ رہ جائے اور جو کچھ رسول تمہیں دیں اس کو لے لو اور جس سے منع کریں (نہ دیں) اس کو چھوڑ دو بے شک اللہ کا عذاب سخت ہے۔
لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنصُرُونَ اللَّهَ	ان مفلس مہاجروں کے لئے بھی ہے جو اپنے گھروں اور مالوں سے نکالے ہوئے اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی ڈھونڈنے کے لئے اور اللہ و رسول (دین) کی مدد کرنے کے لئے تمہارے پاس آئے ہیں

[1] الخراج یحیٰی صفحہ ۴۲

وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ
وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ
مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ
وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ
حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ
عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ
وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَالَّذِينَ جَاءُوا
مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ
لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا
بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا
غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ
رَءُوفٌ رَحِيمٌ ۵۹-۱۰

وہی لوگ سچے ہیں۔

اور ان لوگوں کے لئے بھی ہے جو اس گھر (مدینہ) میں ایمان کی حالت میں مہاجرین کے پہلے سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ ان مہاجرین سے محبت کرتے ہیں ان کے آنے سے اور ان کی خاطر تواضع کرنے سے اپنے دلوں میں تنگی محسوس نہیں کرتے۔ اپنی جانوں پر ان کو مقدم رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان پر فاقہ ہی کی نوبت آجائے اور جو لوگ اپنے نفس کی لالچ سے بچا لئے گئے وہی مراد پانے والے ہیں۔

اور ان لوگوں کے لئے بھی ہے جو ان کے بعد یہ کہتے ہوئے آئے کہ اے ہمارے رب ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے دلوں میں مومنوں کی طرف سے "بیر" نہ رکھ اے ہمارے رب آپ ہی نرمی کرنے والے اور مہربان ہیں۔

ابوبکر جصاصؒ نے "غنیمت" اور "فے" کی ان آیتوں میں ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس کی تائید و تصدیق کے لئے "محمد بن مسلمہ جو متاخرین اہل مدینہ میں سے ہیں" ان کا قول بھی نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"اللہ اور اس کے بعد رسول کا ذکر اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ رسولؐ بحیثیت خلیفہ قرب و رضا کی تمام راہوں (مفاد عامہ) میں حالات اور مواقع کے لحاظ سے اموال کی تنظیم و تقسیم کرے آیت "فے" کا یہ ٹکڑا "وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا" اسی مقصد کی ترجمانی کرتا ہے اور حضرت جابرؓ کی ایک روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے "پیغمبر اسلام (مفاد عامہ کے پیش نظر)

اسی اس کو مستحقین میں تقسیم کرتے تھے، آیتِ غنیمت کے مذکورہ پانچ حصوں کی تخصیص نہ تھی" اس صورت میں یہ حصے محض قرب الٰہی و رضا کی اجمالی تشریح و توضیح کے لئے ہوں گے تحدید و تخصیص کے لئے نہ ہوں گے۔[1]

قرآن کریم کے انھیں احکام کے پیشِ نظر فاروق اعظمؓ نے ابتداءً عراق و شام کی زمین فوجیوں میں تقسیم نہیں کی اور بعد میں بھی تمام مفتوحہ زمینیں تقسیم نہیں ہوئیں بلکہ اصل باشندوں کے پاس ہی رہنے دی گئیں۔

بقول ابو عبیدؒ

"پیغمبر اسلام نے آیتِ غنیمت پر عمل کر کے "خیبر" کو تقسیم کر دیا اور حضرت عمرؓ نے آیت "فے" پر عمل کر کے عراق و شام وغیرہ نہیں تقسیم کیا۔[2]"

قاضی ابو یوسفؒ کہتے ہیں۔

"حضرت عمرؓ کے زمینوں کے تقسیم نہ کرنے کا فیصلہ محض توفیق الٰہی کا نتیجہ اور کتابِ الٰہی سے ہدایت کاملہ کی بناء پر تھا اور اسی میں بھلائی تھی۔[3]"

قاضی صاحب کے ہم عصر یحییٰ بن آدمؒ قرشی کہتے ہیں۔

مفتوحہ زمین کا معاملہ خلیفہ کی صوابدید پر موقوف ہوتا ہے مناسب ہو تو فوجیوں میں تقسیم کر دے ورنہ اصل باشندوں کے پاس رہنے دے، پیغمبر اسلام نے بعض زمینیں تقسیم کر دی تھیں اور بعض نہیں تقسیم کیں۔[4]

ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ

فقد تواترت الآثار فی افتتاح الارضین عنوة بھذین الحکمین[5]	غلبہ سے فتح کی ہوئی زمین کے ان دونوں حکموں میں آثار حد تواتر تک پہنچ چکے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ مفتوحہ زمین اگر جنگ کے بعد فتح ہوتی تو تقسیم اور عدم تقسیم میں خلیفہ کو اختیار ہوتا

---

[1] احکام القرآن للجصاص ج ۳ ص ۵۵-۶۷ [2] الاموال لابی عبید ص ۶۱ [3] الخراج لابی یوسف ص ۲۷ [4] الخراج یحییٰ ص ۱۸ [5] الاموال ص ۶۰

عہ اس تحقیق کی بناء پر وَلِلرَّسُوْلِ اور وَلِذِی الْقُرْبٰی وغیرہ کے واو زائدہ محض کلام میں حسن و خوبی پیدا کرنے کے لئے ہوں گے کلامِ عرب میں بکثرت اور قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں صرف تزئین و تحسینِ کلام کے لئے واو لائے گئے ہیں جن کے کوئی معنی نہیں ہیں (احکام القرآن)

تھا اور اگر بلا جنگ فتح ہو جاتی تو اصل باشندوں ہی کے پاس رہنے دی جاتی۔

اب چند تاریخی واقعات کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں تاکہ یہ حقیقت واضح ہو سکے کہ رسول اللہ اور خلفاء راشدین نے زمین کی تنظیم و تقسیم میں مفادِ عامہ اور نفعِ خلق کا کہاں تک لحاظ رکھا اور مفتوحین کے ساتھ کیسا بہتر سلوک کیا۔

ارضِ خیبر خیبر فتح ہونے کے بعد پوری زمین اللہ کی ملک قرار دی گئی اور خلافت نے اسکو حسب ذیل طریقے پر تنظیم و تقسیم کیا۔

(۱) کچھ حصہ فوجیوں میں تقسیم کر دیا۔

(۲) بقیہ حصہ اصل باشندوں کے پاس رہنے دیا۔

دوسری صورت میں یہ بات طے پائی کہ پیداوار میں دونوں شریک ہوں گے نصف پیداوار خلافت کی ہوگی اور نصف کاشتکار کی۔ خلافت کے عام قانون سے بھی مطلع کر دیا گیا کہ زمین اللہ کی ملک ہے اور کسی فرد کی جانب سے مفادِ عامہ کے خلاف کوئی حرکت ہوئی تو بے دخل کر دینے کا خلافت کو پورا اختیار ہوگا۔

جو حصہ فوجیوں میں تقسیم کیا گیا تھا وہ بھی سرکاری ٹیکس اور قانون سے مستثنیٰ نہ تھا۔

خیبر کا واقعہ یہ ہے کہ۔

اہلِ خیبر کو جب اپنی کمزوری کا یقین ہو گیا تو وہ قلعوں میں محصور ہو گئے۔ اسلامی فوج یکے بعد دیگرے تمام قلعوں پر قبضہ کرتی گئی صرف دو قلعہ "وطیح" اور "سلالم" باقی رہ گئے۔ جب ان لوگوں کو بھی اپنی شکست کا یقین ہو گیا تو رحمۃ للعلمینؐ کی خدمت میں امن کی درخواست پیش کی۔ آپ نے فوراً منظور فرما کر اس کا اعلان کر دیا۔

پورے خیبر پر قبضہ ہو جانے کے بعد خیبر کے کچھ لوگوں نے درخواست کی کہ ہماری زمینیں ہمارے پاس رہنے دی جائیں نصف پیداوار ہماری ہوگی اور نصف خلافت کی۔ ان لوگوں کی یہ درخواست منظور کی گئی بلکہ یہی سلوک اوروں کے ساتھ بھی ان کی درخواست کے بغیر عام کیا گیا اور ان لوگوں کی زمینیں

بھی نصف پیداوار کی شرط کے ساتھ انھیں کے پاس رہنے دی گئیں۔ البتہ سب پر یہ واضح کر دیا گیا کہ زمین پر قبضہ اس وقت تک قابلِ تسلیم ہے جب تک مفادِ عامہ کی خلاف ورزی نہ ہو اور کسی جانب سے کوئی ایسی حرکت نہ ہو جو نقضِ امن کا باعث ہو سکے ورنہ خلافت کو بے دخل کرنے کا پورا اختیار ہوگا۔

چنانچہ جن لوگوں سے نقضِ امن کا اندیشہ تھا ان کو دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا اور ان کی زمینیں فوجیوں میں تقسیم کر دی گئیں، پیغمبرِ اسلام[ؐ] بحیثیت خلیفہ حسبِ معاہدہ خیبر کا انتظام کرتے رہے اور اس کی آمدنی حسبِ موقع تقسیم کرتے گئے۔ صدیق اکبرؓ نے بھی یہی انتظام بدستور قایم رکھا۔ عہدِ فاروقیؓ میں بھی کچھ دنوں یہی انتظام قایم رہا مگر جب اہلِ خیبر معاہدہ کے خلاف عمل کرنے لگے اور ان کی خلاف ورزیاں حد سے تجاوز کر گئیں جس کی بناء پر نقضِ امن کا اندیشہ ہو گیا تو عمرؓ نے انھیں ملک شام کی طرف منتقل کر دیا۔ اس طرح بقیہ زمین بھی دوسروں میں تقسیم کر دی گئی۔

خلاصہ یہ کہ پورا خیبر غلبہ سے فتح ہوا اور نفع خلق کے پیشِ نظر تنظیم و تقسیم کی جو بہتر صورت ہو سکتی تھی وہ اختیار کی گئی۔ بعض روایتوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خیبر کا کچھ حصہ صلحاً فتح ہوا تھا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ خیبر کا اکثر حصہ غازیوں میں تقسیم نہ ہوا تھا بلکہ اسے اصل باشندوں کے پاس رہنے دیا گیا تھا جسے دیکھ کر غالباً بعضوں نے سمجھا کہ یہ علاقہ صلحاً ملا تھا۔ مگر یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ پورا خیبر غلبہ سے فتح ہوا تھا۔

چنانچہ ابو عبیدؒ کا تمام روایتوں کے پیشِ نظر یہی فیصلہ ہے۔ زیلعیؒ نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

اس کے علاوہ بعض روایتیں جو خیبر کی آمدنی کے تقسیم کے بارے میں بظاہر مختلف نظر آتی ہیں ان کی بنیاد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر سے حاصل شدہ آمدنی کے کئی حصہ کیا کرتے تھے اور ایک حصہ میں کئی کئی مصرف شامل ہوتے تھے۔ کسی راوی نے ہر ایک کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا اور کسی نے بعض کا تذکرہ کیا اور بعض کو چھوڑ دیا۔ چونکہ پیغمبر اسلامؐ کے حصہ میں کئی مصرف شامل

ع معاہدہ کی خلاف ورزی یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ مسلمانوں کی جانیں بھی محفوظ نہ رہ گئی تھیں چنانچہ عبداللہ عمؓ ایک مرتبہ کسی ضرورت سے "خیبر" گئے تو بلا وجہ ان کو مار پیٹ کر زخمی کر دیا گیا۔

تھے۔ اس لئے کسی راوی نے صرف آپ کی طرف منسوب کر کے سب کو شامل کر لیا۔

الغرض نہ ایک راوی دوسرے کے خلاف بیان کرتا ہے اور نہ غلط کہتا ہے اس لئے مورخین اس اختلاف کو کوئی اہمیت نہیں دیتے[۱]۔

ارض وادی القریٰ وادی القریٰ شام اور مدینہ کے درمیان خیبر کے راستہ پر یہودیوں کی آبادی تھی۔ پہلے یہاں قوم ثمود آباد تھی ان کی ہلاکت کے بعد یہودی آباد ہو گئے تھے۔

فتح ہونے کے بعد آراضی ونخلستان وغیرہ انہیں کے پاس رہنے دیئے گئے اور ویسا ہی معاملہ کیا گیا جو خیبر والوں کے ساتھ کیا گیا تھا یعنی خلافت کے عام قانون سے انہیں مطلع کر دیا گیا کہ زمین اللہ کی ملک ہے اور کسی جانب سے مفادِ عامہ کے خلاف کوئی حرکت ہوگی تو خلافت کو بے دخل کر دینے کا پورا اختیار حاصل ہوگا اور یہ بات طے پائی کہ نصف حصہ پیداوار خلافت کی ہوگی اور نصف کاشتکار کی۔ اس زمین سے غازیوں کو حصہ نہیں دیا گیا۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ

رسول اللہ ۷ھ میں خیبر سے فارغ ہو کر وادی القریٰ تشریف لائے اور اسلام کی دعوت دی یہ لوگ جنگ پر آمادہ ہو گئے۔ آخر کار جنگ ہوئی اور مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہوئی[۲]۔

اس سلسلہ میں قاضی عیاض کا یہ قول ہے

وکذلک ثلث ارض وادی القریٰ اخذہ فی الصلح حین صالح اهلها الیهود[۳] — وادی القریٰ کی ثلث زمین جو مصالحت کے وقت طے ہوئی تھی وہ بھی پیغمبر اسلام کے لئے "خالصہ" تھی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں سے مصالحت ہو گئی تھی۔ ممکن ہے پہلے معاہدہ ہو چکا ہو

---

[۱] اس تمام واقعہ خیبر کی تحقیق وتفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نصب الرایہ ج ۳ کتاب السیر وابوداؤد باب حکم ارض خیبر وکتاب الاموال ص۹ و ص۵۶ وکتاب الخراج یحییٰ ص۲۷، ۳۶، ۳۸ و ۴۱ و ۴۲ و ۴۳

[۲] کتاب الاموال ص۲۰ وفتوح البلدان ج۱ [۳] زرقانی ج ۲ ص۹۳

اور یہ بات طے پائی ہو کہ زمین کی تہائی پیداوار خلافت کی ہوگی اور بقیہ کاشتکار کی پھر معاہدہ کی خلاف ورزی کی بناء پر جنگ کی نوبت آگئی ہو

ارض بنی نضیر بنو نضیر نامی یہودیوں کا ایک قبیلہ مدینہ میں رہتا تھا۔ یہ لوگ زمین جائداد چھوڑ کر چلے گئے تھے اور اس طرح ان کے اموال بلا جنگ وجدل خلافت کے انتظام میں آگئے تھے۔ پیغمبر اسلام ؐ نے زمینیں مسلمانوں میں تقسیم کر دیں اسی میں سے ابو بکرؓ۔ زبیرؓ۔ عبد الرحمن بن عوفؓ ابو دجانہؓ کو "قطائع" عطا فرمائے تھے[1]

جیسا کہ یحییٰ بن آدم قرشی کہتے ہیں

ثم قسم رسول اللہ ارض بنی النضیر — پھر رسول اللہ نے بنو نضیر اور بنو قریظہ کی زمین تقسیم کر دی

وارض بنی قریظہ ولم یقسم فدک[2] — اور فدک نہیں تقسیم کیا۔

دوسرے موقع پر کہتے ہیں کہ

رسول اللہ نے بنو نضیر کے اموال مہاجرین اور بعض انصار میں تقسیم کر دیئے تھے[3]

پھر کہتے ہیں

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ الخ۔ وہ میں جس مال کے بلا جنگ وجدل ملنے کا ذکر ہے وہ بنو نضیر کا مال ہے اور لکن اللّٰہ یسلط رسلہ الخ میں پیغمبر اسلام کے تسلط کا یہ مطلب ہے کہ وہ آپ کے لئے خالصہ (سرکاری) ہے (پیغمبر کے تسلط سے مراد آپ کی جماعت کا تسلط ہے مخفی نہیں کیونکہ پیغمبر کی غرض عام مفاد تھی نفسی نہ تھی)[4]

رہ گئیں فاروق اعظمؓ اور دیگر اجلۂ صحابہ کی تمام وہ روایتیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اموال بنی نضیر پیغمبرؐ کے لئے خالصہ (سرکاری) تھے ان سب کا یہ مطلب ہے کہ آپ خلیفہ کی حیثیت سے منتظم تھے

---

[1] فتوح البلدان ج ۱ [2] الخراج یحییٰ ص ۲۱ [3] حوالہ بالا ص ۳۲ [4] ایضاً

ع اس روایت میں ایک راوی محمد بن سائب کلبی ابو النضر ہے جس پر ناقدین نے جرح کی ہے اور ضعیف قرار دیا ہے لیکن اس مضمون کی روایت کی تائید دوسری مستند روایتوں سے ہوتی ہے اس لئے یہ مضمون صحیح مانا جاتا ہے ملاحظہ ہو الخراج یحییٰ ص۳۳ اور فتوح البلدان ج ۱ و بخاری و ابو داؤد ۱۲

موقع اور محل کے لحاظ سے تصرف کرتے تھے کسی کا خصوصیت کے ساتھ کوئی حق نہ تھا بلکہ تمام لوگ برابر کے شریک تھے۔

بنو نضیر کا واقعہ یہ ہے

ابتداء ان لوگوں سے معاہدہ ہو گیا تھا کہ دیت (خون بہا) کے معاملہ میں وہ مسلمانوں کی مدد کریں گے اس کے بعد بنو نضیر کے خلیف نے دو آدمی قتل کر دئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنو نضیر کے پاس گئے اور معاہدے کے مطابق دیت کے معاملہ میں ساتھ دینے کو فرمایا۔ ان لوگوں نے بد عہدی کی بلکہ بالاخانہ سے چکی کا پاٹ گرا کر آپ کا کام تمام کرنے کی سازش کی۔ اس سازش کا حال معلوم ہونے کے بعد آپ واپس آئے۔ اور اس غداری کے جرم میں حسب معاہدہ شہر چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ ان لوگوں نے حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اور آمادۂ پیکار ہو گئے۔ مسلمانوں نے ان پر فوج کشی کر کے محاصرہ کر لیا اور یہ محاصرہ پندرہ دن تک جاری رہا آخر کار وہ صلح پر راضی ہوئے اور رسول اللہ سے کہا کہ ہم اس شرط پر آپ کا شہر خالی کر دینے پر تیار ہیں کہ ہماری چیزوں میں سے "ہتیار" اور "زرہ" کے علاوہ ہر اس سامان کے لے جانے کی اجازت دیجئے جس کو اونٹ پر لے جا سکیں آپ نے یہ شرط منظور فرمائی[1]

قرآن کریم کی اس آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِأَوَّلِ الْحَشْرِ ۵۹

اللہ ہی ہے جس نے پہلی مڈبھیڑ ہوتے ہی اہل کتاب میں سے جو کافر تھے نکال باہر کیا۔

ارض بنی قریظہ

بنو قریظہ نامی یہودیوں کا قبیلہ مدینہ میں رہتا تھا۔ ان کی زمینیں خلافت کے انتظام میں آکر انھیں کے قبیلہ کے ایک شخص حضرت سعدؓ کے فیصلہ کے مطابق تقسیم کر دی گئی تھیں۔

معمرؒ کہتے ہیں۔ میں نے زہریؒ سے کہا کہ کیا بنو قریظہ کے پاس زمینیں بھی تھیں انھوں نے کہا ہاں تھیں" رسول اللہؐ نے مسلمانوں میں تقسیم کر دی تھیں[2]

---

[1] الاموال صـ۲۸۲ و فتوح البلدان ج۱ و ابن سعد ج۲ و ابن ہشام صـ۶۵۲ [2] فتوح البلدان ج۲۷

ان لوگوں سے دوستانہ مراسم قائم ہو چکے تھے مگر انھوں نے جنگ احزاب کے دن شرائطِ صلح کی مخالفت کر کے مسلمانوں کے دشمنوں کو مدد دی اور معاہدہ توڑ دیا۔ مسلمانوں نے "احزاب" سے فارغ ہو کر بنو قریظہ کا محاصرہ کر لیا یہ محاصرہ تقریباً پچیس[۲۵] دن تک جاری رہا۔ اس اثناء میں ان سے بارہا کہا گیا کہ رسول اللہ جو کچھ فیصلہ کریں اس کو منظور کرنے کی شرط کے ساتھ باہر نکل آؤ لیکن وہ لوگ اپنی ضد اور اصرار پر برابر اڑے رہے۔ آخر وہ اس بات پر راضی ہوئے کہ حضرت سعد جو کچھ کہہ دیں منظور ہے۔ سعدؓ نے منجملہ اور باتوں کے ان کی اراضی تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔[۱]

قرآن کی اس آیت میں غالباً بنو قریظہ ہی کی طرف اشارہ ہے۔

وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ　　　　اللہ نے ان کی زمین۔ مکان۔ اموال کا وارث بنا دیا

ارضِ مکہ مکہ فتح ہونے کے بعد حسبِ قانونِ خلافت تمام زمین اللہ کی ملک قرار دی گئی اور خلافت کے انتظام میں لینے کے بعد پہلے کی طرح اصل باشندوں کے پاس رہنے دی گئی۔[۲]

مکہ والوں کے ساتھ احسان و سلوک کا یہ مظاہرہ تاریخ عالم میں ایک ایسا مقام رکھتا ہے جس کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے ابتدائی دور میں پیغمبر اسلام اور ان کی جماعت کے ساتھ ایسی وحشت و بربریت کا برتاؤ کیا تھا کہ جس کے ذکر سے شرافت پناہ مانگتی ہے انسانیت لرزتی ہے اور عدل و انصاف ندامت کی وجہ سے گردن جھکا لیتا ہے، مگر رحمۃ للعالمین جس وقت رحمت کا پیام لے کر فاتح مکہ کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے تو اعلان عام کر دیتے ہیں کہ

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ[۳]　　　　آج تمہارے اوپر کوئی الزام نہیں تم سب کے سب آزاد ہو

خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ حصہ خیبر کے علاوہ تقریباً تمام مفتوحہ زمینیں اصل باشندوں کے پاس رہنے دیں اور اراضی کی تنظیم و تقسیم میں مفادِ عامہ کے پیشِ نظر جو عمدہ صورت ہو سکتی تھی وہ اختیار فرمائی آپ کے سامنے خلق اللہ کا عام مفاد تھا کسی خاص طبقہ یا جماعت کا نہیں تھا۔ آپ نے انسان کی معاشی آزادی کے خیال سے قدیم زمانہ کی ملکیت کے مفہوم کو بدل کر ایک نئی قسم کی ملکیت

---

[۱] بخاری ج ۲ و مسلم ج ۲ والاموال ص ۱۲۹　[۲] الاموال ص ۷۶　[۳] الخراج لابی یوسف ص ۵۵

کی طرح ڈالی جس کی حیثیت حقِ استعمال اور حقِ انتفاع سے زیادہ نہ تھی اور وہ بھی اسی حد اور اسی وقت تک قابلِ تسلیم تھی جب تک مفادِ عامہ میں خلل نہ واقع ہو اور کسی کی حق تلفی کا باعث نہ بن سکے شاہ ولی اللہؒ دہلوی اسلام میں ملکیت کے مفہوم کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

والارض کلھا فی الحقیقۃ بمنزلۃ مسجد اور رباط جعل وقفا علی ابناء السبیل وھم شرکاء فیہ فیقدم الاسبق فالاسبق وحق الملک فی الآدمی کونہ احق بالانتفاع من غیرہ[1]

حقیقت یہ ہے کہ پوری زمین بمنزلہ مسجد اور پناہ گاہ کے ہے جو مسافروں پر وقف ہوتی ہے اور سب مسافر اس میں شریک ہوتے ہیں پہلے آنے والے کو پیچھے آنے والے پر ترجیح ہوتی ہے آدمی کی حقِ ملکیت کا صرف یہ مطلب ہے کہ اس کو انتفاع کا حق بہ نسبت دوسرے کے زیادہ ہے۔

[1] حجۃ اللہ البالغہ

(باقی آئندہ)

تفسیر مظہری

تمام عربی مدرسوں کتب خانوں اور عربی جاننے والے اصحاب کے لئے بے مثل تحفہ

اربابِ علم کو معلوم ہے کہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی یہ عظیم المرتبہ تفسیر مختلف خصوصیتوں کے اعتبار سے اپنی نظیر نہیں رکھتی لیکن اب تک اس کی حیثیت ایک گوہرِ نایاب کی تھی اور ملک میں اس کا ایک قلمی نسخہ بھی دستیاب ہونا دشوار تھا۔

الحمد للہ کہ ۔ سالہا سال کی عرق ریز کوششوں کے بعد ہم آج اس قابل ہیں کہ اس عظیم الشان تفسیر کے شائع ہو جانے کا اعلان کر سکیں اب تک اس کی حسبِ ذیل جلدیں طبع ہو چکی ہیں جو کاغذ اور دیگر سامانِ طباعت و کتابت کی گرانی کی وجہ سے بہت محدود مقدار میں چھپی ہیں۔

ہدیہ غیر مجلد جلد اول تقطیع ۲۲×۲۹/۸ ستر روپے جلد ثانی ستر روپے جلد ثالث آٹھ روپے، رابع پانچ روپے خامس سات روپے سادس آٹھ روپے سابع آٹھ روپے ثامن آٹھ روپے ۔ کل قیمت ۸ جلد ...

التقریظ والانتقاد

مکاتیب شیخ الاسلام حصہ اول

از

(سعید احمد)

مرتبہ مولانا نجم الدین اصلاحی - کتابت وطباعت اعلیٰ ضخامت ۵۲۴ صفحات تقطیع کلاں قیمت ۶ روپے پتہ :- (۱) نجم الدین صاحب اصلاحی سید ہاری - اعظم گڈھ (۲) محمد اسعد و محمد راشد راجہ پور سکرور - سرائے میر اعظم گڈھ -

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کی ذات بابرکات اسلامی فضائل اخلاق اور دینی اوصاف وکمالات کی جامعیت کے اعتبار سے اس دور میں سلف صالحین کا ایک سچا نمونہ اور بہت ہی روشن مثال ہے - آپ اسلامی اور عربی علوم وفنون کے وسیع النظر اور مبصر عالم - سلوک ومعرفت اور طریقت وتصوف کے بحر ناپید اکنار کے کامیاب شناور - اور میدانِ جہاد فی سبیل اللہ کے نہایت سرگرم پرجوش شہسوار اور اخلاق ومکارم کے بہت ہی حسین پیکر ہیں قدرت نے علم وعمل کی یہ سب خوبیاں بیک وقت آپ کی شخصیت میں اس طرح جمع کر دی ہیں کہ ہندوستان تو کیا پورے عالم اسلام میں بھی شاید مشکل سے ہی دو تین اس طرح کی جامع الصفات شخصیتیں نکل سکیں - متع اللہ المسلمین بطول بقائہٖ وحیاتہٖ، زیر تبصرہ کتاب مولانا مدظلہ العالی ہی کے ان مکاتیب وخطوط کا مجموعہ ہے جو آپ نے وقتاً فوقتاً اپنے مریدوں، معتقدوں، دوستوں اور حاشیہ نشینوں کو لکھے ہیں اگرچہ لائق مرتب نے ان مکاتیب میں ترتیب کا کوئی خاص التزام نہیں کیا ہے جیسے وہ اگر ذرا اور توجہ سے کام لیتے

تو با آسانی کر سکتے تھے تاہم مضامین اور مشتملات خطوط کے اعتبار سے بنیادی طور پر ہم ان مکاتیب کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک بہت بڑا اور غالب حصہ تو ان مکاتیب کا ہے جن میں کسی ایک سوال یا سوالات کے جواب میں کسی علمی یا دینی مبحث پر گفتگو کی گئی ہے۔ بے شبہ یہ حصہ مولانا کے فضل وکمال اور علمی وسعت نظر و معلومات کی ایک بڑی روشن دلیل ہے، اس میں تفسیر و حدیث، فقہ وفتاوی علم کلام و عقائد۔ سلوک و معرفت، تاریخ و سیر اور اقتصادیات و اخلاقیات کے خالص ٹھوس اور علمی حقائق پر سیر حاصل اور بصیرت افروز کلام کیا گیا ہے اور کمال یہ ہے کہ اکثر و بیشتر خطوط جن میں سے اکثر فرداً فرداً ایک مستقل علمی مقالہ کا حکم رکھتے ہیں، ریل میں اسٹیشن پر یا جیل خانہ میں قلم برداشتہ در جستہ لکھے گئے ہیں اور اس کے باوجود معلومات کا یہ حال ہے کہ امنڈی چلی آرہی ہیں قرآن مجید کی آیات اور احادیث کا تو کہنا ہی کیا ہے مشائخ و اولیائے کرام کے ملفوظات انھیں کے لفظوں میں اور دوسری کتب متعلقہ کی عبارتیں تک مع صفحات کے حوالہ کے نقل کر دی گئی ہیں۔ درحقیقت استحضار معلومات کا نام ہی رسوخ فی العلم ہے جو مولانا کو بدرجہ اتم حاصل ہے ورنہ دس بارہ کتابیں سامنے رکھ کر کوئی مقالہ لکھ لینا اور محقق کہلانا آج کا ایک عام فیشن ہے جس کو رسوخ فی العلم نہیں کہا جا سکتا۔ اس وصف کے علاوہ ان خطوط سے مولانا کے ایک اور کمال پر بھی روشنی پڑتی ہے جو غالباً عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں ہے۔ اب تک مولانا ابوالکلام آزاد کی ہی یہ خصوصیت سمجھی جاتی تھی کہ ان کو اشعار بے شمار یاد ہیں اور وہ جگہ جگہ اپنی تحریروں میں ان کو موقع موقع سے بٹھاتے چلے جاتے ہیں لیکن ان خطوط سے معلوم ہوا کہ اس وصف خاص میں مولانا مدنی بھی مولانا آزاد سے کم نہیں ہیں بلکہ اس حیثیت سے ان کا قدم آگے ہی ہے کہ مولانا آزاد کے ہاں صرف فارسی کے اشعار ملیں گے اور وہ بھی زیادہ تر وہ جن میں رندی و سرشاری کے مضامین ہوں گے اس کے برخلاف مولانا مدنی کی تحریروں میں فارسی اور اردو کے بہترین اشعار کے ساتھ ساتھ عربی کے بھی بکثرت و بافراط نہایت عمدہ اور بلند اشعار ملیں گے اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ ہندی بھاشا کے نرم و نازک اور رسیلے شعر خاصی تعداد میں نظر آئیں گے، علاوہ بریں خطوط کی زبان بھی صاف و سلیس، اور شگفتہ و رواں ہے اگرچہ مولانا حالی کی طرح مولانا مدنی بھی انگریزی الفاظ استعمال کرنے میں کوئی

مضائقہ نہیں سمجھتے۔ خطوط کا یہ حصہ بلا ریب معلومات افزا بھی ہے۔ اور بصیرت افروز بھی روح پرور بھی ہے اور ایمان آفریں بھی جن کے مطالعہ سے دل اور دماغ بھی شادکام ہوتے ہیں اور جوش عمل ویقین کامل کی دولت بھی میسر آتی ہے، فاضل مرتب نے ان خطوط کی جمع و ترتیب اور ان کی اشاعت کر کے علم اور دین کی ایک قابل قدر خدمت انجام دی ہے جس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ان مکاتیبِ گرامی کے علاوہ چند خطوط وہ ہیں جو بالکل پرائیویٹ اور نجی خطوط کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں جہاں وقت کے سیاسی مسائل پر گفتگو کی گئی ہے اور مولانا نے اپنے سیاسی مسلک کی وضاحت اصولی طور پر کی ہے ہمارے نزدیک اُن کی اشاعت میں نہ صرف یہ کہ کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ بلکہ اُن کی اشاعت اس لئے ضروری تھی کہ اُن سے مولانا کے سیاسی نقطۂ نظر اور اُن کے بلند کردار کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن انہیں خطوط کا وہ حصہ جن میں مولانا نے ملکی سیاسیات یا معاملات دارالعلوم دیوبند کے سلسلہ میں اپنے بعض معاصرین کی نسبت رنج و ملال اور کبیدگی خاطر کا اظہار کیا ہے۔ ہماری رائے میں ان کی اشاعت میں جلد بازی اور بے احتیاطی سے کام لیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم مولانا سے تو کیا عرض کریں کہ چند غیر ذمہ دار لوگوں کی تحریروں پر اپنے عمر بھر کے رفیق اور حضرت شیخ الہند کے معتمد علیہ سے بدگمان ہو جانا اُن کی حوصلہ مندی اور علوِ ظرف کی شان کے شایاں نہیں ہے۔ البتہ فاضل مرتب سے یہ ضرور کہیں گے کہ ہر بزرگ کا قول اور عمل ہر موقع پر اور ہر جگہ نقل کرنے اور شائع کرنے کے لائق نہیں ہوتا۔ جہاں تک معاملات دیوبند کا تعلق ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولانا ۱۹۴۲ء کی تحریک کے سلسلہ میں قید فرنگ میں تھے۔ اور دیوبند کے صدر مہتمم حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور مہتمم مولانا محمد طیب تھے۔ کانگریس کی تحریک میں حصہ لینے کے باعث دارالعلوم دیوبند میں چند ناگوار واقعات پیش آئے۔ حضرت مولانا کو ان کی نسبت اُن کے بعض حاشیہ نشینوں نے جو اطلاعات جس رنگ میں پہنچائیں۔ مولانا آخر انسان ہی تھے فرشتہ نہیں تھے اور نہ پیغمبر کی طرح معصوم تھے اُن سے طبعًا رنجیدہ اور ملول ہونا ناگزیر تھا۔

ان خطوط میں اسی ملال کا اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن تصویر کا ایک دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ جنگ آزادیِ وطن کے سرفروش سپاہی جن کو نہ تعلیم سے دلچسپی تھی اور جو نہ مدرسہ کے قواعد وضوابط کی پروا کرتے تھے ان لوگوں نے توہین وتذلیل کا کوئی طریقہ ایسا نہیں تھا جو حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے حق میں اٹھا رکھا ہو چنانچہ مولانا مرحوم نے خود ہم سے کئی مرتبہ انتہائی غمگین اور آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ ان لوگوں نے دیوبند میں میرا رہنا تو کجا گھر سے نکل کر مسجد تک آنا اجیرن کر دیا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ ڈابھیل یا حیدر آباد جا کر مقیم ہو جاؤں۔ یہ لوگ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف قلمی اشتہار نکالتے تھے، اشعار لکھتے اور اُن کو گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں مشتہر کرتے تھے۔ مولانا کے مکان کے سامنے سے گذرتے تو توہین آمیز نعرے لگاتے ہوئے جاتے تھے اس مجموعہ کے خطوط نمبر ۲۰ اور ۱۲۹ و ۱۳۰ - و ۱۳۱ میں ظاہر ہے کہ مولانا کا گوشۂ نظر مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب اور مولانا محمد طیب کی طرف ہے ان میں سے موخر الذکر تو اس وقت بھی مہتمم تھے اور آج بھی ہیں اور بقید حیات ہیں اس لئے انہوں نے تو اس مجموعہ کے شروع میں جو مقدمہ لکھا ہے اُس میں اپنی مخصوص متصوفانہ زبان میں یہ لکھ کر کہ "مولانا مدنی کے معاملات کی نوعیت اور افتاد طبع سے واضح ہے کہ ان پر بغض فی اللہ کا غلبہ ہے" (ص ۱۰) اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا ہے اور اس لطیف طریقہ پر کہ غالباً فاضل مرتب کو اس کا احساس بھی نہیں ہو سکا ہے۔ ورنہ وہ اس کو شریک اشاعت ہی نہیں کرتے، رہ گئے مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی تو وہ اب اس دنیا میں نہیں۔ اس لئے اب کون ان کی طرف سے صفائی پیش کرے اور کون کہے کہ۔

بھول جا گذرے ہوئے دن بھول جا		بعد مردن اب نہ دل میں رکھ ملال

کون نہیں جانتا کہ مولانا مرحوم عملاً سیاسی آدمی کبھی بھی نہیں رہے اور اس میدان میں وہ تقریر اور رائے کی حد سے ذرا آگے نہیں بڑھے۔ لیکن اپنے اس محدود دائرہ میں وہ ہمیشہ جمعیۃ علمائے ہند کے ساتھ رہے آخر کے چند سالوں میں اُن کو اس سے اختلاف پیدا ہوا۔ لیکن یہ اختلاف دیانت داری پر مبنی تھا اور آج مسلمان جس دور ابتلاء وآزمائش سے گذر رہے ہیں اس کے پیش نظر تو اب یہ فیصلہ

کرنا بھی مشکل ہے کہ کون حق پر تھا اور کون حق پر نہیں تھا۔ نہ وہاں قرآنی اور اسلامی حکومت ہے اور نہ یہاں مسلمانوں کو سکھ اور چین نصیب ہے۔

بیں حکایتِ غمِ آرزو تو حدیثِ ماتمِ دلبری

لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ فاضل مرتب نے حضرت مولانا مدنی کے ایک جملہ کی تشریح اپنے حاشیہ میں اس طرح کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شبیر احمد رحمۃ اللہ علیہ حکومت کے اشارہ پر اسلام کو نقصان پہونچا رہے تھے اور وہ اُس کے آلۂ کار بنے ہوئے تھے حالانکہ مولانا کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے۔ مولانا مکتوب نمبر ۱۲۷ میں فرماتے ہیں "مولوی شبیر احمد صاحب اور مولوی مرتضیٰ حسن صاحب کو اپنے سے جدا نہ ہونے دیجئے۔ اسلام کی خیر اسی میں ہے۔" (ص ۴۰۰) اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو کانگریس کی طرف سے بد دلی پیدا ہو رہی ہے اس لئے ان دونوں بزرگوں کو اپنے ساتھ لگائے رکھئے۔ اگر ان دونوں حضرات نے کسی فرقہ وارانہ جماعت کی سرپرستی شروع کر دی تو اس سے تحریک آزادی کو نقصان پہنچے گا۔ لیکن فاضل مرتب نے مولانا مدنی کے اس جملہ پر جو حاشیہ لکھا ہے اُس میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ایک فقرہ جو حضرت نے اسارت مالٹا سے واپسی پر ساحل بمبئی پر اتر کر مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔ اس فقرہ سے حضرت مدنی کے مذکورۂ بالا فقرہ کا جوڑ لگا کر یہ باور کرانا چاہا ہے کہ مولوی مرتضیٰ حسن صاحب نے شیخ الہند کو گرفتار کرایا تھا اور مولانا شبیر احمد صاحب حضرت مولانا مدنی کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔"

بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

کوئی بتائے کہ اللہ کی اس سرزمین پر اُس قوم کو جینے کا کیا حق ہے جس کا حسین احمد تحریک آزادی کی مشترکہ جدوجہد کے لئے کانگریس سے تعاون کو ضروری سمجھے تو ہندو نواز اور اسلام دشمن کہلائے اور جس کا شبیر احمد کانگریس اور ہندوؤں کی تنگ نظری کا تجربہ کرنے کے بعد مسلمانوں کے لئے ایک الگ پلیٹ فارم مانگے تو حکومت کا آلۂ کار اور اسلام کا غدار بنجائے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اختلاف رائے ایمانداری اور دیانت کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہر شخص جو بھی کام کرے گا

ذاتی غرض اور ہوائے نفس کے لئے کررہا ہے۔ اعاذنا اللہ من شرور انفسنا اس سلسلہ میں فاضل مرتب کو صفحہ ۳۸۰ پر ایک دھوکہ بھی ہوا ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں شمس العلماء کا خطاب مولانا حبیب الرحمن صاحب مرحوم کو نہیں بلکہ حافظ محمد احمد صاحب مرحوم صدر مہتمم کو ملا تھا اور وہ بھی تحریک خلافت کے زمانہ میں انہوں نے عطائے تو بر لقائے تو کے مطابق حکومت کو واپس کردیا تھا۔ علاوہ بریں لائق مرتب نے اور چند حضرات کی نسبت بھی اپنے حواشی میں ذاتی اور شخصی ریمارک کئے ہیں جنہوں نے اس مجموعۂ حسن وخوبی کی ثقاہت اور متانت کو مجروح کردیا ہے۔ ان چند فروگذاشتوں کو چھوڑ کر فاضل مرتب نے جابجا شریعت وطریقت کے احکام ومسائل اور ان کے مصطلحات پر جو حواشی لکھے ہیں وہ بجائے خود بہت مفید اور عالمانہ ہیں اور انہوں نے اس مجموعۂ مکاتیب کی افادیت کو دوگنا کردیا ہے اس بنا پر ارباب علم وذوق کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے آئندہ حصص کی اشاعت کے بارہ میں ہمارا مشورہ یہ ہے کہ حضرت مولانا کے مکاتیب کو کئی جلدوں میں اس ترتیب سے شائع کیا جائے۔

(۱) دینیات۔ اس میں تفسیر۔ حدیث۔ فقہ وغیرہ کے مسائل پر خطوط ہوں۔

(۲) عرفانیات۔ تصوف اور سلوک ومعرفت کے مسائل پر خطوط۔

(۳) عقلیات۔ تاریخ۔ علم کلام۔ اور فلسفہ پر خطوط۔

(۴) سیاسیات۔ سیاسی معاملات ومسائل پر خطوط۔

(۵) متفرقات۔ نجی۔ اور معاشرتی یا ادبی مسائل پر خطوط۔

پھر نجی خطوط کا جہاں تک تعلق ہے اُن میں اس کا خیال رکھا جائے کہ کسی شخص پر کوئی طنز اور تعریض نہ ہو جس سے کسی کی دل آزاری ہوتی ہو۔ یہ خط جب تک مولانا کی نظر سے از اوّل آخر نہ گذر جائیں اور مولانا ان کی اشاعت کی اجازت بھی نہ دیدیں اس وقت تک اُن کو ہرگز شائع نہ کیا جائے۔ بعض خطوط ایسے ہوں گے کہ ایک ہی خط میں مولانا نے متفرق عنوانات پر گفتگو کی ہوگی اور محنت تو کرنی پڑے گی لیکن ان کے بارہ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسے خطوط کو

یک جائی طور پر شائع نہ کیا جائے بلکہ ان کے ٹکڑے کر دئے جائیں اور ہر ہر ٹکڑہ جس عنوان کے ماتحت آئے اس کو وہاں درج کیا جائے۔ مکاتیب کی اشاعت اگر اس ترتیب سے کی گئی تو بے شبہ علم و معرفت اور شریعت و طریقت پر اما لی کے درجہ کا یہ ایک بیش بہا گنجینہ ہاتھ لگ جائے گا۔

مسلمانوں کا عروج اور زوال

جدید اور مکمّل ایڈیشن

اس کتاب میں اولاً خلافتِ راشدہ اس کے بعد مسلمانوں کی دوسری مختلف حکومتوں، ان کی سیاسی حکمت عملیوں اور مختلف دوروں میں مسلمانوں کے عام اجتماعی اور معاشرتی احوال و واقعات پر تبصرہ کر کے ان اسباب و عوامل کا تجزیہ کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے غیر معمولی عروج اور اس کے بعد ان کے حیرت انگیز انحطاط و زوال میں موثر ہوئے ہیں، طبع ثانی جس میں کتاب کے بہت سے حصوں کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے جو ابواب پہلے ایڈیشن میں رہ گئے تھے ان کا اضافہ کیا گیا ہے، اندلس جو مسلمانوں کے عروج و زوال کی عجیب و غریب اور غالباً سب سے زیادہ المناک اور پر حسرت یادگار ہے، پہلے ایڈیشن میں اسے بخوف طوالت چھیڑا ہی نہیں گیا تھا اس مرتبہ ہزارہا صفحات کی ورق گردانی کے بعد زیادہ سے زیادہ مختصر اور جامع الفاظ میں اس داستانِ عبرت خیز کے وہ تمام ٹکڑے لے لئے گئے ہیں جن کا تعلق اس سرزمین پر مسلمانوں کے انتہائی عروج اور پھر لرزہ بر اندام انحطاط و زوال سے ہے۔

درسِ عبرت نامکمل رہ جاتا اگر اسپین کے ذکر کے ساتھ خود اپنے وطن ہندوستان کی یاد تازہ نہ کی جاتی چنانچہ اس دفعہ یہ کمی بھی پوری کر دی گئی ہے اور اس ملک میں مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب کا کامیاب تجزیہ کیا گیا ہے اور تاریخی بصیرت کے جواہر ریزے بکھیرے گئے ہیں۔ ان تفصیلی اضافوں کے بعد اس موضوع پر یہ کتاب بہت ہی نفیس اور بلند پایہ کتاب ہو گئی ہے بڑی تقطیع صفحات ۴۸۰ قیمت چار روپے مجلد پانچ روپے۔

ادبیات

غزل

از

(جناب الّم مظفر نگری)

جہاں میں سوزِ محبّت کا ترجماں نہ ملا
زبانِ شمع یہ پروانے کا بیاں نہ ملا

تمام عمر کہیں مجھ کو ہم زباں نہ ملا
مزاج داں تو ملے کوئی رازداں نہ ملا

کہاں تھا نبض شناسِ چمن وہ دنیا میں
بہارِ گل میں جسے پہلوئے خزاں نہ ملا

میں بن جبر ہوں تو اختیار کا مالک
مرے فسانے سے یہ اپنی داستاں نہ ملا

ازل سے گرمِ سفر ہوں مگر مجھے اب تک
بچھڑ گیا تھا میں جس سے وہ کارواں نہ ملا

قفس میں اور نشیمن میں رہ کے دیکھ لیا
کہیں بھی چین مجھے زیرِ آسماں نہ ملا

حیاتِ شوق کا اس کارگاہِ فانی میں
اجل سے بڑھ کے کوئی بھی نگاہباں نہ ملا

کہیں یہی نہ ہو بنیادِ انقلابِ چمن
چمن کی خاک میں یوں خاکِ آشیاں نہ ملا

غمِ فراق ہو یا سرخوشیٔ روزِ وصال
مریضِ عشق کا کوئی مزاج داں نہ ملا

وہ دل رہے گا سکونِ دوام سے محروم
تری نظر سے جسے دردِ جاوداں نہ ملا

جھکی خود اپنے ہی سجدے میں اور پھر نہ اٹھی
جبینِ شوق کو جب ان کا آستاں نہ ملا

[illegible]

سبھی نے اُن سے کہا حشر میں فسانۂ دل
مجھے یہاں بھی الّم موقعِ بیاں نہ ملا

ایک مکالمہ

شمس نوید عثمانی

انجام :-

کیوں ہے اے آغاز تو مصروف لافِ رائیگاں
جب ہر اک شے ایک دن ہوتی ہے نذرِ اختتام

آغاز :-

اے مرے ہمدم نہیں ! میں اس کٹھن منزل میں بھی
ہر مال نو سے اپنا سر اٹھاتا ہوں مدام !

(ٹیگور)

اپنی پچھترویں سالگرہ پر

میں کسی کے لئے کوشاں نہ رہا کیوں کہ جہاں
کوئی شے ہی نہ ملی جدّ و جہد کے شایاں
میں نے "فطرت" سے کیا پریم پھر اس کے آگے
"فن" کی زد میں مرے جذباتِ محبت جاگے
آتشِ زیست پہ دو "ہاتھ" یوں ہی تاپے ہیں
بجھ رہی ہے یہ ـــــ سفر کے لئے تیار ہوں میں

(ڈبیو۔ ایس۔ لینڈر)

شئونِ علمیہ

جوہریات جوہری بم کہنا چاہیے کہ جرمنوں نے چلانا چاہا تھا لیکن بالآخر امریکہ والوں نے اس کو چلایا جوہری بم کو "سربستہ راز" قرار دیا گیا، اس کے کسی جز کا انکشاف جرم قرار پایا۔ یہاں تک کہ امریکہ نے اپنے ساتھی ملکوں کو بھی اس کا راز بتانے سے انکار کیا۔ لیکن برطانوی سائنس داں بھی اس کی تحقیق میں مصروف تھے۔

چنانچہ حال ہی میں اطلاع ملی کہ آسٹریلیا کے علاقے میں "جزیرۂ ابلیس" (ڈیولس آئی لینڈ) کے خفیہ حلقے میں برطانیہ کا پہلا جوہری بم آزمایا گیا۔ یہ بھی راز ہے لیکن جس قدر بتلایا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شہر کا شہر بنا کر کھڑا کر دیا گیا تھا تاکہ بم کی تخریبی قوتوں کا اندازہ لگایا جا سکے۔

سرکاری طور پر وزیر اعظم مسٹر چرچل کے ایما پر برطانوی امارت بحریہ نے صرف اتنا اعلان کیا کہ ایک جوہری بم کا کامیاب تجربہ کیا گیا۔

قلتِ معلومات کے باوجود بھی کہا جاتا ہے کہ امریکی بم سے برطانوی بم بدرجہا برتر اور طاقتور تر ہے خشکی اور تری میں اس کے جو دھماکے ہوئے ان کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ برطانوی بم بے نظیر ہے۔

فرانس کے مشہور سائنس داں ڈی براگلی نے کہا کہ برطانیہ نے بلا شرکت غیرے اس بم کو تیار کیا اور اس طرح ثابت کر دیا کہ وہ جوہریات میں بھی صفِ اول کا مستحق ہے۔

آسٹریلیا کے ڈاکٹروں اور سبکدوش شدہ ملازمین کی انجمنوں نے انتباہ دیا ہے کہ آسٹریلیا جوہری بم کے کسی حملہ کی مدافعت کے لئے بالکل بھی تیار نہیں ہے۔ انھوں نے حکومت پر زور دیا ہے کہ حملہ کے امکان کے مدِنظر ضروری انتظامات کئے جائیں

آسٹریلیا میں ایک شہر ملبورن ہے جس کی آبادی ۱۵ لاکھ ہے اب اگر کوئی حملہ ہو تو ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ایک دم ۰۰۰،۲۰ مجروحین کی دیکھ بھال کی ضرورت پڑ جائے گی ان کی خبر گیری کے لئے تربیت یافتہ طبی عملہ موجود نہیں ہے۔

آسٹریلیا کی میڈیکل کانگرس میں ایک سابق فوجی طبی افسر میجر جنرل سر سیموئیل برسٹن نے اس بات پر زور دیا کہ مفاجاتی ہسپتالوں کو شہروں کے باہر قایم کرنے کا منصوبہ تیار کیا جائے کیونکہ شہروں کے موجودہ ہسپتال اس حملے سے شاید خود ہی تباہ ہو جائیں انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ آن کی آن میں جوہری حملے کا شکار ہونے والوں کی تعداد بہت زبردست ہو گی چند منٹوں میں اتنی تعداد میں اس طرح مجروح ہونے والوں کی خبر گیری کوئی آسان کام نہیں ہے۔

اس لئے میڈیکل کانگرس نے جو قرار دادیں منظور کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) خون کے بنیک فوری قایم کئے جائیں۔

(۲) آتش زدگی اور صدمے کا شکار ہونے والوں کی خبر گیری کے لئے شہری آبادی کو تربیت دی جائے۔

(۳) مجروحین کی طبی امداد کے مرکز قایم کئے جائیں۔

(۴) دوائیں اور ضروری طبی سامان جمع رکھا جائے۔

پچھلی عالمگیر جنگ میں برطانیہ پر ہوائی حملے بہت ہوئے تھے۔ اس وقت وزیر اعظم مسٹر چرچل ہی تھے انھوں نے اور اراکین حکومت نے ایک پناہ گاہ میں پناہ لی تھی جس میں بوقت واحد دو ہزار آدمی سما سکتے تھے۔

اب کہا جاتا ہے کہ پچھلے ڈیڑھ برس سے لندن شہر کے بازو میں ایک نیا شہر بن رہا ہے جو لندن کی سڑکوں سے ۵۰ فٹ نیچے ہے سات دہانے کھود دیے جا چکے ہیں جن کو برقی طاقت اور غالباً ریل سے ملا دیا جائے گا۔ یہ تعمیر بھی غالباً صیغہ راز میں ہے لیکن ہر شخص اسے کھلا راز سمجھتا ہے۔

اس کی نسبت دعویٰ کیا گیا ہے کہ پناہ گاہوں کا یہ سلسلہ جوہری بم کے حملوں سے پناہ دے گا اس طرح کہا جاتا ہے کہ لندن جوہری بم کا مقابلہ کر سکے گا۔

مرکزی تحقیق (نیوکلیر ریسرچ) کے نارویے ولندیزی ادارے کے ناظم ڈاکٹر رانڈرس نے حال میں بلغراد (یوگوسلادیا) کے فنی ماہروں کے ایک اجتماع میں ایک لکچر کے دوران میں فرمایا کہ "چھوٹی قوموں کو چاہئے کہ وہ جوہری توانائی کو نشوونما دیں ورنہ بلند تر معیارِ زندگی کے حصول میں وہ بڑی قوموں سے بہت پیچھے رہ جائیں گی۔

چند برسوں کے اندر حالت یہ ہو جائے گی کہ جس ملک کے پاس جوہری توانائی نہ ہوگی اس کی وہی کیفیت ہوگی جو آج ان ملکوں کی ہے جن کے پاس برقی توانائی نہیں ہے۔

چھوٹی قومیں اگر تعاون کریں تو یہ کام ان کی استطاعت سے باہر نہیں ہے۔

ہم سمجھتے ہیں جہازوں کو جوہری توانائی سے چلانے کا کام چھوٹی قوموں کے استطاعت کے اندر ہے۔ اگر یہ تجربے کئے جائیں تو کچھ ایسا نقصان نہ ہوگا۔ لیکن اگر یہ کوشش نہ کی جائے تو نقصان بہت زبردست ہوگا۔

جوہری توانائی کی پرداخت میں ایک اہم مسئلہ یورینیم کی رسد ہے۔ آج کل کے صرفہ کا لحاظ کیا جائے تو موجودہ رسد صرف ہزار برس تک کام دے گی۔

تبصرے

انواع فلسفہ | از جناب ظفر حسین خاں صاحب۔ تقطیع متوسط ضخامت ۳۶۸ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد پانچ روپے آٹھ آنے ﷲ شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڈھ

انگریزی میں پروفیسر ولیم ارنسٹ ہاکنگ کی کتاب "ٹائپس آف فلاسفی" فلسفہ کے علما اور طلباء میں بہت مشہور و مقبول کتاب ہے جس میں فاضل مصنف نے عام فہم اور سلیس و دلچسپ انداز بیان میں فلسفہ کی تعریف مختلف ادوار میں اس کی شکلیں اور اس کے مدارج ارتقا اور پھر مختلف نقطہائے نظر کے ماتحت اس کی مختلف شاخیں اور اسکول وغیرہ مباحث پر گفتگو کرکے ہر ایک قسم یا اسکول کی تشریح کی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اسی کا اردو ترجمہ ہے۔ لائق مترجم نے اصل کتاب کی خصوصیت یعنی سہولت و شستگی بیان کا ترجمہ میں بھی کافی لحاظ رکھا ہے۔ یہاں تک کہ بہ ظاہر ترجمہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ ترجمہ پر اصل کا دھوکہ ہو جاتا ہے اس حیثیت سے اس کتاب کی اشاعت سے اردو میں فلسفہ کی کتابوں کے ذخیرہ میں ایک مفید اضافہ ہوا ہے۔ کتاب ۳۵ ابواب پر مشتمل ہے شروع میں لائق مترجم کا مقدمہ ہے جس میں اصل کتاب اور اس کے مصنف سے انھوں نے تعارف کرایا ہے اور آخر میں فرہنگ اصطلاحات ہے جس میں اردو کے ساتھ انگریزی کے مترادفات دئے گئے ہیں۔ اور پھر اردو زبان میں فلسفہ کی منتخب کتابوں کی ایک فہرست ہے فلسفہ کے طلباء کے علاوہ اردو کے عام ذی استعداد حضرات کے لئے بھی اس کتاب کا مطالعہ مفید اور بصیرت افزا ہوگا۔

اطلاقی سماجیات | از ڈاکٹر جعفر حسن۔ تقطیع متوسط ضخامت ۲۳۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت پانچ روپیہ شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڈھ

اطلاقی سماجیات خوش حالی کے اس علم کا نام ہے جس میں سماج اور تمدن کی خرابیاں اور

برائیاں زیر بحث آئی ہیں اور جس میں ان کی اصلاح کے طریقوں پر گفتگو کی جاتی ہے یوں تو اردو میں اس موضوع پر مختلف عنوانات کے ماتحت اور بھی کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن غالباً یہ پہلی کتاب ہے جس میں سائنٹیفک اور فنی طریقہ پر اس موضوع پر گفتگو کی گئی ہے۔ شروع میں ایک تمہید ہے جس میں لائق مصنف نے اس فن کی تعریف اور اس کی غایت و موضوع پر کلام کرنے کے بعد دوسرے علوم و فنون سے اس فن کا تعلق اور رشتہ بتایا ہے اور اس کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اس کے بعد آٹھ ابواب ہیں جن میں دولت اور خوش حالی کی تعریف کرنے کے بعد ان کی مختلف قسمیں اور ان کا باہمی رشتہ اور خوش حالی کے لوازم اور شرطیں۔ پھر سماجی امراض افلاس۔ عیب اور جرم۔ ان کی حقیقت۔ ان کے اثرات اور نتائج اس کے بعد معیار زندگی کے مختلف مدارج اور اس کا سماجیاتی مفہوم اور پھر سماجی سیاست اور سماجی اصلاح وغیرہ کے طریقے ان سب پر فن کارانہ گفتگو کی گئی ہے زبان صاف و سلیس اور عام فہم ہے لیکن حیدرآباد میں علمی اصطلاحات کو اردو کا قالب دینے کی جو کوشش کی گئی ہیں ان کا اثر جگہ جگہ اس کتاب میں ظاہر ہے جس کی وجہ سے ان لوگوں کو جو ان نئے الفاظ سے مانوس نہیں ہیں یک گونہ وحشت کا ہونا لازمی ہے۔ پھر یہ عجیب بات ہے کہ فاضل مصنف نے عربی اور فارسی کے متداول اور رواں الفاظ کو استعمال کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے لیکن اس کے باوجود لفظوں نے "ضمیمہ" کو "جزادا" لکھا ہے۔ ہم نے خود جب پہلی مرتبہ یہ لفظ دیکھا تو سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر سیاق و سباق سے معلوم ہوا کہ یہ ضمیمہ کا ترجمہ ہے بہر حال کتاب مفید اور مطالعہ کے لائق ہے اس کے مطالعہ سے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوں گی جن کو آدمی روزانہ یا اکثر اپنے سماجی ماحول میں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے مگر نہ تو وہ اس کی صحیح تعبیر کر سکتا ہے اور نہ اس کی کوئی معقول توجیہ اس کی سمجھ میں آتی ہے۔

اسلامی فن تعمیر از جناب سید مبارز الدین رفعت ایم۔ اے (عثمانیہ) تقطیع متوسط ضخامت ۲۳۵ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد مہ روپیہ شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ھند) علی گڈھ

یہ کتاب ارنسٹ ٹاڈ ھیام رچمنڈ جو ایک زمانہ میں مجلس برائے تحفظ آثار عرب مصریہ کا اسسٹنٹ انجنیر تھا اس کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ جس میں مصنف نے اسلامی فن تعمیر کی خصوصیات۔ عہد بعہد اس

کا ارتقاء۔ اور اس کے طبعی وتاریخی اسباب وعلل پر گفتگو کی ہے اور ۶۲۳ء یعنی سال ہجرت سے لے کر ۱۶۱۵ء یعنی مصر میں عہد ممالیک تک بلادِ عرب میں جو اسلامی تعمیرات ہوئی ہیں ان کا ذکر بحیثیت ایک فن تعمیر کے ماہر کے کیا ہے کتاب کے مفید اور معلومات افزا ہونے میں کلام نہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ مصنف نے بعض عمارتوں کا تاریخی پس منظر بیان کرتے وقت چونکہ مسلمان مصنفین کے بجائے مغربی مورخین کے بیان پر اعتماد کیا ہے اس لئے ان کے قلم سے بعض باتیں ایسی نکل گئی ہیں جو خود تاریخی اعتبار سے لائق قبول نہیں ہیں مثلاً یہ کہ حضرت ابوبکرؓ نے ۶۳۳ء کے اختتام سے کچھ پہلے باز نطینی سلطنت کی شامی سرحدوں اور ایران کی سرحدوں یا ان دونوں کے راستوں پر چھاپہ مارنے اور لوٹنے کے لئے اسلامی فوجیں روانہ کیں۔ یا غیر مسلموں کی نسبت یہ لکھنا کہ وہ اسلام اس لئے قبول کرتے تھے کہ اس سماجی کمتری کی لعنت سے بچ جائیں جو ان پر مسلط کی جاتی تھی۔ بہرحال ترجمہ صاف وسلیس اور رواں ہے اگرچہ کہیں کہیں اغلاق پیدا ہو گیا ہے امید ہے کہ ارباب ذوق اس کی قدر کریں گے اور اس کے مطالعہ سے فائدہ اٹھائیں گے

غلامانِ اسلام

انتی کے قریب ان صحابہ تابعین، تبع تابعین، فقہا اور محدثین اور ارباب کشف وکرامات اور اصحاب علم وادب کے سوانح حیات اور کمالات وفضائل بڑی تحقیق وتدقیق سے جمع کئے گئے ہیں جنہوں نے غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود ملت کی عظیم الشان خدمتیں انجام دیں جنھیں اسلامی سوسائٹی کے ہر دور میں عظمت واقتدار کا فلک الافلاک سمجھا گیا اور جن کے علمی، مذہبی، تاریخی اور سماجی کارنامے اس قدر شاندار اور اس قدر روشن ہیں کہ ان کی غلامی پر آزادی کو رشک کرنے کا حق ہے اور بجا ہے یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ایسی محققانہ دلچسپ اور معلومات سے بھرپور کتاب اس موضوع پر اب تک کسی زبان میں شائع نہیں اس کے مطالعہ سے غلامانِ اسلام کے حیرت انگیز اور شاندار کارناموں کا نقشہ آنکھوں میں سما جاتا ہے دوسرا ایڈیشن صفحات ۴۸۸ بڑی تقطیع قیمت پانچ روپے آٹھ آنے مجلد چھ روپے

برُہان

جلد بست و نہم — شمارہ نمبر ۶

دسمبر ۱۹۵۲ء مطابق ربیع الاول ۱۳۷۲ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

پروفیسر جے۔ بی چودھری بنگال کے مشہور فاضل اور سنسکرت کے نامور عالم ہیں، چند سال ہوئے موصوف نے مسلمان بادشاہوں کی سنسکرت اور ہندی علوم وفنون کی سرپرستی" کے نام سے انگریزی میں ایک کتاب لکھی تھی۔ حال ہی میں بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی نے ایک کتاب "ہندوستان کا تعارف" کے نام سے شائع کی ہے جس میں ملک اور بیرون ملک کے متعدد افاضل نے ہندوستان کی تاریخ رسم ورواج علم وادب۔ زبان اور آثار قدیمہ وغیرہ مباحث پر مفید اور پُر از معلومات مقالات لکھے ہیں پروفیسر چودھری کا ایک مقالہ اس مجموعہ میں بھی شامل ہے اور اس کا عنوان بھی وہی ہے جو اُن کی کتاب کا ہے۔ بہرحال یہ مقالہ ان لوگوں کو ضرور پڑھنا چاہیے جو مسلمانوں پر عموماً اور مسلمان بادشاہوں پر خصوصاً یہ الزامات لگانے میں لطف محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے ہندوؤں کی زبان، ان کے علوم وفنون اور ان کے کلچر کے ساتھ نہایت بے رحمانہ معاملہ کیا ہے اور اُن کو فنا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مسلمانوں کا ہندی زبان وادب اور اس کی شاعری کی ترقی میں کتنا دخل ہے! اس کا تذکرہ آپ انہی صفحات پر ڈاکٹر ہزرت جاہو بادھیا پکھی دھر کے مقالہ میں پڑھ چکے ہیں جس میں موصوف نے کہا تھا کہ ہندی کے پانسو مسلمان صوفی شاعروں کے دیوان تو خود ان کے پاس ہیں۔

پروفیسر چودھری کا یہ مقالہ کافی طویل ہے ہم یہاں صرف اس مقالہ کی چند ابتدائی سطروں کا ترجمہ نقل کرتے ہیں جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہندی کے ساتھ ساتھ سنسکرت اور دوسرے ہندو علوم وفنون کے ساتھ مسلمان بادشاہوں کا کیا رویہ رہا ہے! اور یہ اعتراف کسی مسلمان کا نہیں بلکہ خود ہندو اور سنسکرت کے ایک فاضل کا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:۔

"یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بادشاہ علوم وفنون کے بڑے سرپرست اور مربی تھے۔ لیکن یہ بات عام طور پر معلوم نہیں ہے کہ بہت سے مسلمان بادشاہوں نے بڑی فیاضی کے ساتھ خاص طور پر سنسکرت کی تعلیم کی بھی سرپرستی کی ہے۔ مسلمان بادشاہوں کے عہد میں سنسکرت نے جو ترقی کی ہے چونکہ

اب تک اس کے متعلق بہت کم تحقیقات ہوئی ہیں اور پھر جہاں تک سنسکرت لٹریچر کا تعلق ہے ہندو اور مسلمانوں کے کلچرل تعلقات معلوم کرنے کے وسائل و ذرائع پر اب تک کوئی باقاعدہ توجہ نہیں کی گئی ہے اس بناپر قرونِ وسطیٰ میں ہندو اور مسلمانوں میں جو تہذیبی اور ثقافتی یکسانیت پیدا ہوگئی تھی اُس کا علم بہت کم اب تک حاصل ہوسکا ہے۔ اس بناپر میں اپنے مقالہ کے پہلے حصہ میں یہ بتاؤں گا کہ ہندوستان کے بہت سے مسلمان بادشاہ سنسکرت کلچر کے حقیقی قدردان اور اس سے محبت کرنے والے تھے اور انہوں نے سنسکرت کی تعلیم کو عام کرنے اور اس کے پھیلانے میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں۔ پھر اسی مقالہ کے دوسرے حصہ میں میں مسلمانوں کی اُن قابل قدر ادبی کوششوں کا ذکر کروں گا جو انہوں نے سنسکرت لٹریچر کو ترقی دینے میں کی ہیں۔

مسلمان بادشاہوں نے سنسکرت کی تعلیم کو عام کرنے اور اس کے پھیلانے میں جو کوششیں کی ہیں وہ مندرجہ ذیل اقسام کی ہیں۔

(۱) سنسکرت زبان وادب اور اس کے علوم وفنون مثلاً فلسفہ۔ علم النجوم اور شاعری وغیرہ کے بہت سے ماہروں اور فاضلوں کی مسلمان بادشاہوں نے بڑی فیاضی اور دریادلی کے ساتھ مالی سرپرستی کی۔

(۲) ان بادشاہوں نے خود سنسکرت میں شاعری کی۔

(۳) ان مسلمان بادشاہوں نے سنسکرت علوم وفنون پر عربی یا فارسی میں کتابیں لکھیں۔

(۴) سنسکرت کی مختلف کتابوں کا خود ان مسلمان بادشاہوں نے عربی۔ فارسی۔ یا اور کسی اپنی زبان میں ترجمہ کیا۔

(۵) سنسکرت کی معیاری کتابوں کا جو ترجمہ عربی۔ فارسی وغیرہ میں ہوا اس کی نگرانی خود مسلمان بادشاہوں نے کی۔

جن مسلمان بادشاہوں نے سنسکرت کے شعرا اور علما کی مالی سرپرستی بڑی فیاضی اور دریادلی کے ساتھ کی ہے اُن میں حسب ذیل بادشاہ خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔

شہاب الدین۔ نظام شاہ۔ شیر شاہ۔ اکبر۔ شاہجہاں۔ مظفر شاہ برہان خاں وغیرہم اور جن شعرا کی انہوں نے سرپرستی کی ہے ان میں سے چند شعرا کے نام یہ ہیں۔

بھانوکر، اکبری کالی داس، جگناتھ پنڈت راج، امرت، پنڈت ڈریک ڈھل، ہری نارائن، مصرا دسی تھر لکشمی پتی، وغیرہ"۔ اس قدر بہ طور تمہید لکھنے کے بعد پروفیسر ڈاکٹر چودھری نے اصل مضمون شروع کیا ہے جس کا خلاصہ کسی آئندہ اشاعت میں نذرِ قارئین کیا جائے گا۔

مولانا شبلی نے تو صرف عالمگیر کی ہی نسبت کہا تھا کہ

تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا   کہ عالمگیر ہندو کش تھا۔ ظالم تھا، ستمگر تھا۔

لیکن ایک عالمگیر کیا؟ آج تو ہر مسلمان بادشاہ ہی عالمگیر سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال تاریخ کے صفحات پر جو واقعات نقش ہیں وہ تو ایسی آسانی سے نہیں مٹ سکتے!

اسلامک کلچر حیدرآباد دکن کا اس قدر بلند پایہ سہ ماہی علمی رسالہ ہے کہ اگر وہاں دارالترجمہ، جامعہ عثمانیہ، دائرۃ المعارف وغیرہ علمی ادارے نہ ہوتے تو ایک یہ ہی رسالہ علمی دنیا میں حیدرآباد اور اس کے ذریعہ سے ہندوستان کی عظمت و وقار قائم کرنے کے لئے کافی ہوتا۔ مشرق و مغرب کے بڑے بڑے اسلامیات و مشرقیات کے محقق اور افاضل اس میں مقالات لکھتے رہے ہیں اور بے شبہ اس رسالہ نے اپنی پچیس (۲۵) سال کی زندگی میں اسلامی و مشرقی علوم و فنون پر اس قدر عمدہ ذخیرہ فراہم کر دیا ہے جو کسی ملک کے لئے باعث فخر ہو سکتا ہے ۱۹۲۷ء سے نظام گورنمنٹ اس کو بیندرہ ہزار روپیہ سالانہ دیتی رہی ہے اور اسی کی وجہ سے اسلامک کلچر پابندی اور اپنی شان کے ساتھ برابر جاری رہا ہے۔ لیکن حیدرآباد کی موجودہ حکومت نے اس امداد کو بند کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ابھی پچھلے دنوں سلور جوبلی نمبر کے نام سے تقریباً دو سال کی مدت کے بعد اب اس رسالہ کا ایک نمبر نکلا ہے۔ اور اڈیٹر صاحب نے اپنے نوٹ میں لکھا ہے کہ اگر حکومت نے امداد نہیں کی تو یہ رسالہ جاری نہیں رہ سکتا۔ ہم حکومتِ حیدرآباد سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس رسالہ کی امداد فوراً جاری کر دے۔ ورنہ اگر یہ بند ہو گیا جس کا موجودہ حالات میں قوی امکان ہے تو یہ علمی دنیا کا ایک بڑا ازبرست حادثہ اور حکومت کے دامن پر ایک بدنما داغ ہوگا

اسلام کا نظامِ عفت و عصمت

از

(جناب مولوی محمد ظفیر الدین صاحب استاذ دارالعلوم معینیہ سانحہ)

(۴)

طلبِ اذن کی حکمت پھر طلب اذن میں بڑی حکمت اور بہت فائدے ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ طلبِ اذن جس کو حدیث کی اصطلاح میں "استیذان" کہتے ہیں واجب ہے، اور واجب پر عمل ضروری ہے، دوسرے یہ کہ کیا معلوم دفعۃً اندر جانا تمہارے لئے خود مضر ہو، یا گھر والے کا اس سے نقصان ہو، اور ان میں سے جو بھی صورت ہو ہر ایک سے اجتناب ضروری ہے، تیسرے یہ کہ ہو سکتا ہے دفعۃً (یکبارگی) جانے میں نظر ایسے محل پر پڑے جہاں دیکھنا ناگوارِ خاطر ہو، خود جانے والے کے لئے بھی، اور گھر والوں کے لئے بھی، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے دفعۃً کسی ناپسند یا ناجائز چیز پر نظر پڑ جانے سے زندگی کو روگ لگ جاتا ہے اس لئے عقل اور خرد کا تقاضا یہی ہے، کہ کسی کے گھر میں اجازت حاصل کئے بغیر گھسنے کی جرأت نہ کی جائے

ایسی حویلی جس میں ایک باپ کی متعدد اولاد ہوں، اور وہ سب یا کچھ ان میں سے شادی شدہ ہوں، تو ایسی حالت میں بھی اپنا خیال ہے کہ اصول کے مطابق اجازت کے حصول کی ضرورت ہے، اس لئے کہ غیر محرم عورتیں ہیں، یا کم از کم ایسی صورت اختیار کی جائے کہ گھر کی عورتیں داخل ہونے سے پہلے خبردار ہو جائیں، اور وہ اپنے کو سنبھال لیں، اور یہ طریقہ ہر زنانہ گھر میں جانے کے وقت اختیار کرنا چاہئے۔

طلبِ اذن کی صحابۂ کرام کو تعلیم رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے استیذان کی تعلیم عملی طور پر صحابۂ کرام کو دی۔ اس لئے اس سے متعلق واقعات حدیث کی کتابوں میں بکثرت آئے ہیں، طلبِ اذن کے باب میں حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

الاستیذان ثلاث فان اذن لک

طلبِ اذن تین مرتبہ ہے اگر اجازت مل جائے تب تو خیر، ورنہ

والا فارجع متفق علیہ (ریاض الصالحین باب الاستیذان) واپس ہو جانا چاہیے

بنی عامر کے ایک شخص ———— کا بیان ہو کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے

آپ گھر کے اندر تھے، دروازہ پر پہونچ کر درخواست کی، داخل ہونے کی اجازت ہے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کو یہ آواز جب پہونچی تو خادم سے فرمایا، باہر جو شخص آیا ہے، اس کے پاس جاؤ، اور اس کو اجازت طلب کرنے کا

شرعی سلیقہ سکھاؤ، اس سے بتاؤ کہ تم اس طرح کہو "السلام علیکم۔ کیا اندر آؤں؟" دروازہ پر جو شخص آیا تھا اس

نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت کو جو آپ اندر اپنے خادم کو دے رہے تھے، سن لیا، اور اب کے کہا

السلام علیکم۔ اندر حاضر ہو سکتا ہوں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب شرعی طریقہ سے طلب اذن سنا تو

آپ نے اس کو اجازت دیدی، اور وہ شخص اندر آیا[1]

حضرت کلدہ بن الحنبلؓ کہتے ہیں کہ میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا۔ اور بغیر سلام کئے آنحضرت کی خدمت

میں حاضر ہو گیا، یہ دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا واپس جاؤ۔ اور یہ کہو السلام علیکم۔ کیا اندر آؤں؟[1]

صحابہ کرام کا عمل | ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ اجازت جب لینی ہو تو پہلے سلام کیا جائے، پھر اندر حاضر ہونے کی

اجازت طلب کرے، بغیر سلام، طلبِ اذن ناپسندیدہ طریقہ ہے، اوپر والی حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اجازت

کے لئے تین مرتبہ آواز دی جائے گی، تیسری مرتبہ بھی جب جواب نہ ملے تو واپس ہو جائے، حدیث میں حضرت

ابو موسیٰؓ کا واقعہ مذکور ہے کہ یہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں آئے، تین مرتبہ شرعی طریقہ کے مطابق اجازت طلب

کی، کوئی جواب نہیں ملا پلٹ آئے، حضرت عمرؓ کسی کام میں مصروف تھے، اطمینان ہوا تو فرمایا کہ ان (ابو موسیٰ)

کو بلالو، آدمی ان کو بلانے باہر آیا، تو دیکھا حضرت ابو موسیٰؓ جا چکے ہیں، جا کر حضرت عمرؓ کو خبر دی، پھر دوبارہ جب کسی

موقع سے حضرت ابو موسیٰؓ آئے تو حضرت عمرؓ نے دریافت فرمایا کہ اس وقت کیوں واپس ہو گئے؟ جواب دیا کہ تین

مرتبہ میں نے اجازت چاہی اجازت کی آواز نہیں آئی چلا آیا، کیونکہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے

ہوئے سنا ہے۔

ان استاذن احدکم ثلاثا فلم یوذن ———— تم میں سے کوئی تین بار طلب اذن کرے اور اس کو اجازت

---

[1] ریاض الصالحین باب الاستیذان وآدابہ سنہ ایضاً

لہ فلینصرف (ابن کثیر ص ۲۷۹ ج ۳) نہ دی جائے تو اس کو پلٹ آنا چاہیے۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ ہے کہ آپ حضرت سعد بن عبادہؓ کے یہاں تشریف لائے، اور اجازت چاہی، تین مرتبہ سلام کے ساتھ اجازت طلب کی، کوئی جواب نہیں ملا تو تیسری مرتبہ کے بعد واپس ہو گئے اتنے میں حضرت سعدؓ دوڑے آئے اور آپ کو لے گئے[۱]

دروازہ پر جھانک تاک کرے

اجازت کی ضرورت بیش اس لئے آتی ہے کہ دفعۃً گھر والے کو دیکھ نہ لے، خود سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

انما جعل الاستیذان من اجل البصر متفق علیہ (ریاض الصالحین ص ۳۹۲) دیکھ لینے کی وجہ سے طلب اذن کا قانون بنایا گیا ہے۔

اسی وجہ سے حکم ہے کہ اصولی طور پر اس کو دروازہ سے علیحدہ ہو کر کھڑا ہونا چاہیے، دائیں بائیں جدھر مناسب ہو کھڑا ہو جائے۔ بالکل دروازہ کے مقابل کھڑا نہ ہو، حضرت عبد اللہ بن بسرؓ کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کے دروازہ پر آتے، تو دروازہ کے مقابل نہیں کھڑے ہوتے، بلکہ دائیں جانب کھڑے ہوتے، یا بائیں جانب، اور فرماتے السلام علیکم۔ السلام علیکم، راوی کا بیان ہے کہ عہد نبوی میں دروازوں پر پردہ لٹکانے کا رواج نہیں تھا[۲]، اس کا منشا یہ ہے کہ اگر پردہ ہو تو دروازہ کے سامنے کھڑا ہونا بھی ناجائز نہیں ہے، گو اصول کے پیش نظر اب بھی مناسب یہی ہے کہ دروازہ کے بالکل مقابل کھڑے ہو کر اجازت نہ طلب کی جائے، کیونکہ بسا اوقات پردہ اٹھا کر کوئی اندر سے نکلتا ہے تو سامنے سے گھر کے آدمی پر نظر پڑ جاتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر حاضر ہوا، اور اجازت طلب کی، وہ شخص دروازہ کے مقابل تھا آپ نے اشارہ سے فرمایا کہ ایسے (یعنی دائیں)، یا ایسے (بائیں) کھڑے ہو، اور وجہ یہ بیان فرمائی، کہ طلب اذن نگاہ ہی کی وجہ سے ہے[۳]،

پھر دروازہ پر پہونچ کر تاک جھانک نہیں کرنا چاہیے، یہ تاک جھانک دروازہ کے دراز سے ہو یا کھڑکی وغیرہ سے، کیونکہ اس سے مقصد ہی فوت ہو جائے گا، پھر اس لئے کہ آپ ابھی پڑھ چکے کہ نگاہ ہی سے بچنے کے

---

[۱] ابن کثیر ص ۲۷۹ ج ۳ [۲] مشکوٰۃ باب الاستیذان عن ابی داؤد [۳] ابن کثیر ص ۲۷۹ ج ۳

لئے یہ قاعدے وضع کیے گئے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے سختی سے ممانعت کی ہے صحیحین میں یہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لو ان امرأ اطلع علیک بغیر اذن فخذفتہ بحصاۃ ففقأت عینہ ما کان علیک من جناح (ابن کثیر ج۳ ص۲۷۹)

اگر کوئی بغیر اجازت تم کو جھانکے اور تم اس کو کنکری اٹھا کر مارو جس سے اس کی آنکھ پھوٹ جائے تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

جس جرم کی اتنی سخت سزا رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں ہو، اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فی نفسہ یہ جرم کتنا بڑا ہوگا،

طلب اذن کے وقت اپنا مشہور نام بتائے — سلام کے بعد طلب اذن کے لئے جب آواز دے اور گھر سے کوئی پوچھے تو کون ہے، تو اجازت چاہنے والے کو اپنا مشہور نام بتانا چاہیے، جواب میں یہ نہیں کہنا چاہیے "میں ہوں" اس لئے کہ اس سے پتہ نہیں چلتا کہ کون آیا ہے، تاکہ گھر والے کو اجازت دینے میں سہولت رہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مبہم جواب کو ناپسند فرمایا ہے۔ ایک دفعہ حضرت جابرؓ خدمت نبویؐ میں حاضر ہوئے، آپ نے اندر سے فرمایا، کون ہیں؟ حضرت جابرؓ نے کہا میں ہوں، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سن کر ناپسند فرمایا اور کہا یہ "انا۔ انا" (میں۔ میں) کیا۔[1]

اس طریقۂ استیذان کی بعد میں صحابہ کرام نے بھی تعلیم فرمائی، اور خود بھی برابر عمل کیا، اور دوسروں کو بھی عمل کرنے کی تاکید کی۔

محرم بھی اجازت حاصل کرے — یہ استیذان (اجازت چاہنا) اپنے لوگوں سے بھی چاہیے، یعنی اپنی ماں۔ بہن وغیرہ ہوں تو ان سے بھی اجازت لے کر اندر داخل ہونا چاہیے، بلکہ بڑی حد تک ضروری ہے، استیذان والی آیت کے شانِ نزول میں بیان کیا گیا ہے، کہ ایک انصاری عورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی، اور شکوہ سنج ہوئی کہ کبھی میں اس حال میں ہوتی ہوں کہ میں پسند نہیں کرتی کہ کوئی مجھے دیکھے، خواہ باپ ہو، خواہ بیٹا، اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اسی حال میں ہوتی ہوں اور گھر والے آتے جاتے ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، لا تدخلوا بیوتاً الخ

---

[1] مشکوٰۃ باب الاستیذان عن البخاری والمسلم

حدیث میں متعدد واقعات اس طرح کے آئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ محرم بھی اندر آئیں تو اجازت لے کر آئیں، اس لئے کہ معلوم نہیں گھر میں عورتیں کس حال میں ہوں، عموماً جانبین میں کوئی نہیں پسند کرتا کہ عورتوں کو ایسی حالت میں دیکھے، کہ وہ آزادانہ بیٹھی ہوں، جو عورتوں میں خاص نشست ہوتی ہے، اپنا تو خیال ہے کہ گھر میں صرف بیوی ہو، تو بھی خبر دے کر داخل ہونا چاہئے، کیوں کہ طبعاً آدمی اپنی بیوی کو بھی بے ستری میں دیکھنا پسند نہیں کرتا، اور نہ عورت ہی اسے گوارا کرتی۔

ماں سے بھی طلب اذن ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، کہ اپنی ماں سے بھی اجازت طلب کروں، آپ نے فرمایا ہاں، استیذان ماں سے بھی ہے، اس نے کہا کہ میں تو ان کے ساتھ گھر میں ہوتا ہوں، مقصد کہنے کا یہ تھا کہ ان کو مجھ سے پردہ نہیں ہے، پھر طلب اذن کی کیا ضرورت ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان سے بھی اجازت لے لیا کرو۔ اس شخص نے کہا میں ان کی خدمت کرتا ہوں یعنی اس وجہ سے برابر آنا جانا ہوتا ہے، پھر کیا ضرورت ہے دشواری بڑھ جائے گی، آنحضرت صلعم نے سمجھا کر فرمایا، اپنی ماں کی خدمت میں بھی حاضر ہونا ہے تب بھی اجازت حاصل کر لیا کرو۔ کیا تم ماں کو ننگی دیکھنا پسند کرو گے، اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا تو پھر اسی وجہ سے کہتا ہوں کہ اجازت حاصل کر کے جاؤ۔[1]

سلف صالحین کا طریقہ حضرت زینب کہتی ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جب کسی ضرورت سے اندر آتے تو پہلے دروازہ پر آکر رک جاتے، کھانستے، تھوکتے اور اس کے بعد اندر آتے، دفعۃً بغیر اطلاع آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ زینب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجہ محترمہ ہیں[2]۔

حضرت ابو عبیدہؓ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ جب گھر آتے تو اجازت طلب کرتے، دروازہ پر آکر زور سے آواز دیتے[3]

حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ آدمی جب اپنے گھر میں داخل ہونے لگے، تو دروازہ پر آکر زور سے کھانسے، یا زور سے اپنا جوتا ٹپکے۔ جس سے اندر خبر ہو جائے کہ مرد آرہا ہے[4]،

استیذان میں پہلے سلام جو رکھا گیا ہے، اس کا مقصد یہی ہے کہ پہلا گھر والے سن لیں، دوسرے سلام

---

[1] مشکوٰۃ باب الاستیذان عن الموطا مالک مرسلاً و احکام القرآن لابن العربی ج ۳ ص ۹۸ [2] ابن کثیر ج ۳ ص ۲۸ [3] ایضاً ج ۳ ص ۲۸۱ [4] ایضاً

کی آواز پر سنبھل جائیں، اور تیسرے کی آواز پر اجازت دیں یا روک دیں۔

ابن العربیؒ لکھتے ہیں کہ غیر کے گھر میں اذن حاصل کرنا ضروری ہے، اور اپنا گھر ہو تو طلب اذن واجب نہیں ہے، مگر گھر میں اگر ماں بہن وغیرہ بھی رہتی ہو، تو جانے کے لئے کھانسے، اس کے بعد اندر داخل ہو، اور دروازہ پر پہنچ کر پیر ٹھکے، جس سے اندر عورتوں کو آنے کی خبر ہو جائے، کیونکہ کبھی ماں بہن بھی ایسی حالت میں ہوتی ہیں، کہ جس حالت میں دیکھنا ہم پسند نہیں کرتے۔[1]

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ماں بہن کی خدمت میں حاضر ہونا تو بھی اجازت لے لی جائے۔

حضرت ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ سے پوچھنے والوں نے بار بار پوچھا کہ اپنی ماں بہن جس گھر میں رہتی ہو اس میں بھی جائے تو اجازت لی جائے گی؟ آپ نے ہمیشہ فرمایا ہاں اجازت لی جائے گی، تکرار کرنے پر سمجھایا کہ کوئی بھی اپنی ماں بہن کو بے پردہ دیکھنا پسند نہیں کرتا، پھر تم کو خواہ مخواہ اصرار کیوں ہے۔[2]

عفت کا اسلام میں لحاظ | یہ جو کچھ عرض کیا گیا۔ ان میں غور کیا جائے اور دیکھا جائے، کہ اسلام نے اپنے قوانین میں دوسری حکمتوں اور مصلحتوں کے ساتھ ساتھ عفت و عصمت کا بھی کتنا عمدہ تحفظ کیا ہے، اور ان تمام بنیادی باتوں میں عفت و عصمت کا کس اہمیت کے ساتھ لحاظ کیا ہے،

موجودہ دور میں غفلت | مگر افسوس یہ ہے کہ یہ سارے طریقے اور آداب جو اسلام نے گھر میں داخلہ کے لئے مقرر کئے ہیں جن کو قرآن پاک نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے، حدیثوں میں جس کی تاکید آئی ہے، خود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے برتا، صحابہ کرام کو تعلیم فرمائی، اور پھر صحابہ کرام نے جن پر زندگی بھر عمل کیا، یہ احکام آج مسلمانوں میں متروک ہیں مسلمان گھرانوں میں ان پر عمل نہیں کیا جاتا، ضرورت ہے کہ ان آداب و احکام کو عمل سے بھی زندگی بخشی جائے۔

حق یہ ہے کہ عفت و عصمت کے تحفظ کا جو سامان قوانین الٰہی میں ہے، اور کہیں نہیں مل سکتا ہے، اس سلسلہ میں اہتمام کا یہ حال ہے، کہ بالغین اور مراہق کا حکم بیان کرنے کے بعد قرآن نے ان کا حکم بھی بیان کیا ہے جو غیر مراہق اور بچے ہیں، اور وہ سوچ سمجھ کی صلاحیت رکھتے ہیں، غیر محارم کے متعلق معلوم ہو چکا کہ ان سے مکمل پردہ کیا جائے گا، صرف ضرورت کے وقت چہرہ اور کفین کے کھولنے کا حکم ہے مگر یہ بھی اس وقت جب فتنہ کا اندیشہ نہ ہو،

---

[1] احکام القرآن لابن العربی ج ۲ ص ۹۰ [2] ایضاً

محارم کا حکم بھی بیان ہو چکا کہ ان سے بھی تمام اعضا وجوبی طور پر چھپائے جائیں گے، صرف ان جگہوں کے سوا جو عام طور پر کھولے جاتے ہیں یا کھلتے رہتے ہیں جیسے چہرہ، ہتھیلیاں، بازو، سر اور پنڈلی وغیرہ، مگر مطلب یہ نہیں ہے کہ خواہ مخواہ ان اعضاء کو کھولے، غلام عورت کے لئے غیر محرم کے حکم میں ہے، اس سے مکمل پردہ ضروری ہے، کافر لونڈی کا حکم بھی محرم کا سا ہے۔

خاص اوقات میں سب کے لئے استیذان

یہاں یہ بتانا ہے کہ چھوٹے نابالغ لڑکے اور لونڈیاں جو محرم کے حکم میں ہیں خاص وقتوں میں ان کو بھی پرہیز کا حکم دیا گیا ہے، اگر ان مخصوص وقتوں میں یہ نابالغ لڑکے اور لونڈیاں آنا چاہیں تو یہ سب بھی اجازت حاصل کریں، کہ یہ وقت عموماً بے پردگی کے ہیں، اور آدمی کے کھل کر رہنے سہنے کے ہیں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنكُمُ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ مِّن قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُم مِّنَ الظَّهِيرَةِ وَمِن بَعْدِ صَلَاةِ الْعِشَاءِ ثَلَاثُ عَوْرَاتٍ لَّكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ طَوَّافُونَ عَلَيْكُم بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (نور ۵۸)

اے ایمان والو، تم سے اجازت لیکر آئیں لونڈی اور غلام اور تم میں کے وہ جو بلوغ کو نہیں پہونچے ہیں، تین وقتوں میں، فجر کی نماز سے پہلے اور جس وقت تم دوپہر میں اپنے کپڑے اتار رکھتے ہو اور عشاء کی نماز بعد، یہ تین وقت تمہارے لئے بدن کھلنے کے ہیں، ان وقتوں کے بعد نہ تم پر تنگی ہے اور نہ ان پر، (کیونکہ) تمہارے بعض بعض کے پاس آتے ہی جاتے رہتے ہیں، اللہ یونہی کھولتا ہے باتوں کو تمہارے لئے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے

اس آیت میں تین مخصوص وقتوں کا ذکر ہے، ایک نماز فجر سے پہلے، جو آدمی کے لئے خوشگوار وقت ہے اور سو کر بیدار ہونے کا وقت ہے، رات کی بے خبری میں عموماً اس وقت ستر کھلے رہ جاتے ہیں، گہری نیند کی وجہ سے ستر پوشی کا زیادہ اہتمام نہیں ہوتا، دوسرا وقت دوپہر کا بیان کیا گیا ہے، جس وقت آدمی دن کا کھانا کھا کر قیلولہ کرتا ہے اور تھوڑی دیر کھل کر آرام کرتا ہے، گرمی کے زمانہ میں عام طور پر لوگ، اس وقت بے خبر اپنے کمروں میں سوتے ہیں اور بعض

عادی لوگ گرمی سردی دونوں زمانہ میں دوپہر میں سوتے ہیں، اس لئے کھلی بات ہے کہ نیند اور غفلت میں بے خبری کا غالب قرینہ ہے، تیسرا وقت نماز عشا بعد، یہ بھی آرام کا وقت ہے، آدمی دن بھر کا تکان لئے بستر پر گرتا ہے، اور یہ سمجھ کر کہ سب آرام کر رہے ہیں بہت بے پرواہ لیٹتا اور سوتا ہے، مزید یہ کہ ان تینوں وقتوں میں کم و بیش شادی شدہ اپنی رفیقہ حیات سے دل بستگی کرتا ہے، بوس و کنار کی نوبت آتی ہے، اس لئے حق ہے کہ بچے اور لونڈیاں بھی اطلاع دے کر اندر داخل ہوں، بغیر اجازت گھس جانے کی ہمت ہرگز نہ کریں، کیونکہ اگر موقع شرم و حیا کا ہوا، تو آدمی شرم سے گڑ جاتا ہے اور دلی رنج و تکلیف محسوس کرتا ہے، لونڈی اور خادمہ چونکہ بالغ ہوتی ہے اس لئے وہ خود بھی بعض موقع پر شرمندہ ہوئے بغیر نہ رہے گی، ان کے علاوہ وقتوں میں چونکہ یہ کیفیتیں عموماً نہیں ہوتیں اس لئے کوئی خاص پابندی نہیں ہے، پھر بچوں کا روکنا بھی مشکل ہے کہ وہ آنے جانے کے عادی ہوتے ہیں، یہی حال لونڈی اور خادمہ کا ہے کہ وہ کام کاج کے لئے آمد و رفت پر مجبور ہے، ان کو کہاں تک ہر وقت روکا جائے گا۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ پہلی آیتوں میں جو استیذان کا حکم آیا ہے وہ اجنبی اور غیروں کے لئے ہے اور اس آیت میں استیذان کا حکم قرابت داروں کے لئے ہے، یعنی ان لوگوں کے لئے ہے جو محارم میں داخل ہیں، بعض علماء لکھتے ہیں کہ پہلی آیت میں استیذان کا عام حکم تھا اور عام لوگوں کے لئے تھا، اور تمام وقتوں کے لئے تھا اور اس آیت میں خاص لوگوں کو طلب اذن کا حکم ہے اور خاص وقتوں میں ہے، اور صحیح یہی ہے۔

اس آیت میں ملکت سے مراد صرف لونڈی ہے، کیونکہ عبد (غلام) غیر محرم میں داخل ہے یہ مردوں میں آئیں گے مگر عورتوں کے سامنے جانے کی ان کو اجازت نہیں ہے۔

پردہ کے خاص وقتوں میں ان پر بھی پابندی عاید کر دی گئی ہے، جن کے آنے جانے میں کوئی مضائقہ نہیں، یہ احتیاطی تدبیر اختیار کی گئی ہے، اور عقلاً بہت مناسب ہے، حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کا تفسیری ترجمہ لکھتے ہیں۔

"اے ایمان والو تمہارے پاس آنے کے لئے تمہارے مملوکوں کو اور تم میں جو حد بلوغ کو نہیں پہنچے ان کو تین وقت میں اجازت لینا چاہئے ایک تو نماز صبح سے پہلے، اور دوسرے جب سونے لیٹنے کے لئے دوپہر کو اپنے بعض کپڑے اتار دیا کرتے ہو، اور تیسرے نماز عشا کے بعد، یہ تین وقت تمہارے پردے کے وقت ہیں، یعنی یہ اوقات چونکہ

عادتہً اور غالباً تخلیہ اور استراحت کے ہیں، ان میں اکثر آدمی بے تکلفی سے رہتے ہیں، اس لئے اپنے مملوکین اور نابالغ بچوں کو سمجھادو کہ بے اطلاع اور بلا اجازت لئے ہوئے تمہارے پاس نہ آیا کریں، ... کہ وجوب استیذان کی علت اس میں پائی جاتی ہے، اور ان اوقات کے سوا نہ تو بلا اجازت آنے دینے میں او منع نہ کرنے میں تم پر کوئی الزام ہے، اور نہ بلا اجازت چلے آنے میں ان پر کچھ الزام ہے، کیونکہ وہ بکثرت تمہارے پاس آتے جاتے رہتے ہیں، کوئی کسی کے پاس اور کوئی کسی کے پاس، مطلب اس کا موافق مذہب حنفیہ کے یہ ہے کہ غلام تو تمہارے پاس آتے جاتے رہتے ہیں، نہ کہ عورتوں کے پاس، کیونکہ غلام کا حکم غیر محرم مرد کا سا ہے، اور لونڈیاں عورتوں کے پاس بھی، اور اسی طرح نابالغ بچے سب جگہ آتے ہیں، پس ہر وقت اجازت لینے میں دقت ہے، اور چونکہ یہ وقت پردہ کے نہیں ہیں، اس لئے ان میں اعضا مستورہ کو چھپائے رکھنا کچھ مشکل نہیں، پس مرد تو غلام کے سامنے ناف سے زانو تک چھپائے رکھے، اور عورت، کافر لونڈی سے بجز مواقع زینت کے ... سب چھپائے رکھے اور مرد کو لونڈی سے اگر وہ اس کے لئے حلال ہے، کسی بدن کا چھپانا ضرور نہیں، اور اگر حرام ہے تو ناف سے زانو تک چھپائے رکھے، اور عورت مسلمان لونڈی سے صرف ناف سے زانو تک چھپائے رکھے، سو اس استتار میں کوئی دشواری نہیں، لہٰذا بے اذن آنا جائز ہوا اور نابالغ بچہ کے روبرو مرد صرف زانو سے ناف تک اور عورت باستثنار مواقع زینت کے سب چھپائے رکھے، یہ بھی دشوار نہیں، اور ہر وقت اجازت لینے میں تنگی ہے، کیونکہ اس کی آمد و رفت بھی بہت ہے، ... اور ان تین وقتوں کے ماسوا بھی اگر کوئی عارض مانع ہو، تو بھی استیذان واجب ہوگا، پس تخصیص باعتبار اُس وقت کی عادت کے ہے، اسی طرح جیسا کہ یہ حکم صاف صاف بیان کر دیا اللہ تعالیٰ تم سے اپنے احکام صاف صاف بیان کرتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے، پس سب مصالح اور حکمتوں پر اس کی نظر ہے اور احکام میں ان کی رعایت فرماتا ہے۔"[1]

نابالغ بعد بلوغ اجازت لیں

ان نابالغ بچوں پر بھی بعد بلوغ اسلام نے عام وقتوں میں استیذان کی پابندی عاید کی ہے جن پر بلوغ یا قریب البلوغ سے پہلے صرف مخصوص ہی وقتوں میں تھی، ہندوستان میں جو یہ رواج ہوگیا ہے کہ بچپن سے چونکہ آتا رہا ہے، بلوغ کے بعد بھی ان کو اندر آنے کی اجازت رہتی ہے اور عورتیں بلوغ کے بعد بھی ان سے پردہ نہیں کرتیں بالکل غلط اور شریعت کے خلاف ہے، پردہ دار گھرانوں میں یہ رسم بھی غلط طور پر رائج ہے، حالانکہ

---

[1] بیان القرآن ص ۳۲ و ص ۳۳ جلد ۸

اسلام نے شدت کے ساتھ اس کی روک تھام کی ہے، اور صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ بچے جب بالغ ہو جائیں، تو ان کو بھی اجازت لینی ہو گی، بلوغ سے پہلی والی آزادی باقی نہیں رہے گی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (نور ۸)

اور جب تم میں کے لڑکے بلوغ کی حد کو پہنچیں تو ان کو ایسی ہی اجازت لینی چاہئے جیسے تمہارے اگلے لیتے رہے، اللہ یوں کھول کر تم کو اپنی باتیں سناتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

یعنی اب تک ان بچوں کو تین ہی مخصوص وقتوں میں طلب اذن کا حکم تھا مگر اب جب بالغ ہو چکے تو اب کسی وقت بھی بغیر اجازت اندر نہ جائیں، جس طرح دوسروں کو استیذان کا حکم ہے، ان کے لئے بھی استیذان ضروری ہے، کیونکہ پہلے عدم بلوغ کی وجہ سے پردہ کی باتوں کا ان کو علم نہ تھا، نہ خود ان کے لئے اپنے اندر نہ کوئی کشش تھی اور نہ غیر کے لئے ان کے اندر کوئی کشش تھی۔ مگر اب ان کی حالت بدل چکی ہے، اب احساس پیدا ہو چکا ہے خود یہ اپنے اندر ایک انقلاب محسوس کرتے ہیں، اور دل جذبات سے معمور پاتے ہیں اور دوسروں کو بھی ان کی طرف کشش ہو سکتی ہے، اس لئے قدرتاً حکم بدلنا بھی ضروری ہے، مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کا تفسیری ترجمہ لکھتے ہیں۔

"اور جس وقت تم میں سے یعنی احرار میں کے وہ لڑکے جن کا اوپر حکم آیا ہے، حد بلوغ کو پہنچیں یعنی بالغ یا قریب بہ بلوغ ہو جائیں، تو ان کو بھی اسی طرح اجازت لینا چاہئے، جیسا ان کے اگلے یعنی ان سے بڑی عمر کے لوگ اجازت لیتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ تم سے اپنے احکام صاف صاف بیان کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے، اس لئے اس کو مکرر لایا گیا کہ قانون استیذان کی مصلحتیں نہایت واضح اور اس کے احکام نہایت قابل عنایت ہیں، تکریر سے اہتمام ظاہر ہو گیا۔"[1]

ماظہر کی تفسیر اوپر بیان کیا گیا ہے، کہ عورتوں کا تمام بدن ستر ہے اور اس کا چھپانا ضروری ہے سوائے چہرہ اور کفین (ہتھیلیوں) کے، جس کی طرف قرآن پاک نے اِلَّا مَا ظَهَرَ سے اشارہ کیا ہے، ہو سکتا ہے کہ کسی کو یہاں اِلَّا مَا ظَهَرَ کے مفہوم کے سمجھنے میں غلط فہمی ہو، اور وہ اپنے احوال کے مطابق یہ سمجھیں کہ ان کا ہمیشہ کھلا رکھنا

---

[1] بیان القرآن جلد ہشتم ص ۳۳

جائز ہے، اس لئے یہاں آکر اللہ تعالیٰ نے مَاظَهَرَ کے مفہوم کو صاف فرمادیا اور مَاظَهَرَ سے غلط فہمی کا معجزانہ انداز میں ازالہ کردیا، کہ چہرہ اور کفین جو مَاظَهَرَ میں داخل ہے بالذات تو ستر نہیں ہے، مگر یہ بھی مطلب نہیں ہے خواہ مخواہ کھلا رکھیں، بلکہ وہ بھی ضرورت کے علاوہ وقتوں میں اجنبی سے واجب الستر ہیں تاکہ فتنہ و فساد کی آگ مشتعل نہ ہو سکے، ہاں بوڑھی عورتیں جو اپنی عمر کی انتہا کو پہونچ چکی ہیں، وہ ان اعضاء (مَاظَهَرَ) کو کھلا رکھ سکتی ہیں، گو بہتر چھپانا ہی ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ اللَّاتِي لَا يَرْجُونَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ أَنْ يَضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِينَةٍ وَأَنْ يَسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَهُنَّ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (نور - ۸)

اور تمہاری عورتوں میں سے جو گھروں میں بیٹھ رہی ہیں، جن کو نکاح کی کوئی توقع نہیں، ان کو کپڑے اتارنے میں گناہ نہیں مگر اس طرح کہ اپنا سنگار دکھاتی نہ پھریں اور اس سے بھی بچیں تو ان کے لئے بہتر ہے، اور اللہ سب باتیں سنتا جانتا ہے۔

یہاں بوڑھی سن ایاس کو پہنچی ہوئی عورتیں ہیں ان کو حکم ہے کہ مواقع زینت نہیں کھولیں، اسی سے جانا جاسکتا ہے، کہ جوان عورتوں کو مَاظَهَرَ کے خواہ مخواہ کھلے رکھنے کی اجازت کیوں کر مل سکتی ہے، مولانا تھانوی فرماتے ہیں۔

"ایک یہ بات جاننا چاہئے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ وجہ اور کفین کو وجوب استتار سے مستثنیٰ کیا ہے، ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ بالذات ستر نہیں، نہ یہ کہ عورتیں کھلی مہار اپنی صورت غیر مردوں کو دکھاتی پھریں، کیونکہ فتنہ کے احتمال سے بالغیرہ بھی واجب الستر ہے، البتہ جہاں احتمال فتنہ کا نہ ہو مثلاً جو بڑی بوڑھی عورتیں ہیں، جن کو کسی کے نکاح میں آنے کی کچھ امید نہ رہی ہو، یعنی اصلاً محل رغبت نہیں رہیں، ۔ ۔ ۔ ۔ ان کو البتہ اس بات میں کوئی گناہ نہیں، کہ وہ اپنے زائد کپڑے، جس سے چہرہ وغیرہ چھپا رہتا ہے، غیر محرم کے روبرو اتار رکھیں، بشرطیکہ زینت کے مواقع کا اظہار نہ کریں، جن کا ظاہر کرنا، نامحرم کے روبرو بالکل ہی ناجائز ہے ۔ ۔ ۔ ۔ میں صرف وجہ اور کفین اور بقولے قدمین کا بھی اظہار جائز ہے، بخلاف جوان عورت کے، کہ وجہ

احتمالِ فتنہ کے اس کو چہرہ وغیرہ کا پردہ بھی ضروری ہے، مگر بعذر شرعی، اور ہر چند کہ عجائز کو کشف وجہ کی اجازت ہے لیکن اس سے بھی احتیاط رکھیں تو ان کے لئے اور زیادہ بہتر ہے"[1]

ابن العربی لکھتے ہیں۔

وانما خص القواعد بذالك دون غيرهن لانصراف النفوس منهن ولان يستعففن بالتستر الكامل خير لهن من فعل المباح لهن من وضع الثياب (احکام القرآن صفحہ ۱۱۴/۲)	اس میں بوڑھیوں کو مخصوص کیا اوروں کو چھوڑ دیا۔ اس وجہ سے کہ نفس ان بوڑھیوں کی طرف سے پھر اجاتے ہیں اور اگر یہ تستر کامل اختیار کریں تو بلاشبہ یہ اس فعل مباح سے بہتر ہے کہ کپڑا اتار دیں۔

باریک کپڑے کا استعمال　اوپر کی آیت کے "غیر متبرجات بزینۃ" کے جملہ سے یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ عورتیں اتنا باریک کپڑا استعمال نہیں کریں، جو ساتر نہ ہو، بلکہ اس سے حسن چھنتا ہو، ابن العربی لکھتے ہیں۔

ومن التبرج ان تلبس المرأة ثوبا رقيقا يصفها (احکام القرآن صفحہ ۱۱۴/۲)	تبرج میں سے یہ بھی ہے کہ عورت اتنا باریک کپڑا استعمال کرے جو جسم کی چغلی کرتا ہو۔

اسی سلسلہ میں انہوں نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

رب كاسيات عاريات مائلات مميلات لا يدخلن الجنة ولا يجدن ريحها (احکام القرآن صفحہ ۱۱۴/۲)	بہت سی پہننے والی عورتیں ننگی کے حکم میں ہیں جو خود مائل ہوتی ہیں یا دوسروں کو مائل کرتی ہیں لیکن ایسی عورتیں نہ جنت میں داخل ہوں گی نہ وہ اس کی بو پائیں گی۔

اس حدیث کو نقل فرما کر لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں کاسیات کے بعد عاریات اسی لئے فرمایا کہ وہ اتنا باریک کپڑا زیب تن کرتی ہیں، کہ وہ گویا ننگی ہے اور پھر فرماتے ہیں کہ اتنا باریک کپڑا پہننا جس سے ستر کامل نہ ہو حرام ہے"[2]

پہلے ہم یہ آیت نقل کر چکے ہیں

---

[1] بیان القرآن جلد ہشتم صفحہ ۳۳　[2] احکام القرآن لابن العربی صفحہ ۱۱۴/۲

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ

اور عورتیں اپنے گھروں میں قرار پکڑیں اور جاہلیت کی زیبائش کے ساتھ نہ پھریں۔

(احزاب-۴)

اُم علقمہ رض کہتی ہیں کہ حضرت حفصہ بنت عبدالرحمٰن حضرت عائشہ صدیقہ رض کی خدمت میں حاضر ہوئیں حضرت حفصہ رض باریک دوپٹہ ڈالے ہوئے تھیں، حضرت صدیقہ رض نے جب دیکھا تو ان سے دوپٹہ لے لیا اور اسے پھاڑ ڈالا، اور اس کے بدلہ ایک گاڑھے کپڑے کا دوپٹہ ان کو مرحمت فرمایا[1]، یہ حفصہ حضرت عائشہ صدیقہ رض کی بھتیجی تھیں،

ایک دوسرا واقعہ یہی حضرت عائشہ رض بیان کرتی ہیں کہ اسماء بنت ابی بکر (یعنی ان کی بہن) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں تشریف لائیں، یہ باریک کپڑا ڈالے ہوئے تھیں، ان سے اعراض فرماتے ہوئے ارشاد کیا،

یا اسماء ان المرأۃ اذا بلغت المحیض لن یصلح ان یری منھا الا ھذا وھذا اشار الی وجھہ وکفیہ (مشکوۃ کتاب اللباس)

اے اسماء! عورت جب بالغ ہو جاتی ہے تو اس کے چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا کا دیکھنا درست نہیں ہے،

مسلم شریف میں ایک حدیث آئی ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

خذ علیك ثوبك ولا تمشوا عراۃ (مشکوۃ باب النظر الی المخطوبہ)

اپنے اوپر کپڑا لازم کرو، ننگے مت پھرو۔

یہ اور اس طرح کی دوسری روایتیں بتاتی ہیں کہ عورت و مرد دونوں کو ایسا کپڑا استعمال کرنا چاہئے جو بدن کو ڈھانپ سکے، اور آدمی کا حسن و جمال عام طرح سے رسوا نہ ہو جس کا بڑا فائدہ یہ ہوگا پاکدامنی اور عفت بے داغ رہےگی اور حکماً یا حقیقتاً کوئی دھبہ دامن عصمت پر نہیں پڑ سکے گا،

---

[1] مشکوۃ کتاب اللباس ص۳۷۵

عورتوں کے پردہ سے متعلق جو کچھ اختصار سے عرض کیا گیا، آپ غور کریں گے ان میں بڑی حکمتیں اور مصلحتیں پائیں گے، اور اگر آپ کی نظر میں یورپ کا اخلاق اور بے پردہ لڑکیوں کے دن رات کے واقعات آئیں گے تو سمجھنے میں اور بھی سہولت رہے گی،

مسلمانوں کا عروج اور زوال

جدید اور مکمل ایڈیشن

اس کتاب میں اوّلاً خلافتِ راشدہ اس کے بعد مسلمانوں کی دوسری مختلف حکومتوں، ان کی سیاسی حکمت عملیوں اور مختلف دوروں میں مسلمانوں کے عام اجتماعی اور معاشرتی احوال وواقعات پر تبصرہ کرکے ان اسباب وعوامل کا تجزیہ کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے غیر معمولی عروج اور اس کے بعد ان کے حیرت انگیز انحطاط وزوال میں موثر ہوئے ہیں، طبع ثانی جس میں کتاب کے بہت سے حصّوں کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے جو ابواب پہلے ایڈیشن میں رہ گئے تھے ان کا اضافہ کیا گیا ہے اندلس جو مسلمانوں کے عروج وزوال کی عجیب وغریب اور غالباً سب سے زیادہ المناک اور پرحسرت یادگار ہے، پہلے ایڈیشن میں اسے بخوفِ طوالت چھیڑا ہی نہیں گیا تھا اس مرتبہ ہزار ہا صفحات کی ورق گردانی کے بعد زیادہ سے زیادہ مختصر اور جامع الفاظ میں اس داستانِ عبرت خیز کے وہ تمام ٹکڑے لے لئے گئے ہیں جن کا تعلق اس سرزمین پر مسلمانوں کے انتہائی عروج اور پھر لرزہ برانداز انحطاط وزوال سے ہے۔

درس عبرت نامکمل رہ جاتا اگر اسپین کے ذکر کے ساتھ خود اپنے وطن ہندوستان کی یاد تازہ نہ کی جاتی چنانچہ اس دفعہ یہ کمی بھی پوری کر دی گئی ہے اور اس ملک میں مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب کا کامیاب تجربہ کیا گیا ہے اور تاریخی بصیرت کے جواہر ریزے بکھیرے گئے ہیں۔ ان تفصیلی اضافوں کے بعد اس موضوع پر یہ کتاب بہت ہی نفیس اور بلند پایہ کتاب ہو گئی ہے بڑی تقطیع صفحات ۴۴۸ قیمت چار روپے مجلد پانچ روپے۔

مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ

از

حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

(سلسلہ کے لئے برہان بابت اکتوبر ۵۲ء دیکھیے۔)

بہرحال سیاسی مقاصد و اغراض کی راہوں میں مذہب اور دین کے نام سے ناجائز نفع اٹھانے والوں کی طرف سے نت نئی بازی گریاں اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جو کھیلی گئیں، یا باہر سے مختلف رجحانات کے جراثیم مسلمانوں میں وقتاً فوقتاً جو منتقل ہوتے رہے اس سلسلہ میں اختلافات کی جو صورتیں پیدا ہوئیں، رنگ رنگ کے بوقلموں شگوفے جو کھلے، ان کے تاریخی نمونے تو گذر چکے، عرض کر چکا ہوں کہ ہونے کو تو یہ سب کچھ ہوا، اور ان ہی کی بدولت "ملل و نحل" کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں اسلامی فرقوں کی فہرست کافی طویل و عریض نظر آتی ہے ستر بہتر ہی کیا، گننے کے لئے کوئی بیٹھے تو شاید ان کی تعداد سینکڑوں سے بھی تجاوز ہو جائے، اسی لئے بہتر تہتر فرقہ والی زبان زد عام روایت کا مطلب بعضوں کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی خاص عدد مراد نہیں ہے، بلکہ عربی زبان کے محاورے کی بنیاد پر یہ سمجھنا چاہئے کہ فرقوں کی زیادتی و کثرت کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، اس میں شک نہیں کہ پوری ہونے کی حد تک یہ پیشگوئی پوری ہوئی، اور کتابوں میں جن فرقوں کا، اور ان کی اعتقادی و عملی خصوصیتوں کا جو ذکر کیا گیا ہے، یہ فرضی واقعات نہیں ہیں۔

نہ سوچنے والے اسلامی فرقوں کی اس ضخیم و کبیر فہرست کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں حالانکہ کتابوں کے اوراق سے ہٹ کر چاہئے تھا کہ واقعہ کی جو صورت اب ہو گئی ہے، اس کا بھی جائزہ لیا جاتا، بتا چکا ہوں، اور جو چیز سامنے کی ہے اس کے لئے بتانے کی کیا ضرورت ہے، آخر مسلمان قوم یا امت اسلامیہ زمین کے اسی خاکی کرے کے باشندوں کا ایک گروہ ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ شیعوں کے سوا جو عدد اً بمشکل ہزار میں ایک کی نسبت عام مسلمانوں کے ساتھ

رکھتے ہیں، اس لئے خود شیعوں کی عام فقہی اور دینی کتابوں میں غیر شیعی مسلمانوں کی تعبیر ہی "العامہ" کے لفظ سے کی جاتی ہے۔

بس ان شیعوں کے سوا بتایا جائے کہ اہل السنت والجماعت، یا عوام جن کو سُنی مسلمان کہتے ہیں، اب مسلمانوں میں دنیا کے اس پردے پر صحیح معنوں میں دیکھئے تو سہی کہیں کسی فرقہ کا پتہ بھی ہے؟

سچی بات تو یہ ہے، کہ اسلام کے پیغبر علیہ الصلوٰت والتسلیمات کا کوئی دوسرا کارنامہ نہ بھی ہوتا تو یہی عجیب وغریب معجزانہ کامیابی کہ کسی خاص ملک، خاص قوم، خاص نسل، کے لوگوں میں نہیں، بلکہ عام بنی نوع انسانی میں ایک ایسی عظیم الشان، طویل الذیل برادری آپ کے طفیل میں قائم ہوگئی جس میں سامی نسل والے بھی شریک ہیں، اور وہ بھی جن میں آریوں کا خون ہے، تاتاری بھی ان میں ہیں اور منگول بھی، حبشی بھی ہیں اور سوڈانی بھی، ایشائی بھی ہیں اور افریقی بھی، بلکہ کافی تعداد یورپ کے باشندوں کی بھی ہے، اور امریکہ کی جدید دنیا بھی ان سے خالی نہیں ہے، الغرض ان میں گورے، کالے، گندمی، بادامی سب رنگ کے آدمی دینی یک رنگی کے رشتہ کو قائم کرکے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل گئے

لے کر دیا کردے جو قوم گنی جاتی ہو، اس میں چند ہزار خوارج یا جیسا کہ سننے میں آتا ہے کہ عراق کے کوہستانی علاقہ میں کچھ لوگ پائے جاتے ہیں، جو اپنے آپ کو یزیدی کہتے ہیں، سب سے بڑی امتیازی صفت ان کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ شیطان کی عبادت اس کی اپنی ذہنی زندگی کا اہم ترین فریضہ بنائے ہوئے ہیں، شیطان کی توہین ان کے لئے ناقابل برداشت بن جاتی ہے، یا کبھی کبھی یہ صورت بھی پیش آگئی ہے اگر رسالات و نبوات کا جو سلسلہ ختم ہوچکا ہے، کھلے کھلے صاف صاف لفظوں میں اس کا اعلان بھی کیا جا چکا ہے، دیکھا بھی جا رہا ہے کہ ہر بلندی کی طرف چڑھنے والوں کی پیداوار کی نہیں ہے۔ مگر انسانیت کے عروج وارتقار کے اس آخری نقطۂ ارتفاع کی طرف چڑھنا تو چڑھنا، شاید جھانکنے کی بھی ہمت دلوں میں باقی نہیں رہی ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ سارے مذہب والیان جن کے ماننے والے زمین پر پائے جاتے ہیں، وہی ہیں جن کی بنیاد ختم نبوت کے اعلان سے پہلے دنیا میں پڑ چکی تھی، اس اعلان کے بعد نبوت کے دعوی کی لو کسی میں ہمت ہی نہیں ہوتی اور کسی بدنصیب کے دل میں اس کی ہوک اٹھتی بھی ہے، تو قدرت اس کو پنپنے بھی نہیں دیتی۔ تاریخ کی شہادت ہے، صدیوں پر صدیاں گذرتی چلی جارہی ہیں، اب تو دوسرے ہزار سال کی بھی کئی صدیاں گذر چکی ہیں بتایا جائے کہ اس راہ میں کون کامیاب ہو؟ مسلمانوں میں بھی کوئی شبہ نہیں، بعضوں کے دماغ میں ادعار نبوت کا بھیجا ابھرتا ضرور رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سے توڑ کر اپنی امت بنانے کے لئے سادہ دلوں کی کوئی ٹولی بھی ان کو مل گئی ہے، لیکن ختم نبوت کی قدرتی سنگین مہر سے ٹکرانے کا جو انجام ہوسکتا تھا کیا اس کے سوا کبھی دوسرا انجام بھی ان کا ہوا ہے؛ اسی لئے وقتی حوادث سے زیادہ ان کو نہ اہمیت حاصل ہوئی؛ اور نہ اس سے زیادہ ان کو خیال کرنا چاہئے، بلکہ خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مرحومہ سے ٹوٹ کر جنہوں نے اپنا واسطہ کسی جدید نبوت، اور جدید وحی کے ذریعہ جنہوں نے قائم کرلیا، گویا رسول اللہ کی رسالت کی تصدیق براہ راست نہیں، بلکہ اپنے اس دوعائی نبوت کے مدعی کے واسطہ سے کرتے ہیں ان کو اسلامی فرقوں میں اس لئے شمار کرنا کہ اپنے آپ کو وہ مسلمان کہتے ہیں، خود سوچنا چاہئے کہ کہاں تک درست ہوسکتا ہے، نام ہی کا کچھ واقعہ کر دیا جائے گا تو نام کے لحاظ سے شیطان کے پوجنے والے یزیدی بھی تو اپنے آپ کو شاید مسلمان ہی کہتے ہیں، لیکن کافور نام رکھ دینے سے حبشی غلام کیا واقعہ میں کافور کی طرح سفید ہو جاتا ہے، آخر ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، حقائق و واقعات سے قطع نظر کرکے لفظوں اور ناموں پر اصرار، اصرار بے جا کو

عالمی اخوت اور برادری کا یہ دائرہ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

یہی سوچنے کی بات ہے، کہ دس بیس لاکھ کی تعداد میں نہیں بلکہ قریب قریب نصف ارب سے زیادہ تخمینہ اس انسانی برادری میں شریک ہونے والوں کا کیا جاتا ہے، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت دنیا میں قائم ہوئی ہے، کیسی عجیب بات ہے کہ بھانت بھانت کی نسلوں، زبانوں، رنگوں کے باوجود ان کی سب سے بڑی اکثریت میں مذہبی عقیدہ اور مذہبی طرز زندگی کے سوا کوئی دوسرا دینی رنگ نہیں پایا جاتا۔

صرف یہی نہیں، بلکہ دین میں ان سے جو مختلف ہیں، عرض کر چکا ہوں کہ ان ہی اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے ساتھ ان کے پیغمبر (صلوات ہو ان پر سلام ہو ان پر) اس انسانی برادری کا ایک ایسا رشتہ قائم کر دیا ہے کہ اہل کتاب جن جن بزرگوں کو اپنے دینی پیشواؤں اور مذہبی راہ نماؤں میں شمار کرتے ہیں، وہ نوح ہوں، یا ابراہیم، موسیٰ ہوں، یا عیسیٰ، داؤد ہوں یا سلیمان زکریا ہوں یا یحییٰ، (علیہم السلام) سب ہی پر ایمان لانا اسی طرح ضروری سمجھتے ہیں، اور اسی کو اپنا دینی عقیدہ یقین کرتے ہیں جیسے اپنے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ مانتے ہیں، اس برادری کا ہر فرد اپنے آپ کو اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے ان بزرگوں کا صحیح وارث اور سب ہی کا نام لیوا بنائے ہوئے ہیں ؎

در دل حق سرِ لکنو تیم ما وارث موسیٰ و ہارون نیم ما (اقبال)

ان کے خواص ہی کا نہیں بلکہ عوام کا بھی جزء ایمان یہی عقیدہ ہے، ذکر کر چکا ہوں کہ بات صرف باطنی احساسات تک محدود نہیں ہے، بلکہ اہل کتاب کے ساتھ رشتہ مناکحت کی اجازت بھی سارے آسمانی ادیان کی تصدیق و توثیق کرنے والی اس انسانی برادری کو دی گئی اور اس پر عمل کر کے دکھایا گیا۔

اور یہ رشتہ تو خیر گو نہ ایک دنیاوی تعلق کی شکل ہے، دین اور دین کا بھی سب سے اہم امتیازی عنصر عبادت پوجا پاٹ تک کی اجازت خود ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی عبادت گاہ بلکہ اس مسجد اقدس میں دی، جو کعبہ کے بعد مسلمانوں کے نزدیک دنیا کی مسجدوں اور عبادت گاہوں میں سب سے زیادہ احترام کی مستحق ہے، آخر کون نہیں جانتا کہ نجرانی عیسائیوں کا جو وفد دربار نبوت میں حاضر ہوا تھا صحیح روایتوں میں ہے کہ ان عیسائیوں نے مدینہ منورہ کی مسجد نبوی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے

صلوا صلاتھم زاد المعاد برزرقانی ص۳۰۲ اپنے طریقہ سے نماز پڑھی یعنی عبادت کی

لوگ سوچتے نہیں ورنہ رحمۃ للعالمین کی رحمت کا دامن تو اس سے بھی زیادہ فراخ اور وسیع تھا، ثقیف کے بت پرست مشرکین کا وفد

طائف سے جب مدینہ پہونچا، تو دیکھئے سیرت طیبہ کی عام کتابوں میں یہ واقعہ آپ کو مل جائے گا کہ

لما قدموا علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرب علیہم قبۃ فی ناحیۃ المسجد ج۳ ص۸ زرقانی	جب ثقیف والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو مسجد نبوی کے ایک گوشہ میں ان کے لئے خیمہ قائم کر دیا گیا (جس میں وہ ٹھرائے گئے)،

حالانکہ خیمہ قائم کرنے کے لئے مدینہ میں بھلا جگہ کی کوئی کمی تھی، لیکن مسلمان تو مسلمان، اہل کتاب تک طائف والے نہ تھے۔ لات نامی بت کے پوجاری تھے۔ اور وہ سب کچھ تھے۔ جو جاہلیت میں عرب کے عام باشندے ہو سکتے تھے۔ لیکن بایں ہمہ خیمہ ان کا مسجد نبوی کے ایک ناحیہ اور گوشہ میں قائم کیا گیا، لکھا ہے

حتی اسلموا۔ ایضاً	تا آنکہ پھر یہ لوگ بھی مسلمان ہو گئے۔

حق تو یہ ہے کہ بات کچھ مقابلہ سے سمجھ میں آتی ہے، یہی اپنا وطن ہندوستان ہے، اس میں "ذات پات" کی ہتھوڑیوں سے انسانیت توڑی گئی تا آنکہ ان گنت طبقات میں یہاں کی آبادی بٹ گئی، بٹ گئی؟ اور کس حد تک بٹی، کہ باوجود آدمی ہونے کے دوسرا آدمی ہی یہ سمجھتا ہے، اور اس سمجھ کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہے، کہ اس کے چھو جانے سے وہ ناپاک ہو جائے گا۔ کتے چھولیں، بلیاں، چھولیں. گھوڑے چھولیں، آدمی پھر بھی پاک ہی رہتا ہے، لیکن آدمی آدمی کو چھوے، چھونے والا اور جو چھوا گیا، دونوں ناپاک ہو گئے، چھونے سے ان کا کھانا ناپاک ہو جاتا ہے، پانی ناپاک ہو جاتا ہے، قیمتی سے قیمتی چیزیں اس احساس کے زیر اثر آئے دن برباد ہوتی رہتی ہیں، پھینک دی جاتی ہیں سمجھ لیا جاتا ہے کہ کوڑی کام کی باقی نہ رہیں۔ اس وہمی تاثر کے لئے نہ نسلوں کے اختلافات کی ضرورت ہے۔ نہ ملکوں کے اختلاف کی، نہ زبانوں کے اختلاف کی، نہ رنگوں کے اختلاف کی، حتیٰ کہ دینی اختلاف کی بھی ضرورت نہیں ایک ہی نسل، ایک ہی ملک، ایک ہی زبان کے بولنے والے، ایک ہی رنگ والے بلکہ دینی حیثیت سے جس نام سے چھونے والا پکارا جاتا ہے اسی دینی نام سے چھو جانے والا بھی موسوم ہوتا ہے الغرض چھونے والا بھی اپنا دھرم وہی بتاتا ہے جو دھرم چھو جانے والے کا ہے، بایں ہمہ "چھو جانے" کے قانون کے تحت اگر اس کا چھونا بھی داخل ہے تو ناپاک ہو جانے اور ناپاک کر دینے کے لئے باہمی مساس

یا چھوا چھوت ایک دوسرے کا کافی ہے۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں، دیکھ رہے ہیں، آگے پیچھے دائیں بائیں بھی تماشے ہمارے سامنے گذرتے رہتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ فقہ اسلامی کی ہر چھوٹی بڑی کتاب میں یہ پڑھکر گذرتے بھی رہتے ہیں کہ

سور الآدمی مطلقا ولو کافرا ... طاهر طهور بلا كراهة

آدمی کا جھوٹا پاک ہے، خواہ کسی قسم کا آدمی ہو، کوئی ہو، کافر و غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، بغیر کسی ناپسندیدگی کے اس کو (پاک سمجھنا چاہیئے)

اور کیا یہ پانی صرف خود پاک ہے؟ سنئے، مدرسوں میں پڑھایا جاتا ہے، کہ

ای مطهر مغیرہ من الاحداث والاخباث (شامی ص ۱۲۰ ج ۱)

(خود بھی وہ پانی پاک ہے، اور دوسروں کو بھی پاک کرتا ہے، ہر قسم کی ناپاکیوں، اور گندگیوں سے۔

مطلب جس کا یہ ہوا کہ اس پانی سے وضو، کر کے نماز پڑھنا، قرآن چھونا، سب کچھ درست ہے۔

ہم گذر جاتے ہیں اور کچھ اندازہ نہیں کرتے، کہ ٹوٹی ہوئی انسانیت کو اس کے آخری جوڑنے والے نے جوڑنے میں اپنی سرگرمیوں کو کہاں تک پہنچا دیا تھا۔ جھوٹا۔ ایسے آدمی کا جھوٹا، جو مسلمان نہیں ہے، اس کو مسلمان صرف کھا پی ہی نہیں سکتے ہیں، بلکہ ایسے جھوٹے پانی سے وضو، کر کے نماز پر بھی لاکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین نے آدم کے بچوں کو کھڑا کر دیا۔ صلوٰۃ ہو ان پر، سلام ہو، ان پر۔ اللہ اللہ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔

انسانیت کے اس سب سے بڑے بہی خواہ کا خیال آتا ہے، اور آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں، ان قدموں پر نہ لوٹیے تو آخر کس پر لوٹیے، جس نے خاک سے اٹھا کر آدم کی اولاد کو کاخ تک پہنچایا،

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

کا نعرہ لگاتے ہوئے مسلمانوں نے زمین کے مختلف حصوں کو آج جو نیا وطن بنا لیا، اور وطن بنا لینے میں کامیاب ہوئے۔ کیا چھوت چھات کی زنجیروں میں جکڑے ہونے کے بعد بھی اس میں وہ کامیاب ہو سکتے تھے،

تو میں ابھی سوچ ہی رہی ہیں، بچھڑے ہوئے باہم ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے کی تجویزیں ہی پاس کر رہے ہیں۔ آمادہ کیا جا رہا ہے، کہ ہر آدمی دوسرے آدمی کو آدمی ہی سمجھے، اپنا بھائی خیال کرے لیکن جو کچھ سوچا جا رہا ہے، وہ سب کچھ کیا جا چکا اور یقین مانئے کہ جو کچھ بھی آئندہ ہوگا، وہ "وحدت انسانی" اور "انسانیت کے احترام" کے اسی پیغام کی تعمیلی شکل ہوگی۔

خیر میں بہت دور نکلا چلا جا رہا ہوں، ورنہ بات کہنے کی آخر میں جو رہ گئی تھی، وہ صرف یہ تھی کہ مسلمانوں کے جس طبقہ کی تعبیر اہل السنت والجماعت یا سنی مسلمانوں سے میں کر رہا ہوں ان کے متعلق نہ جاننے والوں پر شاید میرا یہ دعویٰ گراں گذر رہا ہوگا کہ سنی مسلمانوں میں دینی اختلاف یعنی ایسا دینی اختلاف نہیں ہے، جس کی وجہ سے آپ کے دین کو سمجھا جائے کہ دوسرے کے دین سے جدا ہو گیا قرآنی تعبیر میں کہہ سکتے ہیں کہ

اَلَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا (انعام) جنہوں نے جدا جدا کر لیا اپنے دین کو اور بن گئے وہ ٹولیاں،

کا صحیح مصداق جن کے اختلافات کو ہم نہیں ٹھہرا سکتے۔ اور قرآنی حکم[1] کے مجرم نہیں ہیں۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا اور نہ ہو جانا ان لوگوں کی طرح جو جدا جدا ہو گئے اور اختلاف کیا

(آل عمران)

بلاشبہ میرا یہی دعویٰ ہے، گرانیوں کا ازالہ واقعات کے علم کے بعد خود بخود ہو جائے گا۔ اس داستان پر میرا یہ مختصر مقالہ ختم ہوگا۔ انشاء اللہ۔

کہنا یہ ہے کہ باوجود اس وحدت و یکسانیت جو انسانی افراد میں پائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے خواہ ہم پہچانتے ہوں یا نہ پہچانتے ہوں کسی آدمی کو دیکھ کر ہم یقین کر لیتے ہیں کہ وہ گھوڑا یا بیل نہیں بلکہ ہمارا ہم جنس انسان ہی ہے، وحدت کے ان عام پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ہم میں ہر فرد اپنے ابنائے جنس کے دوسرے افراد کے درمیان ممتاز ہو جاتا ہے اور یہ زید ہے، عمرو نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد خط و خال ہیئت و صورت، شکل و شمائل کے اختلافات ہی پر تو قائم ہے، ان اختلافات کی حد یہ ہے

---

[1] اس حدیث میں قابل غور یہی بات ہے کہ تفرق (جدا جدا ہو جانے کے بعد اختلاف سے ممانعت کی گئی ہے نہ کہ نفس اختلاف سے

کہ عموماً ہم میں دو آدمیوں کی آواز بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتی، آواز نہیں ملتی، چال نہیں ملتی، خط نہیں ملتا، خال نہیں ملتا، اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ کروروں میں بھی تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے نشانات ہر ایک کے اپنی خصوصیتوں کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں، حکومتیں اپنے فیصلوں میں "نشان ابہام" کے ان ہی فطری امتیازات پر اعتماد کرتی ہیں۔

اور جو حال باہر کا ہے، یہی بلکہ شائد اس سے زیادہ نازک نوعیت ہماری فطرت اور طبیعت کے اندرونی رجحانات و میلانات کی ہے، بالکل ممکن ہے کہ مذاق و مزاج میں دو آدمیوں میں اتحاد ہو، اتنا اتحاد ہو کہ ۹۹ فیصدی اشتراکی نقاط اس باب میں دونوں کے متحد ہوں، لیکن یقین کیجئے، کہ آخر میں کوئی نقطہ دونوں میں اختلاف کا بھی ہوگا۔ تجربہ یہی بتاتا ہے۔ یعنی پھل کو دیکھ کر درخت کے پہچاننے کا جو طریقہ ہے۔ اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے، اور درخت سے جو پھل کو پہچانتے ہیں، وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ کائنات کے خالق نے گلاب کی ایک پنکھڑی بھی ایسی نہیں بنائی، جو بعینہ دوسری پنکھڑی جیسی ہو، "تجلیات میں تکرار نہیں ہے" یہی صوفیوں کا بھی مکاشفہ ہے، اور

لوح جہاں پر ہر حرف مکرر نہیں ہوں میں

ہمارے فلسفی شاعر کا فیصلہ بھی یہی ہے۔

پس یہ خیال کہ سارے انسانی افراد میں ایسی وحدت اور یگانگی پیدا ہو سکتی ہے، کہ ظاہراً و باطناً کسی قسم کا اختلاف ان میں باقی نہ رہے۔ یہ قدرت سے، قدرت کے قانون سے جنگ کا ارادہ ہوگا لیکن ان ہی غیر ارادی، قدرتی اختلافات کے اندر، ارادی اتحاد کے رشتہ کو قائم کرنا "وحدت انسانی" کے نظریہ کا امکانی نصب العین اگر ہو سکتا ہے تو صرف یہی ہو سکتا ہے۔

اب آئیے اور دیکھئے کہ نصف ارب سے زیادہ تعداد والی برادری مسلمانوں میں جو اہل السنت والجماعت کے نام سے پائی جاتی ہے، ان سنی مسلمانوں میں، اس میں شک نہیں، کہ بعض علاقوں کے مسلمان حنفی کہلاتے ہیں، اور بعض کے شافعی، ان میں کچھ مالکی کے نام سے موسوم ہیں، اور ان ہی میں بعضوں کو حنبلی بھی کہتے ہیں، بلاشبہ سنی مسلمانوں میں ان چار ناموں کے مسلمان باقی رہ گئے ہیں، اور یہ بھی

صحیح ہے، کہ صرف نام ہی کا یہ اختلاف نہیں ہے بلکہ ان چاروں طبقات کے دینی کاموں میں بھی اختلافات پائے جاتے ہیں، اور کافی اختلافات، لیکن سوال یہ ہے کہ ان اختلافات کی بنیاد پر سنی مسلمانوں کے ایک گروہ نے اپنے دین کو کیا دوسرے گروہ کے دین سے کبھی کسی زمانہ میں ایک لمحہ کے لئے بھی جدا کیا یا جدا سمجھا ہے؟

خود ان بزرگوں کے باہمی تعلقات، اور ان کے احترامی حسن سلوک سے جو ناواقف ہیں جو نہیں جانتے کہ امام شافعی امام مالک کے تلمیذ رشید تھے۔ یا احمد بن حنبل امام شافعی کی رکاب تھام کر بغداد کے بازاروں میں گھومتے تھے۔ امام شافعی نے ابو حنیفہ کے شاگرد امام محمد بن حسن الشیبانی سے کتنا سیکھا اور کیا کیا سیکھا، امام ابو حنیفہ کے مرقد انور پر پہونچ کر امام شافعی نے کیا کیا تھا ان ناواقفوں کو کم ازکم اس کا تو اندازہ کرنا چاہیئے، کہ حنفی مسلمان جب امام شافعی کا ذکر کرتا ہے، تو امام ہی کے لفظ سے ان کا ذکر کرتا ہے، امام مالک کا نام امام کے لفظ بغیر لے نہیں سکتا، امام احمد حنبل کی داستان صبر و ابتلاء کو سن کر حنفی مسلمان بھی اس قدر آب دیدہ ہو جاتا ہے۔ جتنا متاثر خود کوئی حنبلی مسلمان ہو سکتا ہے؛ اور یہی کون نہیں جانتا کہ تمام حنفی مسلمانوں کے نزدیک خدا رسیدہ بزرگوں میں احترام کا جو مقام ایک حنبلی بزرگ کو حاصل ہے، یعنی غوث اعظم، قطب الاقطاب حضرت شیخ عبد القادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ وہ حنبلی تھے، یا حجۃ الاسلام غزالی، فخر الاسلام رازی باوجود شافعی المذہب ہونے کے حنفیوں کے بھی، مالکیوں کے بھی، حجۃ الاسلام اور فخر الاسلام ہیں۔ جلال الدین رومی حنفی ہونے کے باوجود سارے اسلامی طبقات میں مقبول ہیں، مجدد الف ثانی کو ہندوستان میں تو صرف حنفی مسلمان دین کا مجدد تسلیم کرتے ہیں، لیکن ہندوستان سے باہر نکل کر عراق میں، شام میں عرب میں لاکھوں، لاکھ کی تعداد میں شوافع مالکیہ حنابلہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے ماننے والے آپ کو مل جائیں گے۔

سچ پوچھئے تو دینی اختلافات کا یہی رنگ مسلمانوں میں ایسا ہے، جسے نہ سیاسی عوامل و مؤثرات کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے، اور نہ باہر سے درآمد شدہ جراثیم سے اس کا تعلق ہے بلکہ صحیح معنوں میں اندرونی اسباب ہی پر اس کی بنیاد قائم ہے،

کچھ روایات اور زیادہ تر اسلامی کلیات کے تفصیلی نتائج، اور استنباطی مسائل کے اختلافات سے یہ صورت حال پیدا ہوئی ہے۔

الکتاب یعنی قرآنی مطالبات الصلوٰۃ الزکوٰۃ الصوم والحج وغیرہ وغیرہ کی تعمیلی شکلوں کو کر کے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دکھایا تھا، ان کی روایت کرنے والے بزرگوں کے علم و فہم کے اختلاف سے روایتوں میں تھوڑا بہت اختلاف پیدا ہوا ابتدا، اسلام میں ان روایتوں کو جن لوگوں نے منقح کرنا چاہا، اور اس کے ساتھ اسلامی کلیات سے جو نتائج حسبِ ضرورت نکلتے رہے، ان میں نتیجہ نکالنے والوں کے علم و فہم کے اختلافات سے بھی اختلاف کی ناگزیر صورتیں جو پیش آئیں۔ کلیۃً اندر کی ان ہی دو باتوں پر بہر حال اس اختلاف کی بنیاد قائم ہے۔

یوں تو اس راہ میں کام کرنے والوں کی کافی تعداد اسلام کی ابتدائی صدیوں میں پائی جاتی تھی لیکن گھٹ گھٹا کر سمٹ سمٹا کر چار بزرگوں کے خدمات کو مختلف اسباب و وجوہ سے غیر معمولی حسن قبول حاصل ہوا کتابوں میں ان کے تنقیح شدہ نتائج مدون ہوئے، امت میں ان ہی کتابوں کی اشاعت ہوئی: اور ان ہی کے اسماء گرامی کی طرف چاروں طریقوں میں سے ایک ایک طریقہ منسوب ہے۔ امام ابو حنیفہ کے مکتب خیال کے ماننے والے حنفی، محمد بن ادریس شافعی کے ماننے والے شافعی، امام مالک بن انس کے ماننے والے مالکی، احمد بن حنبل کے ماننے والے حنبلی کے نام سے موسوم ہوئے۔

یہ ہے خلاصہ سنی مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کے قصوں کا۔

اور یہ تو خیر عامیانہ اشارے ہیں، واقعات سے جو ناواقف ہیں، ان کو صرف چونکانا مقصود ہے، اپنے معلومات کا وہ خود جائزہ لیں، اور سمجھیں کہ ان بزرگوں کے ماننے والے مسلمانوں کے اختلافات کی واقعی نوعیت کیا ہے۔

لو یہ ہے، کہ "تعلیم و تعلم" اور وہ بھی دین کی تعلیم و تعلم، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر "دینی تربیت" کے سلسلہ میں پیری و مریدی کے تعلقات میں بھی مسلمانوں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ جس سے ہم دینی علوم کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یا دینی تربیت کے لئے مریدی کا رشتہ قائم کر رہے ہیں۔ وہ حنفی ہے یا شافعی،

مالکی ہے یا حنبلی، بس جس کے پاس دین کا علم پایا گیا- اور جس کی صحبت میں دیکھا گیا کہ لوگ دین دار بن جاتے ہیں، ان سے علم بھی مسلمان ہمیشہ حاصل کرتے رہے، اور دینی تربیت بھی ان سے پاتے رہے، اول سے آخر تک مسلمانوں کی یہی تاریخ رہی ہے۔

یہی کیا، جاننے والے جانتے ہیں کہ اندرونی اختلافات کے ان قصوں میں بسا اوقات یہ صورت بھی پیش آتی ہے کہ کسی امام کے نقطۂ نظر سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن دوسرے امام کے نزدیک نہیں ٹوٹتا، مثلاً بدن سے خون اگر نکلے، نکسیر پھوٹی پچھنا لگایا گیا۔ بایں ہمہ اول سے آخر تک ہر طبقہ کے مسلمان دوسرے طبقہ کے امام کے پیچھے نمازیں پڑھتے چلے آئے ہیں۔ ابن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں نقل کیا ہے کہ امام احمد بن حنبل جو قائل تھے کہ خون نکلنے سے وضو، ٹوٹ جاتا ہے، بغیر تازہ وضو، کے نمازی کی نماز درست نہ ہو گی۔ باوجود اس کے ان سے کسی نے پوچھا کہ ایسا آدمی جس کے بدن سے خون نکلا اور وضو، کئے بغیر نماز پڑھا رہا ہو تو ہم اس کے پیچھے کیا نماز پڑھ سکتے ہیں۔ غضب ناک ہو کر پوچھنے والے سے امام احمد نے فرمایا کہ

کیف لا اصلی خلف سعید بن المسیب — یعنی سعید بن المسیب کے پیچھے نماز کیسے نہ پڑھوں گا

مطلب آپ کا یہ تھا کہ خون نکلنے سے وضو، نہیں ٹوٹتا، یہی فتویٰ سعید بن المسیب کا تھا۔ ساری امت میں صحابہؓ کے بعد ان ہی کو بعضوں نے افضل التابعین قرار دیا ہے۔ پھر کیا ان کے پیچھے نماز درست نہ ہو گی حاصل یہ ہے کہ گو خود امام کی تحقیق یہی تھی کہ خون نکلنے سے وضو، ساقط ہو جاتا ہے، لیکن بایں ہمہ جو کہتے تھے کہ نہیں ٹوٹتا، ان کو بھی برسر غلطی نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ خیال یہی تھا کہ تحقیق سے وہ اس نتیجہ تک پہنچے ہوں گے۔ لیکن دین تو ہم سب کا ایک ہی ہے، اور یہی دستور مسلمانوں میں شروع سے چلا آ رہا تھا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اسی موقعہ پر یہ بھی لکھا ہے کہ

سارے صحابہ اور تابعین (صحابہ کے شاگرد و تربیت یافتہ حضرات) اور ان کے بعد بھی بزرگوں میں دیکھا جاتا ہے کہ کوئی بسم اللہ کو نماز میں پڑھتا ہے کوئی نہیں پڑھتا۔ کوئی فجر میں قنوت کی دعا پڑھتا ہے کوئی نہیں پڑھتا کوئی پچھنا لگانے اور نکسیر پھوٹنے سے وضو، کے ٹوٹ جانے کا قائل ہو کوئی نہیں"

اس قسم کے بیسیوں اختلافی مسائل کا ذکر کر کے لکھا ہے۔

مع هذا كان يصلي بعضهم خلف بعض ۔۔۔ باوجود اس کے ان میں ہر ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھا کرتا تھا۔

ان تاریخی شواہد کی تفصیل کے لئے چاہئے کہ میرا مقالہ "تدوین فقہ" کا مطالعہ کیا جائے۔ جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ خود امام مالک نے ایک سے زیادہ دفعہ عباسی حکومت کے خلفاء کو اس ارادہ سے روکا کہ ان ہی کے فقہی نتائج کا سارے مسلمانوں کو بزور حکومت پابند بنایا جائے۔ بلکہ اس کے مقابلہ میں آپ نے مطالبہ کیا کہ جس علاقہ کے مسلمانوں میں جن لوگوں کے فقہی نتائج پھیل چکے ہیں ان کو خواہ مخواہ ان سے ہٹایا نہ جائے کیونکہ وہ بھی دین ہی کی ایک شکل ہے، بلاوجہ لوگوں میں وحشت و نفرت کے جذبات کیوں ابھارے جائیں خلیفہ[1] راشد عمر بن عبدالعزیز نے بھی گشتی فرمان جاری کیا تھا کہ جس علاقہ میں لوگ جن ائمہ کے اقوال پر عمل کر رہے ہیں ان کو اسی حال پر چھوڑ دیا جائے۔ ان ہی عمر بن عبدالعزیز کے ایک فرمان کا ترجمہ یہ ہے۔

ان اختلافات کی وجہ سے دین میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی، پس دین کی راہ میں اس کو تمام قیمتی چیزوں میں بڑی غیر معمولی چیز سمجھتا ہوں، وہ بڑی ناپسندیدہ حالت ہوتی کہ اس قسم کے مسائل میں لوگ کسی ایک ہی پہلو پر سمٹ جاتے۔"

مشہور محدث و فقیہ سفیان ثوری تو ان لوگوں کو ٹوک دیا کرتے تھے۔ جو ائمہ اجتہاد کے ان فقہی اختلافات کو اختلافات کے نام سے موسوم کرتے اور ہدایت کیا کرتے کہ

بھائی! یوں کہا کرو، کہ علماء نے مسلمانوں کے لئے یہ گنجائش اور فراخی دین میں پیدا کی (میزان الکبریٰ شعرانی ص۲۱)

اور یہ خیال کچھ اگلے بزرگوں ہی کا نہ تھا۔ بارھویں صدی ہجری میں فتاویٰ کی آخری کتاب حنفی فقہ کی جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں، شامی ہے اس کتاب کے شروع میں بھی فقہی اختلافات کے متعلق یہی نقطۂ نظر اختیار کیا گیا ہے، کہ مشکلات میں مسلمانوں کے لئے ان ہی اختلافات کی بنیاد پر آسانی کی صورتیں

---

[1] مسند دارمی میں عمر بن عبدالعزیزؒ کے فرمان کا یہ فقرہ مل جائے گا۔ کہ یقضی کل قوم بما اجتمع علیہ فقهاؤهم. جن لوگوں نے پچھلے دنوں ہندوستان میں اس مشورے کی خلاف ورزی کر کے چھوٹی چھوٹی باتوں میں فتنے برپا کئے۔ ان کو چاہئے دارمی مطبوعہ ہند کے صفحہ میں اس قول کو پڑھیں۔

پیدا ہوتی ہیں۔ استدلال میں فتاویٰ تتار خانیہ سے جو ہندوستان میں تاتارخان تغلقیوں کے وزیر کے حکم سے مدون کیا گیا تھا۔

اس کی یہ عبارت نقل کی ہے کہ

فان اختلاف ائمۃ الھدیٰ	ائمہ ہدیٰ (یعنی اہل السنت کے ائمہ مجتہدین) کے
توسعۃ للناس ص۶۳	اختلافات سے درحقیقت لوگوں کے لئے گنجائش پیدا ہوتی ہے

حالانکہ پچھلے زمانہ کے فقہار سخت گیری اور تشدد میں عموماً بدنام ہیں۔ لیکن شامی تک میں جب فخر الائمہ صاحب معراج الدرایہ کے اس قول کو نقل کرکے سراہا ہے، کہ

فقہار کے مختلف اقوال میں سے کسی قول پر مسلمانوں کی آسانی کے لئے ضرورۃً فتویٰ دیا جائے، تو یہ اچھی بات ہوگی، ص۶۹ شامی ج۱

مطلب یہی ہے، کہ بظاہر وہ قول ضعیف اور مرجوح ہی کیوں نہ ہو، لیکن دشواری میں کوئی مسلمان اگر مبتلا ہو گیا ہو۔ تو ایسے مواقع پر ضعیف اور مرجوح اقوال کی پشت پناہی میں اس مصیبت زدہ کی امداد علماء کے لئے باعث ثواب ہوگا۔

بہرحال تفصیلات کے لئے مطولات اور بڑی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے، خصوصاً علامہ عبدالوہاب شعرانی کی کتاب میزان الکبریٰ کا مطالعہ ان لوگوں کے لئے مفید ہوگا، جو ان ہی فقہی اختلافات کا تذکرہ کرکرکے دین سے دلوں میں بیزاری پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ میرا مقالہ جو عثمانیہ یونیورسٹی کے ریسرچ جرنل یعنی مجلہ "تحقیقات علمیہ" میں شائع ہو چکا ہے، مل جائے تو اس کو بھی پڑھیئے، آپ کو پتہ چلے گا، کہ اس قسم کے اختلافات میں مسلمانوں کے ارباب تحقیق کا فیصلہ یہ ہے، کہ ان میں جو بھی اپنے اجتہاد اور کوشش کر جس نتیجہ تک پہنچا ہر نتیجہ درست اور صحیح ہے، شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے عقد الجید میں لکھا ہے کہ

امام ابوالحسن اشعری، قاضی ابوبکر باقلانی اور ان سے پہلے قاضی ابو یوسف اور محمد بن حسن ابن سریج اس خیال کو ظاہر کر چکے ہیں، یعنی ہر پہلوان اختلافی مسائل کا صحیح اور درست ہے"

شاہ صاحب نے آخر میں لکھا ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔

باقی آئندہ

حالات ہنروران

از

لیفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب

حالاتِ ہنروران درحقیقت ایک "مختصر مگر مفید واحد قلمی" نسخہ ہے جس سے ہند و پاکستان کی علمی دنیا کو اولین مرتبہ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی۔ ایم۔ اے۔ ڈی لٹ، نے روشناس کرایا سنہ ۱۹۳۲ء میں جب آپ انگلستان تھے تو مسٹر وکنس کے توسط سے یہ مخطوطہ انہیں مستعار ملا اور اس کی ایک نقل انہوں نے اپنے پاس رکھ لی جو بعد ازاں انہوں نے ایک مقدمے کے ساتھ سنہ ۱۹۳۶ء میں شائع کی۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی سے ہند و پاکستان کے ارباب علم و فن بخوبی واقف ہیں۔ آپ تاریخی تحقیقات میں ید طولا رکھتے ہیں۔ اور بعض بعض تحقیقات تو بڑی عرق ریزی سے آپ نے تکمیل تک پہنچائی ہیں۔ خود ایک نہایت اچھے خطاط ہیں اور ایک مشہور خطاطی و نقاشی خاندان سے متعلق ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ آپ نہایت مخلص علم دوست ہیں اور بڑی جستجو کے بعد قلم اٹھاتے ہیں آپ کی بیشتر تحریریں مختصر مگر پُراز معلومات ہوتی ہیں، چنانچہ آپ نے ایک بار انگلستان میں مسلمان مصورین کی قاموس لکھنے کے لئے تمام کتب خانے مخطوطوں کے لئے دیکھ مارے، خوش قسمتی سے آپ کو یہ واحد نسخہ دستیاب ہو گیا جس کو ایک مختصر سے مقدمے کے ساتھ آپ نے شائع کر دیا۔ یہ مخطوطہ مولانا دوست محمد کا لکھا ہوا ہے جو بہرام مرزا کی سرکار میں کتابدار تھے۔ ڈاکٹر صاحب مقدمہ میں رقمطراز ہیں "مجھے دیر سے تلاش تھی کہ کوئی ایسی تالیف دستیاب ہو جس کو خطاطوں مصوروں کا مستقل تذکرہ کہا جا سکے۔ یوں تو خطاطوں کے حالات میں بعض تحریریں ملتی ہیں مگر مصوروں کے سلسلے میں سوائے ایک ترکی تصنیف "مناقب ہنروران" مصنفہ عالی افندی متوفی سنہ [illegible]ھ اور سوائے مولانا دوست محمد کے دیباچہ مشمولہ مرقع بہرام مرزا کے کچھ نہیں ملتا۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخ اشہدی عالم آرائے عباسی، حبیب السیر، تحفہ سامی، لطائف نامہ فخری میں نقاشوں اور خطاطوں کا ذکر ملتا ہے۔

مجھے اس وقت علم خطاطی یا نقاشی سے بحث کرنا مقصود نہیں، یہ کام ماہرین فن کا ہے۔ یہاں صرف ایک سا نئے اور نایاب مخطوطے سے تعارف کروانا مقصود ہے جو اتفاقاً نامکمل حالت میں میرے ہاتھ گذشتہ سال طہران میں لگ گیا چونکہ بعض ایسے خطاطوں کا اس میں بھی ذکر ہے جنہیں حالات ہنروران کے مصنف نے بیان کیا ہے، اس لئے شائقین کے فائدہ کے لئے اس کے مفید اجزاء دہرادونگا۔ اور کچھ مختلف مفید امور جن کی طرف ڈاکٹر چغتائی صاحب نے اشارہ کیا ہے اس پر بھی روشنی پڑ جائے گی۔ ممکن ہے محققین اس مخطوط کی مکمل جلد تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور اس سے تاریخ خطاطی میں اضافہ ہو سکے۔

یہ مخطوط تاریخ کلام الملوک کا ایک جزو ہے۔ گذشتہ سال جب میں طہران میں تھا تو ایک انطیق فروش کی دکان پر دھاوا بولا۔ میری عادت تھی کہ دوپہر کے کھانے کے بعد میں انطیق فروشوں کی دوکانوں پر گردش کیا کرتا تھا، اس مرتبہ بڑا تعجب ہوا کہ خریدنے کے قابل مواد بہت الکم ایران میں رہ گیا ہے مجھے پہلی مرتبہ ۱۹۴۷ء میں بھی ادھر جانے کا اتفاق ہوا تھا لیکن تب حسب منشاء چیزیں زود و ارزاں دستیاب ہو جاتی تھیں۔ مگر گذشتہ سال تو حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بصد جستجو کام کی کوئی چیز بھی فراہم نہ ہو سکی اور اگر کبھی کبھار کچھ مل بھی گیا تو اس قدر گراں کہ خریدنے کی ہمت نہ پڑتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے گذشتہ جنگ عظیم کے موقعہ پر متفقین کے سربازوں نے انطیق کے خزانے ایران سے خرید کر کے یورپ اور امریکہ پہنچا دیئے ہیں!

خیر۔ ایک یہودی انطیق فروش کے ہاں ایک روز دھاوا جو بولا تو اس نے اپنی دکان کے بائیں میں ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں کچھ انبار پڑا تھا۔ میں داخل ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ نصف کمرہ جس میں روشنی کا کم گذر تھا، ردی سے بھرا پڑا ہے۔ کہیں ٹوٹے ہوئے چینی کے برتن ہیں اور کہیں بگڑی شکلوں والے تانبے کے آفتابے ہیں اور کہیں کاغذوں کا انبار لگا ہے، گرد اس قدر تھی کہ الاماں! میں نے ہمت کر کے اس انبار کو الٹ سیدھا کرنا شروع کیا۔ کوزہ گری کے وہ وہ نمونے دیکھے کہ آنکھیں چکا چوند ہو گئیں، مگر بہت شکستہ، جو کاغذ اٹھایا کسی کتاب کا ورق نکلا۔ کوئی مکمل مخطوط ہاتھ نہ آیا۔ اتنے میں ایک کونے سے جو کاغذوں کا بستہ اٹھایا تو اس میں چند قطعات قلمی برآمد ہوئے۔ میں نے انہیں علیحدہ کر لیا اور اس میں مزید تلاش

جاری رکھی۔ اتنے میں کچھ ورق نہایت خوشخط اور اچھی حالت میں برآمد ہوئے۔ دیکھا تو تاریخ کلام الملوک کے چند صفحے تھے۔ یہ بھی علیحدہ کر دئے۔ کمرے سے باہر نکلا تو کہنیوں تک کوٹ گرد آلود تھا! یہودی نے ایک نگاہ ان مخطوطات پر ڈالی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ قیمت بتا رہا ہے۔ خیر مناسب قیمت پر فیصلہ ہو گیا۔ اور میں یہ اوراق پریشان لے کر ہوٹل لوٹا۔ مکرر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ سودا برا نہیں رہا۔ اب اس کتاب کے متعلق کچھ سن لیجئے۔

تاریخ کلام الملوک بڑی ضخیم کتاب معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ اجزا جن کے کچھ اوراق میرے ہاتھ لگے یہ بھی اچھی خاصی کتاب ہوگی۔ میرے پاس صفحہ اول کے بعد جو کہ منقش ہے، چوتھا اور پانچواں صفحہ ہے اور اس کے بعد دیگر اوراق صفحہ (انشی) سے شروع ہو کر (اکانوے) تک ہیں اس کے بعد پھر صفحات گم ہیں .... اور صرف ایک ورق اس کے بعد اور ہے جو ۹۴ اور ۹۵ ہے! مخطوطہ نہایت خوشخط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے، کاغذ نہایت عمدہ اور سنہری حاشیہ ہر صفحے پر ہے۔ ہر صفحے پر آٹھ سطریں ہیں اور صفحے کی لمبائی چوڑائی آٹھ انچ چار انچ ہے (۴ × ۸)۔ مخطوطہ یوں شروع ہوتا ہے۔

"ایں یک رخیست از اجزائی تاریخ کلام الملوک در بیدا آمدن خط و احوال ارباب خط از تالیفات مخدوم امجد میرزا محمد یوسف لاہجی است کہ بعنوان مسودہ و تذکرہ خاطر تحریر رفتہ کہ بروزگار بماند۔"

ان اوراق سے کہیں بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کتاب کب لکھی گئی اور خطاط کون ہے۔ لیکن ان گنتی کے اوراق میں چند ایک خطاطوں کا ذکر ہے، جن کا ذکر ڈاکٹر عبداللہ چغتائی والے مخطوطے میں بھی ہے صرف ایک بات غور طلب ہے اور وہ یہ کہ میر علی تبریزی جس نے نستعلیق ایجاد کیا اس کے متعلق حالات ہنروران سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ امیر علی تبریزی اور میر علی تبریزی ایک ہی شخص تھے یا دو مختلف آدمی تھے چنانچہ ڈاکٹر چغتائی صاحب نے بھی اپنے انگریزی کے دیباچہ میں یہ شک ظاہر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "شاید" یہ دونوں نام ایک ہی شخص کے نام تھے۔ چنانچہ مخطوط حالات ہنروران کے صفحہ ۵ پر یہ نام اس طرح آیا ہے۔

"مخترع خط نستعلیق حضرت استادی و قبلہ الکتابی خواجہ ظہیر الدین میر علی تبریزی بودہ اند و انتساب این سلسلہ را از ایشاں تجاوز دادہ بدیگرے نمی تواں رسانید . . . ."

پھر اسی مخطوطہ کے صفحہ ۴۳ پر یوں لکھا ہے۔

"دیگر از شاگرداں ایشاں استاذ شمس الدین است کہ در عہد سلطان اویس تربیت یافت و در شاہ نامہ بقطع مربع کہ بخط امیر علی بود مواضع ساخت . . . ."

ڈاکٹر چغتائی صاحب نے اپنے انگریزی کے دیباچہ میں صفحہ سات پر یوں شک ظاہر کیا ہے

13.3 "AMIR ALI AND MIR ALI OF TABREZ (P. 15)

IS PERHAPS ONE AND THE SAME PERSON."

آئیے اب ہم ذرا اپنے اوراق پریشان میں اس شخصیت کے متعلق جستجو کریں کہ یہ دراصل کون تھے؟ صفحہ (ذشی) پر یہ عبارت شروع ہوتی ہے۔

"اوراق مجالس النفائس کہ از تالیفات ترکی امیر کبیر امیر علی شیر است و در خانہ امیر بیگ مرمر نوشتہ خط آں جناب است مشہور است ہنگامیکہ شاہی بیگ خان اوزبک ہرات را گرفت مولانا قطعہ نوشتہ بدیدن او رفت آں ترک جاہل قلم بدست گرفتہ مولانا را پیش طلبید و آں قطعہ را تعلیم می داد و اصلاح میکرد بالجملہ مولانا ہماں ایام بہ مشہد مقدس آمد . . . . سوائے میر علی کہ برابری با استاد مینماید پنج نفر دیگر مشہور آفاق انداز آں جملہ محمد ابریشمی و سلطان محمد نور و سلطان محمد خنداں و زین الدین محمود و میر علی جامی"

اس اقتباس سے تین شخصیتیں واضح ہو جاتی ہیں۔ ایک امیر علی شیر جسے امیر کبیر کہا گیا ہے۔ دوسری شخصیت میر علی کی ہے اور تیسری میر علی جامی ہیں! آئیے اب دیگر اوراق میں دیکھیں آیا ان تین شخصیتوں پر کچھ اور روشنی پڑتی ہے؟

اس مخطوطہ کے صفحہ ۴۸ پر میر علی کا حال یوں لکھا ہے۔

"میر علی از سادات حسینی دار السلطنت ہرات است در خط اسلوب و قاعدہ جدید بنا نہادہ و از ہمکناں کوی مسابقت در بود جناب میر در کمال حسن و صباحت و قابلیت بودہ"

اس کے علینی بعد سرخی کے ساتھ جامی لکھا ہے تحریر یوں چلتی ہے۔

"جامی از جملہ عشاق است، در اوائل حال خدمت مولانا زین الدین محمود مشق میکرد و پس ازاں در مشہد مقدس خدمت سلطان علی رسید مشق و تعلیم گرفت و در آنجا نشو و نما یافت جلی و خفی و قطعہ نویسی را بدرجہ اعلیٰ رسانید و خط را بر طاق بلند نہاد کہ دست ہیچ خطاط بآں نمیرسد از جملہ یادگار او در ایں زمان ایں اشعار است کہ بقلم جلی نوشتہ .....؟

سلام علی آل طٰہٰ و یٰسین
سلام علی آل خیر النامین

ایں ہفت شعر است در آخر اسم خود را چنین رقم کردہ است ... خادم آل علی میر علی الحسینی ...."

مندرجہ بالا اقتباسوں سے ایک اشتباہ تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ ناموں کی تفصیل کے تحت دو مختلف سرخیاں کیوں دیدی گئیں؟ یعنی اول میر علی کی سرخی اور دویم جامی کی سرخی! اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو مختلف شخصیتیں تھیں۔ مگر اقتباس آخری کے خاتمہ پر جامی اپنے کو خادم آل علی میر علی الحسینی لکھتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں شخصیتیں ایک ہی تھیں۔ اور جامی کی سرخی کاتب نے غلطی سے دیدی ہے اس کی ضرورت نہ تھی جب ذکر ایک ہی شخص کا ہو رہا ہے۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ مندرجہ بالا اقتباسات سے جن شخصیتوں کا ذکر ملتا ہے یعنی امیر کبیر امیر علی شیر، میر علی، میر علی جامی اور میر علی الحسینی، یہ سب ایک ہی شخص کا ذکر ہے۔

پیشتر کہ ہم کوئی قطعی فیصلہ کر سکیں آئیے ذرا کچھ اور ان اوراق کی ورق گردانی کریں۔

صفحہ ۸۸ پر بھی یہ عبارت ملتی ہے۔

"چوں عبید خاں اوزبک در ایام دارائے شاہ زادہ بام مرزا ای و للکی شاملو ہرات را گرفت میر علی را ہمراہ سایر اعیان انجا در شہور ۹۳۵ھ بہ بخارا فرستاد جناب میر مدتی در آنجا در کتاب خانہ عبد العزیز خاں پسر عبید خاں بکتابت اشتغال داشت ..... عاقبت در سنہ ۹۴۰ھ در آنجا رحلت نمود۔"

مندرجہ بالا اقتباس میں تاریخ وفات سنہ ۹۴۰ھ دی گئی ہے، ڈاکٹر محمد اللہ چغتائی والے مخطوطے میں تاریخ وفات کہیں بھی درج نہیں۔ البتہ میری نگاہ سے اتفاقاً ایک اور مقام پہان کی ایک تاریخ قطعہ گذری

ے ــــــــ یہ خط کشیدہ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے لیکن نقل کردیے گئے۔

ہے پروفیسر محمد ضیاء الدین، جوکہ وشوابھارتی، شانتی نکیتن میں اسلامیات کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب اسلامی خطاطی میں صفحہ ۳۰ پر ایک سعدی کی گلستاں کے مخطوطہ کا عکس دیا ہے، جو میر علی کا لکھا ہوا ہے، یہ مخطوطہ ان کی تحقیق کے مطابق بخارا میں شاہ عبد العزیز بہادر کے لئے ۹۵۰ھ میں لکھا گیا تھا۔ اب مندرجہ بالا اقتباس سے ہمیں یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ عبید خاں اوزبک نے انہیں ۹۳۵ھ میں بخارا روانہ کر دیا تھا مگر ساتھ ہی ان کی رحلت کی تاریخ جو درج ہے تو وہ ۹۴۰ھ میں لکھی گئی اور اس سعدی کی گلستان والے مخطوطے سے اس تاریخ کا تطابق نہیں ہوتا، بلکہ معاملہ اور پیچیدہ ہو جاتا ہے۔

اب آخر میں ان اوراق پریشان کے آخری صفحے کی آخری تین سطریں اور پریشان کن ہیں۔ شیخ عبد اللہ کاتب کی سرخی دی گئی ہے اور مولف یوں رقمطراز ہے۔

"شیخ عبد اللہ کاتب از کتاب مقرر دار السلطنت ہرات است قریب چہل و پنج سال با امیر کبیر امیر علی شیر بودہ است!"

ان پیچیدگیوں کی موجودگی میں کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ اور پھر ستم یہ ہے حالات ہنروران میں جہاں امیر علی یا میر علی کا ذکر ہے انہیں تبریز سے منسوب کیا گیا ہے اور ہمارے والے مخطوطے میں ہرات سے! افسوس ہمارے یہ اجزا تاریخ کلام الملوک مکمل نہیں ورنہ چہ عجب کہ قطعی فیصلہ ہو گیا ہوتا۔ اس مختصر سے مقالے کو لکھنے کا مدعا بھی یہی ہے کہ اگر کہیں اس تاریخ کا اور نسخہ موجود ہو تو اُسے دیکھ کر یہ تحقیق مکمل کی جا سکتی ہے۔ اگر کسی صاحب کے پاس اس کا نسخہ نکل آئے تو از راہ کرم ڈاکٹر محمد عبد اللہ چغتائی سے خط و کتابت کر کے انہیں مرحمت فرمایا جائے۔ میں سمجھتا ہوں اس کام کے وہی اہل ہیں۔

اب ایک اور شخصیت کی طرف غور فرمایئے جس کا ذکر ان دونوں مخطوطوں میں ہے۔ یہاں بھی ناموں میں وہی تفاوت ہے، اور اصل نام کا پتہ نہیں چلتا۔ حالات ہنروران میں صفحہ ۷ پر یہ بیان ہے۔

"مولانا سلطان محمد خنداں ..... شاگرد حضرت مولانا سلطان علی اند دیگر فضائل آبی مرحومی مولانا محمد ابریشمی شاگرد مولانا سلطان علی ست و از جملہ استادان است"

بالا میں ایک اقتباس اجزاء تاریخ کلام الملوک سے گذر چکا ہے جس میں پانچ شخصوں کے نام

گنوائے ہیں جو یہ ہیں، محمد ابریشمی، سلطان محمد نور، سلطان محمد خنداں، زین الدین محمود۔ اور میر علی جامی اب ان میں سلطان علی کا ذکر کہیں بھی نہیں! اور حالات ہنروراں کا بالا اقتباس کہ رہا ہے کہ "محمد ابریشمی شاگرد مولانا سلطان علی است"

پانچ ناموں والا اقتباس جو اوپر گذر چکا ہے اگر اسے ایک بار پھر دیکھنے کی زحمت گوارا کرلیں تو معلوم ہوگا کہ یہ اقتباس میر علی جامی پر ختم ہوتا ہے۔ اس عبارت کے عین بعد تحریر یوں جاری رہتی ہے۔ اور میر علی جامی کے عین بعد محمد ابریشمی کا نام سرخی میں دیا گیا ہے۔

"و میر علی جامی۔ محمد ابریشمی کہ از شاگرداں او بودہ ایں ابیات را گفتہ و بر لوح مزار مولانا بخط خود نوشتہ" اس شعر کے بعد ایک حیران کن فقرہ ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

"ایں رباعی را کہ نیز از اشعار سلطان علی است محمد ابریشمی در حاشیہ آں لوح نوشتہ۔ رباعی

وعدم و الم بود عالم دون — زنہار در وجوی آرام و سکون
چوں اکثر جزو عالم آخر الم است — رفیتم ازیں الم دل غرقہ بخون

کتبہ محمد ابریشمی در آخر نوشتہ است مولانا سلطان علی شعر نیز میگفتہ"۔

غور فرمایئے کہ سلطان محمد نور اور سلطان محمد خنداں کا ذکر کرتے کرتے یہ سلطان علی کہاں سے نکل آیا؟ اب حالات ہنروراں کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو صفحہ ۷ پر لکھا ہے۔

"دیگر مولانا قاسم بسیار نازک و پسندیدہ نوشتہ شاگرد مولانا سلطان محمد نور است و بخدمت مولانا سلطان محمد خنداں نیز رسیدہ و تعلیم گرفتہ"۔

اس اقتباس سے تو یہ ظاہر ہے کہ سلطان محمد نور، سلطان محمد خنداں اور سلطان علی تین مختلف شخص تھے اوراق پریشان سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی لیکن احتمال ہے کہ اگر اس کتاب کے دیگر اجزاء دستیاب ہوجاتے تو وہاں بھی ان تینوں شخصیتوں کو ہم علیحدہ علیحدہ دیکھ پاتے۔

اس تحقیق کو لپیٹتے ہوئے یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میر علی کے مختلف ناموں سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ یہ مختلف اشخاص تھے۔ افسوس ہے کہ اجزاء تاریخ کلام الملوک ہمارے پاس

نامکمل شکل میں ہے اگر کچھ اور ورق دستیاب ہو گئے ہوتے تو امید ہو سکتی تھی کہ یہ بھی تحقیق پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتی۔ فی الحال اسے تشنہ ہی چھوڑنا پڑگیا۔ میر علی کی تاریخ وفات میں بھی جو تفاوت ہے وہ بھی افسوسناک ہے ہمارے تذکرہ نگار اکثر ان امور پر نظر تعمق نہیں رکھتے ورنہ ایسے معمولی مسائل پیدا ہی نہ ہوتے

التقریظ والانتقاد

جامع المجددین

از

(سعید احمد)

(۹)

اس صورت حال کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بنیادی طور پر اس کے اسباب حسب ذیل تھے۔

(۱) جہالت:

(۲) مسلمانوں کا سیاسی زوال

(۳) انگریزوں کی حکومت کا قیام

(۴) مغربی علوم وفنون اور ان کے ساتھ مغربی تہذیب وفکر جدید کا سیلاب عظیم!

جہالت اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سے ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی اور مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت کا جو نقشہ بن گیا تھا اس میں اگرچہ مذہب اور مذہبی روایات معدوم نہیں ہوئی تھیں۔ لیکن اندرونی اور بیرونی اثرات کے ماتحت جن میں خانقاہی تصوف اور فلاطونی اشراقیت کو بڑا دخل تھا مذہب کی اصل اسپرٹ بہت مضمحل ہوگئی تھی اور مذہب نام رہ گیا تھا چند بدعات و محدثات کا۔ چند رسومات اور عوائد کا، اس کی وجہ یہ تھی کہ دین کی اصل تعلیم کا فقدان تھا اور مسلمان عام طور پر جہالت میں مبتلا تھے اس بنا پر جو اصل دین تھا یعنی استقامت علی الحق، قرآن وحدیث کا صحیح اتباع مسلمان اس سے دور تھے اور جو چیزیں منافی اسلام یا خارج از اسلام تھیں مثلاً پیروں فقیروں کی نذر ونیاز عرس قوالی۔ وجد حال، شادی بیاہ، ولادت و وفات کے رسومات ان کو اسلام سمجھنے لگے تھے اس لئے پہلی ضرورت یہ تھی کہ مسلمانوں

کو اصل دین سے آگاہ کیا جاتا۔ اور انہوں نے حسن و قبح کا جو معیار خود قائم کر لیا تھا اس کو ان سے چھین کر ان کے ہاتھ میں ایک صحیح معیار دیا جاتا۔

مسلمانوں کا سیاسی زوال جب کسی قوم پر سیاسی زوال طاری ہوتا ہے تو یہ زوال و انحطاط اس کی سیاسی زندگی ہی تک محدود نہیں رہتا۔ بلکہ اس کے اثرات اس کے ذہن و قلب اور اُن کے اخلاقیات پر بھی پڑتے ہیں۔ بلند نظری کی جگہ پست ہمتی، خودداری اور بے نیازی کی جگہ دوسروں پر بھروسہ کرنے اور ان کے رحم و کرم کے متمنی رہنے کی اس میں خو پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی انفرادیت اور اپنے تشخص کو بھول کر یا اقتدار جماعت کی نقالی اور ان کی پیروی کو اپنے لئے باعث فخر سمجھنے لگتی ہے۔ چنانچہ النَّاسُ عَلٰی دِینِ مُلُوکِھِم اور کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَکُونَ کُفْرًا میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

انگریزوں کی حکومت کا قیام ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی زوال ہوا تو ایک ایسی قوم کے ذریعہ ہوا جو حکمرانی و انتظام مملکت کے اعتبار سے بے شبہ مسلمانوں سے کہیں زیادہ فائق تھی۔ اس کے پاس قوت عمل تھی، بیدار مغزی کا جوہر تھا۔ ایک منظم اور مربوط قانون تھا۔ دماغی اور جسمانی صلاحیتوں کے لحاظ سے بھی اُس وقت کے مسلمانوں سے من حیث القوم اعلیٰ اور متفوق تھی۔ اُس کے پاس جدید ایجادات و اختراعات کا ایک طلسم اور ان کے ذریعہ مادی زندگی کو خوشگوار و خوش نما بنانے کا ایک نسخۂ کیمیا تھا اس بنا پر مسلمانوں کا اس قوم سے مرعوب ہونا ضروری تھا۔

مغربی علوم و فنون مسلمانوں کی یہ مرعوبیت جو سیاست کے راستہ سے آئی تھی دین حق سے منحرف کرنے کے لئے یہ بھی کچھ کم نہ تھی کہ مغربی علوم و فنون کے سیلاب نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ سائنس اور اُس کے ایجادات و اختراعات نے انسان کا نقطۂ نظر روحانی کے بجائے مادی بنا دیا۔ اور اس کے علاوہ زندگی کو شور و غل اور ہنگاموں سے اس درجہ پر کر دیا کہ انسان کو مادی زندگی کی ضرورتوں سے ہٹ کر اپنی روحانی ضرورتوں پر غور کرنے اور ان کے متعلق کچھ سوچنے اور سمجھنے کی فرصت ہی نہیں رہی۔ پھر علم الحیات اور اس سلسلہ کی تحقیقات و انکشافات نے دنیا۔ اور اس کی پیدائش زندگی کے نشو و نما۔ اور اس کے آغاز و انجام کے متعلق جو مذہبی تصورات و معتقدات تھے اُن کی بنیادیں متزلزل کر دیں حضرت آدم کی

پیدائش ۔ ملائکہ اور شیطان کا حضرت حق سے مکالمہ ۔ زمین و آسمان کا حدوث ۔ یہ اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کی نسبت جو مذہبی روایات تھیں وہ ایک افسانہ نظر آنے لگیں ۔ علاوہ بریں مغربی فلسفہ نے خیر و شر، نیکی اور بدی اور ثواب و عذاب اور جنت اور دوزخ وغیرہ اخلاقیاتی اور مابعد الطبیعاتی مسائل کی نسبت مذہب کی جو تعلیمات اور تشریحات و توضیحات تھیں ان کو مشکوک و مشتبہ قرار دے دیا اور اسی طرح مسلمانوں کا فکر بدلا ۔ اس کے سوچنے اور کسی شے کے حسن و قبح کو پرکھنے کا معیار بدلا ۔ اور دل و دماغ کی اس تبدیلی نے اس کے عمل کی کائنات کو یکسر منقلب کر کے رکھ دیا جس طبقہ نے ان علوم و فنون کو حاصل کیا وہ تو اس سیلاب میں دست و پا شکستہ ہو کر اس طرح بہا کہ اس کو اپنے مذہب سے ۔ قومی روایات سے ۔ اپنی زبان سے قومی و ملی عوائد و رسمیہ سے ۔ اطوار معاشرت اور وضع قطع سے نفرت سی ہوگئی اور وہ بالکل ہی ایک دوسرے سانچے میں ڈھل گیا ۔ لیکن اس ذہنی انقلاب کے اثرات صرف اسی طبقہ تک محدود نہ تھے بلکہ وہ اس درجہ دور رس اور ہمہ گیر تھے کہ جو لوگ اپنی چہار دیواری میں ان علوم و فنون کے اثرات سے اپنے آپ کو بالکل محفوظ سمجھتے تھے اور جو مذہب کی روایات کے حامل یقین کئے جاتے تھے ان میں بھی یہ تبدیلی پیدا ہوگئی کہ منبر پر بیٹھ کر وہ نماز کی فرضیت اور اس کے فضائل پر تقریر کرتے تھے تو اس کے دلائل میں اہمیت اس بات کو ہوتی تھی کہ نماز سے ڈسپلن پیدا ہوتا ہے ورزش ہوتی ہے اور اوقات کی پابندی کی خو پیدا ہوتی ہے روزہ ان کے نزدیک اس لئے فرض تھا کہ اس سے غریبوں اور محتاجوں کی بھوک کا احساس ہو ۔ معدہ کی حالت درست ہو ۔ زکوٰۃ اس لئے ضروری تھی کہ سرمایہ کسی ایک جماعت اور گروہ میں محدود ہو کر نہ رہ جائے ۔ حج اس لئے فرض تھا کہ وہ مسلمانانِ عالم کی ایک سالانہ بین الاقوامی کانفرنس تھی مسلمان تباہ حال تھے تو ان کے نزدیک اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی اقتصادی اور معاشی حالت خراب تھی انگریزوں کا ہندوستان پر سب سے بڑا ظلم تھا تو وہ یہ کہ وہ اس ملک کے باشندے نہیں تھے ان کی قومیت ہندوستانی نہیں تھی انھوں نے یہاں کے معاشی اور اقتصادی ذرائع و وسائل پر جارحانہ قبضہ کر لیا تھا ۔ یہ سب باتیں جو کہی جاتی تھیں اپنی جگہ پر درست اور بجا تھیں لیکن انھیں

چیزوں پر زور دینا اور انھیں کو معیارِ حسن و قبح بنا کر پیش کرنا اوس غیر شعوری انقلاب ذہنی کی غمازی کر رہا تھا جو جدید علوم و فنون نے ہر طبقہ اور ہر جماعت میں کسی میں کم اور کسی میں زیادہ پیدا کر دیا تھا ورنہ قرآن و حدیث سے سروکار رکھنے والوں کے لئے کسی طرح زیبا نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ مشاہدۂ حق کی گفتگو بھی بادہ و ساغر کہے بغیر نہ کریں۔ ایک طرف یہ تھا ہی کہ جدید علوم و فنون کے ساتھ تہذیبِ نو کی ناظورۂ خوش جمال نے ایک اور جال بچھایا اور زندگی کے سادہ نقشے میں لذتیت ابیقوریت اور حظ طلبی کا رنگ بھر کر اسے بالکل مسحور و مسخر کر دیا اور اب اُس میں اس کی صلاحیت ہی نہ رہی کہ وہ روحانیت اور اخلاقِ حسنہ کی دنیا کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھے۔

غرض یہ ہے کہ یہ وہ اسباب تھے جن کے باعث اسلام اس ملک میں ایک روایت کہن ہو کر رہ گیا اور مسلمان مجموعی طور پر اس شعر کا مصداق ہو گئے کہ

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے ۔۔۔ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ان حالات میں اگر کوئی مجدد ہوتا تو اس کا فرض تھا کہ مسلمانوں کے دینی زوال کے تمام مذکورہ بالا اسباب کو سامنے رکھ کر ایک ایسا ہمہ گیر اور ہمہ جہتی پروگرام بنا کر چلتا جس کے کامیاب ہو جانے پر ان سب کا خاتمہ ہو جاتا یہ تو بہت مشکل تھا کہ تن تنہا ایک ہی شخص یہ تمام کام کرتا لیکن کم از کم ایک ایسا شخص تو ہونا چاہیے تھا جو ملتِ اسلامیہ کے زوال و انحطاط کے ان اسباب پر یکساں نظر رکھتا اور ان میں سے ہر ایک کی ضرورت اور اہمیت تسلیم کر کے ایک ایسی جماعت پیدا کرتا۔ جس کے افراد مختلف شعبوں میں کام کرتے مگر مقصد سب کا ایک ہی ہوتا اس دور کی شخصیتوں پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو صرف ایک مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ایسی ہمہ گیر اور جامع نظر آتی ہے جس میں تقویٰ و طہارت کے ساتھ علم و فضل بھی ہے تحریر و تقریر میں کمال کے ساتھ شمشیر زنی کا جوہر بھی ہے جس میں حالات کے تقاضوں کے صحیح ادراک و احساس کے ساتھ گرم جوشی اور ٹھنڈے دماغ کے ساتھ کام کرنے کی پوری صلاحیت بھی ہے۔ جو میدانِ وغا کا ایک بہادر سپاہی بھی ہے اور مسائلِ اسلام کا ایک بلیغ البیان متکلم بھی! جو فقیری و درویشی کے

ساتھ ساتھ دماغ سکندری رکھتا ہے۔ اور جو بوریہ پر بیٹھ کر حکومتوں کے شکست و ریخت کے نقشے بھی تیار کرتا ہے۔ جو بیک وقت صوفی بھی ہے فلسفی بھی منطقی بھی ہے اور متکلم بھی۔ غازی بھی ہے اور خطیب بھی۔ قاطع بدعات و رسومات بھی ہے اور ریاض شریعت بھی واعظ بھی ہے اور مناظر بھی، پاک طینت و پاک نہاد بھی ہے اور شر و باطل کی قوتوں سے ٹکرا جانے والا بھی۔ اس کا دماغ روشن ہے اور دل بیدار ... حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اس کا طریق فکر بھی بدلتا ہے اور وہ کسی محاذ پر بھی شکست خوردگی محسوس نہیں کرتا جب تک انگریزوں کی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی تو وہ اپنی ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ تلوار لے کر میدان جنگ میں کود پڑا اور گو فتح و شکست نصیبوں سے ہے لیکن ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ جنگ میں اس نے شمشیر زنی کے وہ کمالات دکھائے کہ اچھے اچھے ماہرین جنگ عش عش کر اٹھے۔ پھر جنگ میں شکست ہو گئی تو اس نے اپنی کوششوں کا رخ یک لخت بدل دیا اور وہ ایک مدرسہ لے کر بیٹھ گیا جہاں نئی نسل کی تعلیم و تربیت دین کی اصل تعلیمات کی روشنی میں ہو اور اس کے ذریعہ فرنگی تہذیب، تمدن اور فرنگی حکومت کی تیز و تند آندھیوں میں بھی اسلام کا چراغ بجھنے نہ پائے، اس طرح اگرچہ ظاہر میں مولانا کے کام کی نوعیت صرف ایک تعلیمی اور دینی کام کی تھی۔ لیکن درحقیقت وہ اس سے بے خبر نہ تھے کہ محض علماء پیدا کرنے سے اصل مسئلہ کا حل نہ ہو گا۔ بلکہ جب تک فرنگی حکومت کے جوئے سے مسلمانوں کو آزاد کر کے ان کی شکست خوردہ ذہنیت اور مرعوبیت کو دور نہ کیا جائے گا اسلام کو طبعی طور پر ابھرنے کا موقع نہیں ملے گا چنانچہ مولانا کی تحریروں اور تقریروں سے اور ان کے طور و طریق سے یہ بات صاف طور پر واضح ہوتی تھی کہ انھوں نے یہ مدرسہ ایک بہت وسیع اور ہمہ گیر پروگرام کے پیش نظر قائم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت اس مدرسہ کو ہمیشہ شک و شبہ کی نظر سے دیکھتی رہی۔ بارہا دشمنوں نے یہ خبر اڑائی کہ یہاں جہاد کی تعلیم دی جاتی ہے۔ پولیس نے تلاشیاں بھی لیں اور حکومت کی طرف سے در پردہ اور کھلے طور پر تحقیقات بھی ہوتی رہیں گویا یہ وہ مورچہ تھا جو مولانا نے ایک طرف اسباب زوال کے نمبر ایک جہالت۔ نمبر ۲ سیاسی زوال۔ اور نمبر ۳ انگریزوں کی حکومت کے خلاف تیار کیا تھا۔ اب رہ گیا چوتھا سبب یعنی مغربی علوم و فنون کا سیلاب عظیم تو اول تو یہ سیلاب مولانا کے زمانہ میں ایسا حشر آفریں نہ تھا پھر

جتنا کچھ بھی تھا مولانا اس کی اہمیت سے بے خبر نہ تھے مگر آپ کے پیش نظر بنیادی کام یہی تھا کہ مسلمان اپنی اندرونی تنظیم کے اعتبار سے پکے اور سچے مسلمان ہوں انگریزی تعلیم کا جو کام سرسید احمد خاں نے شروع کیا تھا مولانا نانوتوی کو اس کے اصل مقصد سے اختلاف نہیں تھا ورنہ ان جیسے روشن دماغ بزرگ کو ہو سکتا تھا۔ بلکہ اختلاف جو کچھ بھی تھا وہ سرسید کے مذہبی خیالات سے تھا اور ان کی انگریزوں سے اس مرعوبیت سے تھا جس کا اظہار سرسید کی تحریروں اور تقریروں سے ہوتا رہتا تھا۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے جامعہ ملیہ کی تاسیس اور علی گڈھ کے طلبار سے خطاب کرتے وقت جو تقریر کی ہے اس سے یہ بات بخوبی روشن ہو جاتی ہے۔

افسوس ہے کہ مولانا کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ کم سنی میں اس دنیا کو خیر آباد کہہ گئے لیکن آپ نے اپنے بعد جو جماعت چھوڑی اس نے مولانا کے مختلف کاموں کو اپنے افراد میں بانٹ لیا اس میں آپ کو علوم و فنون اسلامیہ کے ماہر و بحر ذخار بھی نظر آئیں گے اور بزم طریقت و سلوک کے صدر نشین بھی۔ ان میں مجاہد فی سبیل اللہ بھی دکھائی دیں گے اور خوش بیان مقرر و خطیب بھی۔ ان میں بین الاقوامی سیاسیات کے مبصر بھی ملیں گے اور عہد حاضر کی زبان میں مسائل اسلام پر گفتگو کرنے والے بھی۔ گویا ایک مجدد میں بیک وقت جو اوصاف ہونے چاہئیں تھے وہ سب تو کسی خاص ایک شخصیت میں جمع نہیں ہوئے۔ البتہ ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی جس کے افراد نے ان اوصاف کو تقسیم کر لیا اس بناء پر اس جماعت کی کوشش سے وہی اثرات مرتب ہوئے جو ایک مجدد کے اثر سے پیدا ہوتے چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں صدی کے ربع اول میں ہندوستان کے مسلمانوں میں نشاۃ ثانیہ کے جو اثرات ظاہر ہوئے ہیں ان حالات اور اس ماحول کے ساتھ ان کی نظیر مشکل سے ملے گی لیکن یہ واضح رہنا چاہیے کہ پھر بھی یہ تجدید کامل نہیں تھی بلکہ چند اسباب کی وجہ سے جن پر گفتگو کا یہ موقع نہیں ہے اور جن میں سب سے زیادہ اہم علمائے کرام کی انگریزی زبان اور مغربی علوم سے بے خبری ہے یہ تجدید ناقص تھی اور اسی کا آج یہ نتیجہ ہے کہ ہم اپنی ساٹھ ستر سال کی سچی عمارتوں کو متزلزل دیکھ رہے ہیں اور ان کا وجود اب خطروں میں گھرا ہوا نظر آرہا ہے۔ بہر

حال ناقص سہی تجدید ضرور ہوئی اور اس میں علماء یا غیر علماء کی کسی ایک جماعت کی تخصیص نہیں بلکہ ملک کے مختلف گوشوں میں علم و ادب ۔ سیاست و تعلیم ۔ شریعت و طریقت تصنیف و تالیف تحریر و تقریر ۔ تبلیغ و اشاعت اسلام وغیرہ مختلف محاذوں پر کام ہوئے اور ان سب کا نتیجہ مجموعی طور پر جو کچھ ہوا اس کو آپ تجدید کہہ سکتے ہیں ۔ البتہ اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک خالص دینی لائن پر تجدید کرنے کا تعلق ہے اس میں حصہ غالب اسی جماعت کا ہے جو مولانا نانوتوی سے انتساب رکھتی ہے جیساکہ ہم نے اس بحث کے شروع میں کہا تھا مولانا تھانوی بھی چونکہ اس جماعت کے ایک رکن ہیں اسی بناء پر بے شبہ تجدید میں ان کا بھی حصہ ہے اور اس سلسلہ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ تصوف جو مسلمانوں کے لئے ایک افیون کی انٹی بن گیا تھا اور جو عجمی اور غیر اسلامی اثرات کے ماتحت اسلامی تصوف سے جس کی حقیقت اسلام کی اصطلاح میں احسان ہے ایک مختلف چیز ہو گیا تھا مولانا نے اس پر عملِ جراحی کر کے اسے آلائش اور فاسد مادہ سے پاک و صاف کیا اور اس کی اصل شکل و صورت کو نکھار کر پیش کیا جس کے باعث تصوف کوئی ایسی چیز نہیں رہا جس کی ایک گولی یا پھنکی کھا لینے سے نیند سی آنے لگے اور قوائے عمل مضمحل ہو جائیں اس کے علاوہ مولانا کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ اسلام کی دو حیثیتیں ہیں ایک تعبدی ۔ اور دوسری نظام اجتماعی کی جدید سیاسی اور قومی تحریکات جو تحریک خلافت سے اٹھتی اور فنا ہوتی رہیں انھوں نے اسلام کے نظام اجتماعی ہونے کی حیثیت پر اتنا زور دیا کہ اس کی تعبدی حیثیت بہت مضمحل ہو گئی مولانا تھانوی نے اسلام کی تعبدی حیثیت کو مضمحل نہیں ہونے دیا بلکہ حق یہ ہے کہ انھوں نے اس پر اتنا زور دیا کہ یک گونہ توازن پیدا ہو گیا اس بنا پر مولانا شریک تجدید ہیں مگر خود مستقل بالذات مجدد نہیں کیونکہ ایک مجدد میں جو اوصاف و کمالات موجود ہونے چاہئیں اور جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے ان میں سے بعض اوصاف مولانا میں نہیں ہیں ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ مولانا میں جو بعض کمالات موجود تھے وہ دوسروں میں نہیں تھے ۔ اس بناء پر مستقل بالذات مجدد تو کوئی ایک بھی نہیں ہوا البتہ تجدید جماعتی ہوئی ہے

اب ہم اپنے تبصرہ کو اسی پر ختم کرتے ہیں آخر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس تبصرہ

کے شروع کے دو نمبروں میں مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت قلم سے بعض نامناسب اور نازیبا الفاظ نکل گئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ مولانا کے علم وفضل۔ تقویٰ وطہارت اور دوسرے کمالات کے ساتھ عقیدت شروع سے رہی ہے۔ چنانچہ مولانا کی وفات پر اسی برہان میں جو نظرات لکھے گئے تھے وہ اس کا ثبوت ہیں تاہم مولانا کی تشدد پسندی اور درشت مزاجی کی جو روایات برابر سننے میں آتی رہتی تھیں ان کا اثر یہ ہوا کہ قیامِ دیوبند کے زمانہ میں بارہا جی چاہنے کے باوجود مولانا کی خدمت میں حاضری کی جرأت کبھی نہیں ہوئی۔ جامع المجددین میں اسی طرح کے واقعات نظر سے گذرے تو یہ اثر اور قوی ہوگیا۔ چنانچہ تبصرہ کے نمبر اول ودوم میں طبیعت کا یہ اثر نمایاں ہے مگر پھر اسی زمانہ میں اشرف السوانح از اول تا آخر پڑھنے کا اتفاق ہوا تو وہ اثر یکایک غائب ہوگیا اور یہ محسوس ہوا کہ قصور مولانا کا نہیں بلکہ مولانا عبدالباری جیسے مولانا کے مریدوں کا ہے جنہوں نے مجدد ثابت کرنے کے شوق میں مولانا کے ان واقعات کو کچھ سے کچھ رنگ دے کر پیش کیا ہے۔ بہر حال اگرچہ غلط فہمی کی بنا پر ہی سہی میں مولانا کی روح پر فتوح سے ان الفاظ کی معذرت چاہتا ہوں اور ان پر نادم ہوں۔

ورق ورق

از

(ظ، انصاری صاحب)

مولوی یہ جمعیۃ العلما چھاپ کے مولوی،

یہ "درس نظامی" حفظ کئے ہوئے مولوی،

جنہوں نے سات دریا، سات پہاڑ اور سات ملکوں تک جغرافیہ پڑھا ہے۔

اور ستر ہزار حور و غلماں کی جمع تقسیم تک حساب سیکھا ہے۔

اور خلافت عباسیہ تک تاریخ عالم یاد کی ہے۔

یہ نرے مولوی۔

جنہوں نے قائد اعظم کے صیغۂ نکاح اور رسم ختنہ تک ریسرچ کی ہے۔

میرے دوستو،

تم انہیں تحقیر سے نہ دیکھو۔

میں انہیں فرقہ پرستی اور ڈھل مل یقینی کے طوفان میں چٹان کی طرح ثابت قدم پا چکا ہوں۔

ان کے عمل میں "صراط مستقیم" کی سی سیدھ رہ چکی ہے۔

اور "حبل المتین" کی سی استقامت۔

یہ ان موقع پرست اور دغا باز ماہرین سیاست سے ہزار درجہ لائق احترام ہیں۔

جن کی قانون دانی اور سیاست فہمی۔

ان کے گلے میں رسیاں ڈالے ہوئے سامراج کی آغوش میں لے گئی۔

جنہوں نے پیشہ ور وکیلوں کی طرح خطابت کے زور سے۔
جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کر دکھایا۔
جنہوں نے تاریخ دانی اور ریسرچ کی قوت سے۔
تہذیبوں کو تہذیبوں کے خلاف صف آرا کر دیا۔
اور پودوں کو ان کی جڑوں سے اکھاڑ دیا۔

او کھدر میں ڈھکے ہوئے مہاجن۔
تو مولوی کو کس منہ سے طعنہ دے گا؟
جب تو سودیشی کی تحریک میں ملکیاں لگائے اپنے ملوں کی کھیتی سیراب کر رہا تھا۔
اس وقت یہی مولوی۔
اپنے بھوکے بچوں سے دامن چھڑا کر
سامراجی آقا کا گریباں پکڑنے جا رہا تھا۔
او انگریز کے اصطبل میں پلے ہوئے "خچر"
تو مولوی کو کس زبان سے فرقہ پرست کہتا ہے۔
جب تو اپنے آقاؤں کے اشارے پر
بھائی کو بھائی سے لڑواتا تھا۔
اس وقت یہی مولوی جامع مسجد کے منبر سے گاندھی جی کی تقریریں کراتا تھا۔

اے زہر کو اچار بنا کر بیچنے والے بیوپاریو
تم مولوی کی وطن دوستی کا کیا کھاتا لکھتے ہو۔
شرم سے ڈوب مرو بدبختو،

جب تم دیش بھگتی کے خون سے فاشست ذہنیت کی جڑوں کو کھاد دے رہے تھے۔
اس وقت یہی مولوی تھا۔
جو اپنے اعزاز و وقار کی جڑوں پر،
(دیش بھگتی کے صلے میں) ہم مذہب فاشستوں کا کلہاڑا چلتے دیکھ رہا تھا۔

اے میرے اشتراکی بھائیو،
مولوی کو تحقیر سے نہ دیکھو۔
جب ہم پاکستان کے مطالبہ میں "حق خود اختیاری" کا جواز دیکھ رہے تھے۔
تو یہی مولوی تھا
جو "حق خود اختیاری" اور پاکستان میں فرق تلاش کر رہا تھا۔
جو پوچھتا تھا
"ہم پاکستان تو مان لیں مگر یہ کیسے ملے گا عام مسلمانوں کو یا خان بہادروں کو؟"
بھائیو! یہ ہندوستان کا مولوی۔
بخارا اور شور بازار کا مولوی نہیں ہے۔
ہندوستان کا مولوی
قومی آزادی کی جنگ میں اپنا جان و مال دے چکا ہے
اس کے کاندھوں پر جنگ آزادی کی روایات کا بار ہے۔
اس کے جسم میں جمال الدین افغانی کے لہو کی حرارت ہے۔
وہ حرارت جس سے چنگاریاں جنم پاتی ہیں۔
محرم کی آج پہلی تاریخ ہے۔
اب دس دن تک امام حسینؓ کی یاد تازہ کی جائے گی۔

بعض وہ لوگ بھی اس میں شریک ہوں گے جو حسینؑ کو امام نہیں مانتے۔
وہ بھی شریک ہوں گے جو اسلام کو سچا مذہب نہیں سمجھتے۔
وہ بھی شریک ہوں گے جو ان عقائد کو مانتے ہیں جنہیں اسلام توڑنے آیا۔
اور بعض ایسے لوگ بھی جن کی زندگی حسینؑ کے مشن کی مخالفت پر بسر ہوتی ہے۔
حسینؑ ان خوش نصیب شہیدوں میں ہیں کہ ان کی یاد تیرہ سو سات برس سے منائی جا رہی ہے۔
میں سوچتا ہوں کہ اس کا راز کیا ہے۔

حسینؑ کی شہادت اسلام کی تاریخ کا بڑا واقعہ ہے۔
لیکن میلاد النبی یا اعلانِ نبوّت سے زیادہ اہم تو نہیں ہے۔
پھر اس کی یادگار میں یہ اس درجہ ہمہ گیری کیوں چلی آرہی ہے؟
کیا اس لئے کہ انسانی سماج صدیوں سے مظلوم چلا آرہا ہے۔
اور مظلوم کو مظلوم سے ہمدردی ہوتی ہے۔
مگر یہاں تو ظالموں کو بھی، میں دیکھتا ہوں کہ حسینؑ کی یادگار منانے میں آگے آگے ہیں۔

میں سوچتا ہوں کہ اس کا راز کھلا ہوا ہے۔
اس کا راز ہے وہ تام جھام، وہ میلہ اور جھمیلا جو محرم کے دنوں سے وابستہ ہو گیا ہے۔
مجلسیں۔ تبرک، نوحے، سوز، ماتم، جھولا، ذوالجناح، تابوت، تعزیہ، سبیلیں اور جشن

دنیا میں کئی مذہب ایسے آئے جنہوں نے رائج الوقت "مائی تھولوجی" (صنمیات) پر حملہ کیا۔
بدھ اور مہاویر سے لے کر محمد عربی تک۔
یہ تو سب اپنے زمانے کی بت پرستی اور اس کی افسانہ تراشیوں اور رسوم سے بے زار تھے۔

تھا ادیر تو اتنے بےزار تھے کہ انھوں نے خدا کے وجود سے ہی انکار کر دیا۔

لیکن انجام؟

انجام یہ کہ اب سب کے پاس بُت گری کی الگ الگ شکلیں موجود ہیں۔

اسلام نے بت گری اور اس کی افسانہ تراشی اور تمام جہام کا سخت مقابلہ کیا تھا۔

ایسا سخت مقابلہ کہ دشمن کے خیمے کی طنابیں تک کاٹ ڈالیں۔

غِنا، رقص، موسیقی اور مصوری سب حرام۔

لیکن انجام؟

انجام یہ کہ غِنا اور موسیقی نے سوز اور نوحے کی صورتیں نکال لیں۔

رقص نے ماتم کا روپ دھار لیا۔

مصوری نے تابوت، ذوی الجناح اور عَلَم پر کمالِ فن دکھا دیا۔

اور واقعۂ کربلا کی داستان مہابھارت کے افسانے سے زیادہ دلچسپ بن گئی،

اور اسلام نے اپنی "مائی تھولوجی" کا ایک باب اور کھولا۔

ستّر ہزار حوروں اور زمرد کے ستّر ہزار محلوں میں وہ کشش نہیں ہے جو یہاں ہے

سوا نیزے پر آفتاب اور بال سے باریک پل صراط میں وہ عبرت نہیں جو یہاں ہے

اب بےچارے بت کیا طعنہ دیں گے کہ اسلام بالکل "خشک" ہے۔

اسلام کے پاس تو بڑھتے بڑھتے "مائی تھولوجی" کا حیرت انگیز ذخیرہ پیدا ہو گیا ہے۔

جوشؔ نے کیا برا کیا جو یہ کہہ دیا ؎

جسے اربابِ مذہب بادۂ توحید کہتے ہیں وہ آبِ صاف بھی افسردۂ اصنام ہے ساقی

سچ پوچھو تو یہ عمارت اگر کھڑی ہے تو اس میں افسانۂ و رسوم و روایات کی اینٹیں چنی ہوئی ہیں۔
ورنہ آدمی سیدھے سادے عمل کی بےکیفی اور خبیدگی پر صدیاں کیسے گزار سکتا ہے۔ کچھ تو جاہیے جی بہلانے کی باتیں۔

(نومبر ۹۴ء)

ایسا لگتا ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو۔

صبح کا وقت ہے۔ موجوں سے کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ ہمارا اسٹیمر ساحل سے دور سمندر میں چلا جا رہا ہے اتوار کا دن ہے لوگ تفریح کے موڈ میں ہیں۔ سامنے دو چار میل پر جزیرہ نظر آ رہا ہے جہاں سارے مسافروں کو اترنا ہے۔

زیادہ تر مسافر اسٹیمر کے اس کنارے پر اکٹھے ہیں۔ پارسی لڑکیاں اپنے بھائیوں اور عاشقوں سے چہلیں کر رہی ہیں۔ کچھ لوگ ان کی خوش وقتی کو دیکھ رہے ہیں کچھ ہیں جو دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں۔"

میں اسٹیمر کے دوسرے گوشے میں چلا آیا۔ جہاں انجن سے کئی بڑے بڑے رسّے بندھے ہوئے ہیں اور موجوں سے کھیلتے چلے جا رہے ہیں۔

غلام احمد خاں آرزو کو فارسی کے بہت شعر یاد ہیں۔ انھوں نے بُش شرٹ کی جیبوں میں بے فکری سے ہاتھوں کے کفگیر ٹانگ دئے۔ اور کئی شعر اگلے۔

مجھے بے سبب وہ حافظ کی غزل یاد آئی۔

دل می رود ز دستم صاحب دلاں خدارا درداکہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

میں نے ساری وضعداریاں پرانے کوٹ کے ساتھ اتار کر ایک طرف ڈال دیں اور خوب چٹکیاں بجا بجا کر اور لہک لہک کر ایک ایک شعر اس غزل کا پڑھا۔ آس پاس کے کئی باذوق آدمی حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ سب جھومنے لگے۔

اتنے میں کسی نے کہا "چلو سب تیار ہو جاؤ۔ جہاز آگے نہیں جائے گا کشتیوں میں کنارے چلنا ہے۔"

میں نے کہا "یارو۔ جانا نہیں۔ دو شعر اور ہیں ابھی"

دوسرا شعر میں اٹھا ہی رہا تھا کہ کشتی آئی اور اسٹیمر کے گلے میں باہیں ڈال کر کھڑی ہو گئی۔ کئی خوش باش نوجوانوں نے اپنے اپنے دوستوں کو بازو کا سہارا دے کر اسٹیمر سے کشتی میں اتار دیا۔ اور خود لنگوٹ کس کر سمندر میں کود پڑے کہ کشتی سے پہلے تیر کر کنارے پر پہنچ جائیں اور وہاں اپنے رفیقوں کا انتظار کریں۔

"ہاں وہ شعر

کشتی شکستگانیم - اے بادِ شرطہ برخیز   اے بادِ شرطہ برخیز - اے بادِ شرطہ برخیز

کئی آوازوں نے میرا ساتھ دیا۔

ایک نوجوان جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی شاید اسی شعر کے انتظار میں رکا ہوا تھا۔ وہ پیراکی کے لباس میں مستعد کھڑا تھا۔ اس نے اُچک اُچک کر اس مصرعے کا مزا لیا۔ اور یک بارگی سمندر میں کود گیا۔ کنارے پر ہم سے پہلے پہنچنے کے لئے۔ اور لوگ بھی تیرتے ہوئے بڑھ رہے تھے کسی کو ادھر توجہ نہ ہوئی۔

ہم نے آخری شعر بلند کیا

کشتی شکستگانیم اے بادِ شرطہ برخیز   شاید کہ باز بینیم آں یارِ آشنا را

اے بادِ شرطہ برخیز

کشتی شکستگانیم

"دوڑو ---- دوڑو ---- ہائے وہ ڈوبا" کی آوازیں پشت سے ایک ساتھ بلند ہوئیں "لطیف ارے لطیف کو بچاؤ"

اسٹیمر آگے جا نہیں سکتا تھا۔ کشتی میں پہلے سے ہی نازک اندامانِ کالج لدے ہوئے تھے وہ بھی پچھڑ کر رہ گئی۔ کنارے سے لوگ چلائے۔ جہاز پر سے "یارانِ آشنا" نے صدائیں بلند کیں مگر کوئی اسے نہ پا سکا۔ وہ گرداب میں پھنس کر گم ہو گیا۔ کسی نے مجھ سے کہا "بعض بعض زبان بھی بڑی زہر ملی ہوتی ہے۔ اور بُری فال منہ سے نکالو"

میں دبی آواز سے سارے دن وہی شعر گنگناتا رہا۔

واپسی کے وقت شام کو ہم سب نے اس کی لاش دیکھی جو کنارے آ لگی تھی۔ مرنے والے کے کئی دوست اسے حیرت و غم کے ساتھ دیکھتے رہ گئے۔

شاید کہ باز بینیم آں یارِ آشنا را

سطح اور تہہ

سیپیاں اپنے بطن میں قطرے لے کر
سمندر کی تہہ میں چلی جاتی ہیں اور موتی اگلنے میں لگی رہتی ہیں۔
شیر اپنی خوراک کا حصہ دبوچ کر
گھنے کچھار میں چلے جاتے ہیں اور اسے ہضم کر لینے تک نہیں نکلتے
مردانِ خردمند اپنا اپنا مشن لے کر
عمل گاہوں میں، کتب خانوں میں، ٹریڈ یونینوں میں اور انجانے مقامات میں
کھو جاتے ہیں اور کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ عمل پیہم اور یقین محکم کے متوالے۔ انسانیت
کو ایک منزل آگے تک لے جانے کے لئے کتنی راتوں کو صبح کر چکے ہیں۔
کتنی چلچلاتی دوپہروں کو سردی کے کہرے میں بدل چکے ہیں۔
کتنے مصائب خود ان کے سر سے گذر گئے اور انھیں خبر نہ ہوئی۔

لیکن میرے بھائی، ذرا ان تنکوں کی دیدہ دلیری کو تو دیکھو
کہ سمندر کی موجوں کی سطح پر بہے چلے جاتے ہیں۔
ذرا اس بے مایہ جھاڑ جھنکاڑ کی تشہیر پسندی تو دیکھو
جو آندھی کے جھونکوں کے آگے اڑا پھرتا ہے
—— اور ان خوشنما چھلکوں کو دیکھو
جو خود تو مغز سے بے بہرہ ہیں مگر مغز پر چھائے رہتے ہیں۔

ہائے یہ صرف اسٹیج پر گرجنے والے۔

(۶، دسمبر ۱۹۵۱ء)

ماں کا دِل | دل اور عقل میں فرق کرنا

ابن آدم نے پہلی بار ماں کے دل سے سیکھا ہوگا
ماں کا دل محض دھڑکنے والا دل ہے۔

کوئی دل عقل کے اثر سے آزاد نہیں۔
عاشق جاں باز کا دل بھی
ایک بار سوچ بچار میں پڑ جاتا ہے۔
اگرچہ اس سے انکار بھی ضرور کرتا ہے۔
لیکن ماں کا دل
صرف ایک سادہ اور سچّا دل ہے۔
جو محبت کے سب سے پہلے خمیر سے تیّار ہوا ہے۔

ماں کا دل اتھاہ سمندر ہے۔
سمندر کے بھی کنارے ہوتے ہیں۔
مگر ممتا کے اس سمندر کا کوئی کنارہ نہیں۔

ماں کا دل محبّت کا خزینہ ہے۔
جہاں تمام محبتوں کی حدیں ختم ہوتی ہیں۔
وہاں سے ممتا کی سرحد شروع ہوتی ہے۔
بلکہ سچ پوچھو تو۔
وہ نہ کہیں سے شروع ہوتی ہے، نہ کہیں ختم ہوتی ہے۔

سورج کی طرح

ماں کا دل ہی اس نور کا سرچشمہ ہے۔

ماں کا دل ہی اس کی آخری بلندی ہے۔

اور ماں کا دل ہی اس کا آخری نشیب بھی ہے۔

(۲۹ جولائی ۱۹۴۸ء)

شئون علمیہ

جوہری گھڑی ریڈیو کاربن یعنی تابکار (ریڈیو ایکٹو) کاربن فطرت کی ایک ایسی گھڑی ہے جس سے زمانہ قبل تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔

پرانے درختوں کی باقیات میں، جلی ہوئی ہڈیوں میں اور ایسی ہی دوسری چیزوں میں اس کا وجود پایا جاتا ہے۔ اس سے اس سیارے پر انسانی اور نباتی زندگی کا وہ رخ سامنے آتا ہے جو ابھی تک تاریخ کے صفحات پر جلوہ گر نہیں ہوا ہے۔ لیکن یہ کاربن ماضی کی داستان صرف بیس ہزار برس ادھر کی بتا سکتا ہے اس سے زیادہ اس کی روشنی کام نہیں دیتی۔

تابکار کاربن کی تابکاری سے تاریخ کا پتہ لگانا اور عمر کا اندازہ کرنا ایک فن بن گیا ہے جس کی وجہ سے آثاریات (آرکیالوجی) میں انقلاب آگیا ہے۔

اس فن کی تکمیل میں کوئی پانچ برس لگے۔ اس کی بدولت گزشتہ ۲۰۰ صدیوں کے ارضیاتی (جیالوجیکل) واقعات کے بارے میں جو معلومات تھیں ان کی تصدیق یا تردید ممکن ہو سکتی ہے۔

جوہر کی مدد سے ماضی کا پتہ لگانے کے لئے تابکار شے کی کسی بڑی مقدار کی ضرورت نہیں ہے ایک قلیل سی مقدار درکار ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ساری دنیا میں خشکی، تری، ہوا اور جانداروں میں تابکار کاربن کی جملہ مقدار ۸۰ ٹن ہے۔

فضائے بعید سے کونی شعاعوں (کاسمک ریز) کی جو بارش ہوتی ہے اس سے کرہ ہوا کے بالائی طبقوں میں یہ "سرگرم" کاربن وجود میں آتا ہے اور پھر ہوا میں کاربن ڈائی اکسائڈ کا جز بن جاتا ہے۔ نباتات اپنی پتیوں کی بدولت اسے حاصل کر لیتے ہیں۔ حیوانات بہ شمول انسان ان نباتات کو کھاتے ہیں لہٰذا ان کو بھی یہ "دولت" میسر آ جاتی ہے۔ یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ جب تک نبات یا حیوان "بہ قید

حیات" رہتے ہیں ایک توازن قائم رہتا ہے۔ کیونکہ بدل ما تحلل ہوتا رہتا ہے۔ لیکن جب زندگی ختم ہوجاتی ہے تو "بدل" بھی ختم ہوجاتا ہے۔

ریڈیو کاربن کی جو مقدار ابتدا میں ہوتی ہے وہ اوسطاً ۵۵۶۸ برس میں نصف ختم ہوتی ہے پھر مزید ۵۵۶۸ برس اس کی نصف مقدار ختم ہوتی ہے اور اسی طرح۔ اس لئے جوہری سائنس داں اس عرصہ حیات کو معلوم کرسکتے ہیں جو اس ذی حیات کو ختم ہوئے گذرا ہے۔

اکثر جاندار اشیاء تو اتنی مدت میں بالکل خاک ہوجاتی ہیں۔ لیکن فطرت کبھی کبھی باقیات کو محفوظ رکھتی ہے خواہ درختوں کی شکل میں خواہ عملی ہڈیوں میں یا کسی اور طرح۔ ان بنیادوں پر ریڈیو کاربن کی مدد سے ہم ماضی کی داستان پڑھ سکتے ہیں۔

فضائیات آئندہ ۱۰ تا ۲۰ سال کے اندر زمین کے اطراف فضا میں ایسے اسٹیشن قائم کردیئے جائیں گے جہاں مشاہدین متعین ہوں گے جو دوربینوں کی مدد سے زمین پر جو کچھ ہوگا اس کا مشاہدہ کرسکیں گے۔

یہ اور اسی قسم کے محیر العقول کارناموں کو سائنس داں اب ممکنات میں سمجھتے ہیں۔ یہ سائنس داں ہیں جو حکومت امریکہ کے ۲۵ کروڑ پونڈ سالانہ والے تحقیقی ادارے میں کام کرتے ہیں جہاں راکٹ (بان) پر تحقیق کی جاتی ہے۔

اب ایسی پروازیں ممکن ہیں کہ زمین کو بہت پیچھے چھوڑ دیا جائے۔ ۵ بندروں اور ۲ چوہوں کو وی ۲ (V-2) قسم کے راکٹ میں ۸۰ میل اوپر اڑایا گیا۔ ان جانوروں کو خاص قسم کے ڈبوں میں رکھا گیا تھا اس تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان بھی سیاروں کے درمیان سفر کرسکتا ہے۔ چوہے جب واپس آئے تو ۲۰۰۰ میل فی گھنٹہ کے سفر سے واپسی پر ان کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ لیکن بندر مر گئے۔ وہ بھی سوء اتفاق سے۔ کیوں کہ چار ہوائی چھتریاں کھل نہ سکیں اور پانچواں بندر نگراں کاروں سے اتنی دور جا کر گرا کہ اس تک ان کے پہنچنے سے پہلے وہ ختم ہوچکا تھا۔

لیکن قابل لحاظ یہ امر ہے کہ پرواز نے کسی جانور کو نقصان نہیں پہنچایا۔ دوران پرواز جو ردعمل

ان کا مادہ قلمبند کر لیا گیا۔

راکٹ وہ استعمال کئے گئے جو جرمنی سے جنگ کے بعد حاصل ہوئے اس پر بھی پرواز پر ۳۰ ہزار پونڈ کا صرفہ آیا۔ اب تجربے اس پر ہو رہے ہیں کہ امریکی تجربہ کے تحقیقی آکاش بان (اسکائی راکٹ) نے ۵ ا میل کی پرواز کا جو ریکارڈ قائم کیا ہے اس سے آگے لے جانے کے لئے پردار راکٹ تیار کئے جائیں۔

پہلے یہ خیال تھا کہ آواز کی رفتار سے زیادہ رفتار کو انسان برداشت نہ کر سکے گا لیکن اب اس کو صحیح نہیں سمجھا جاتا۔

اصل دقت رفتار سے پیدا نہیں ہوتی اگرچہ وہ ۸۰۰۰ میل فی گھنٹہ تک پہنچ جاتی ہے بلکہ اصل پریشانی رفتار میں تبدیلی کے وقت ہوتی ہے۔ اس سے پرواز کرنے والے کو نقصان پہنچ سکتا ہے کیونکہ دباؤ بہت زبردست پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا انتظام کیا جا رہا ہے کہ اس دباؤ سے محفوظ رہا جائے۔

راکٹ انجینروں کا خیال ہے کہ ۸ ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار ضروری ہے تاکہ فضا میں ۰۰۰ ا میل کا سفر کیا جا سکے۔

اگر یہ بات حاصل ہو جائے تو پھر برطانوی بین نجمی انجمن کے صدر نشین کے قول کے بموجب یہ قدم اٹھایا جائے گا کہ راکٹ کی ایسی رہنمائی کی جائے کہ وہ اپنی اعظم بلندی تک پہنچنے پر ایسے منحنی پر آجائے جس کا انحنا زمین کے انحنا کا جواب ہو۔ اس وقت اس کی رفتار ۱۸ ہزار میل فی گھنٹہ ہو گی اور پھر اس کو مزید راکٹ طاقت درکار نہ ہو گی۔

اس بلندی پر ہوا میں مزاحمت نہ ہو گی۔ اس لئے راکٹ کا معیار حرکت (مومنٹم) اتنا ہو گا کہ زمین کی کمزور کشش کا اثر نہ رہے گا۔ پھر وہ راکٹ زمین کے گرد چکر لگاتار ہے گا۔

ایسے راکٹ کو کوئی چیز روک نہ سکے گی سوائے اس کے کہ کسی شہاب ثاقب سے اس کی ارست ٹکر ہو جائے۔ اس طرح حرکت دوامی کا خواب شرمندہ تعبیر ہو جائے گا۔

(ع)

ادبیات

"نہ جانے کیا ہو گر پیرِ مغاں تک بات جا پہنچی"

غزل

از

(جناب انور صابری)

نگاہ و دل سے گذری داستاں تک بات جا پہنچی ۔۔۔ مرے ہونٹوں سے نکلی اور کہاں تک بات جا پہنچی

بہے آنسو زمیں پر آسماں تک بات جا پہنچی ۔۔۔ کبھی ذروں سے لیکن کہکشاں تک بات جا پہنچی

ابھی ہے اختلافِ جام و مینا راز کی حد تک ۔۔۔ نجانے کیا ہو گر پیرِ مغاں تک بات جا پہنچی

رقیبوں نے یونہی دعویٰ کیا تھا جاں نثاری کا ۔۔۔ مگر میری بدولت امتحاں تک بات جا پہنچی

سمجھتے تھے رہے گی جنگ محدودِ گل و بلبل ۔۔۔ مگر تخریبِ نظمِ گلستاں تک بات جا پہنچی

چھڑا تھا بزم میں کل تذکرہ مژگان و ابرو کا ۔۔۔ بڑھی کچھ اس قدر تیغ و سناں تک بات جا پہنچی

مآلِ جرمِ تقسیمِ چمن کیا کم تھا رونے کو ۔۔۔ کہ اب فکر و ملالِ آشیاں تک بات جا پہنچی

چھپا رکھا تھا جس کو مدتوں سے دل میں اے انورؔ
ہزار افسوس وہ شرح و بیاں تک بات جا پہنچی

غزل

۳۰ نومبر کو سنٹرل کالج کلکتہ میں الحاج شیخ محمد جان صاحب کی صدارت میں ایک بزم مشاعرہ منعقد ہوئی۔ اور اتفاق حادثے کے طور پر برہان کے مدیر اعلیٰ اور کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل مولانا سعید احمد نے بھی اس کے لئے ایک عدد غزل فرمادی غزل مجلس مشاعرہ میں پڑھی گئی اور ارباب ذوق نے اس کی خوب خوب داد دی۔ مولانا سعید احمد جیسے بلند پایہ مصنف اور مشہور ترین اہل قلم کی شاعری جو بقول ان کے شاعری نہیں محض تفریح ہے، فنی اعتبار سے کسی بھی درجے میں رکھی جائے لیکن اس کے ادبی تبرک ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی، ایسا تبرک جس کو اوراق تاریخ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جانا چاہئے اور ہم اسی خیال سے اس غزل کو برہان میں شائع کر رہے ہیں، سنہ ۳۹ء کی بات ہو کہ مولانا نے نینی تال کے سبزہ زاروں میں گم ہو کر چند غزلیں موزوں کی ہیں جن میں سے بعض برہان میں شائع بھی ہو چکی ہیں، چودہ سال کے بعد آج ہم پھر یہ تحفہ پیش کر رہے ہیں (ع)

ہر چیز ہے اداس کسی پر جلا نہیں — شام و سحر نہیں ہیں وہ آب و ہوا نہیں

تاثیر کیا دکھائے فغانِ سحر تمہیں — آہیں ابھی ہیں خام تو نالے رسا نہیں

سودائے سر بجیر! نہیں کچھ زیاں کا ڈر — خوش باش بے خودی کہ کوئی مدعا نہیں

لایا ہے رنگ کیا کسی حسرت زدہ کا خون — رنگِ حنا جو ہاتھ پہ اب تک جما نہیں

آنسو ہی سے ہے لائقِ دامانِ لطفِ یار — آنکھوں میں جو جھلکتا ہے لیکن بہا نہیں

ہوتے ہو کیوں اداس مری داستاں سے تم — یہ داستانِ شوق ہے کوئی گلا نہیں

یارب امید و بیم کا کیوں کر ہو فیصلہ — ظاہر میں وہ خفا ہیں مگر یوں خفا نہیں

کھلتا کسی پہ کیسے محبت کا راز جب — کہنا جو تھا مجھے وہ کسی سے کہا نہیں

چاہے جہاں رکھوں مجھے واعظ ہو اختیار — اپنی جبین شوق . . . ترا واسطہ نہیں

احساسِ حسنِ تمکنت افزا کا ہو برا — گویا خدا انہیں کا ہے میرا خدا نہیں

کیا جبینِ ناز پہ ہے عرقِ انفعال
شاید سعید خاک بداماں رہا نہیں

تبصرے

تجدید تعلیم و تبلیغ از مولانا عبد الباری ندوی تقطیع خورد ضخامت ۲۹۲ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد تین روپیہ پتہ:۔ شبستان قدم رسول ہارڈنگ روڈ لکھنؤ،

مولانا عبد الباری ندوی نے حضرت مولانا تھانوی کے متعلق جو سلسلۂ کتب شائع کرنا شروع کیا ہے یہ کتاب اس کا تیسرا نمبر ہے۔ اس میں پہلے ایک مقدمہ ہے جس میں اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم کا مقصد اور اس کی غایت بیان کی ہے اور پھر مولانا تھانوی کے ارشادات وفرمودات کی روشنی میں اولاً تعلیم سے اور پھر تبلیغ سے متعلق تمام اصلی اور ضمنی مباحث ومسائل پر گفتگو کی گئی ہے اور تعلیم وتبلیغ کے قدیم وجدید اداروں کا ذکر کرکے ان کے طریق اور اصول کار پر تنقید کرکے ان کے عیوب ونقائص پر روشنی ڈالی گئی ہے اس میں شبہ نہیں کہ ان مباحث میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بڑی حد تک دینی نقطۂ نظر سے بصیرت افروز ہے اور غور وفکر کے لائق ہے لیکن اور چند جزئی اور ضمنی باتوں کے علاوہ انگریزی تعلیم اور مغربی علوم وفنون کی تحصیل کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ بہت زیادہ محل نظر ہے چند یا زیادہ جزئیات کو دیکھ کر ایک قاعدہ کلیہ بنا لینا منطق کے کسی قاعدہ کے مطابق بھی درست نہیں ہے اسی انگریزی تعلیم اور انھیں یونیورسٹیوں اور کالجوں سے جہاں ایسے لوگ پیدا ہوئے جو ملحد و زندیق تھے تو دوسری طرف ایسے لوگ بھی بکثرت پیدا ہوتے جو عقیدہ وعمل کے اعتبار سے پکے اور سچے مسلمان تھے اور جنہوں نے اسلام کی علمی وعملی خدمات انجام دی ہیں اس کے برعکس عربی مدارس میں پڑھے ہوئے بعض لوگ ایسے ملیں گے جن کے نہ عقائد درست ہیں اور نہ اعمال واخلاق صحیح۔ بس جب صورت حال یہ ہے تو آپ بہ طور قاعدہ کلیہ کے یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ انگریزی تعلیم کا لازمی اثر یہ ہے کہ "نماز روزہ میں کاہلی بلکہ اعراض۔ وہی عقاید میں ضعف وتشویش۔ وہی اخلاق میں تکبر وتصنع۔ وہی کفار کی تقلید کا

ذوق وشوق وغیرہ اوصاف پیدا ہوجاتے ہیں (ص ۹۴ ۱) علاوہ بریں سوچنے کی بات یہ ہے کہ مغربی علوم وفنون جن سے فطرت انسانی اسرار زندگی اور کائنات عالم کے حقائق کا انکشاف ہوتا ہے اور جن کو معلوم کرنے کی ترغیب خود قرآن دیتا ہے کیونکہ یہ فطرت کے رازہائے سربستہ جس قدر زیادہ منکشف ہوں گے اسی قدر ایک طبع سلیم کو خدا کے وجود اور اس کی قدرت کاملہ کا یقین زیادہ ہوگا ان کا بے شمار ذخیرہ انگریزی میں موجود ہے یا نہیں پھر ایک مسلمان قوم کو سائنٹفک مضامین کی تعلیم حاصل کر کے اپنی صنعت وحرفت۔ تجارت وزراعت اور ملکی رفاہیت کو ترقی دینے کی ضرورت ہے یا نہیں ؟ علاوہ بریں انگریزی زبان میں آج خود اسلامی علوم وفنون سے متعلق بیش بہا تحقیقات وانکشافات کا جو ذخیرہ موجود ہے مسلمانوں کو اس سے واقف ہونا چاہیے یا نہیں ! پھر اس سب سے زیادہ یہ کہ اگر مسلمان انگریزی تعلیم حاصل نہ کرتے تو آج اس ملک میں ان کی حیثیت کیا اچھوتوں سے زیادہ ہوسکتی تھی ؟ ان سوالات کی روشنی میں غور کرنے کے قابل یہ بات ہے کہ ان علمی تمدنی وسیاسی اور بلکہ دینی ومذہبی اہم ضرورتوں کے پیش نظر مسلمانوں کے لئے انگریزی زبان اور مغربی علوم وفنون کا حاصل کرنا ضروری اور لازمی تھا اور ہے تو اب اگر مولانا تھانوی کو یونیورسٹیوں اور کالجوں کے ماحول اور ان کے طریقہائے تعلیم وتربیت سے مفاسد کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا تو ان کا فرض تھا کہ وہ مسلمانوں کے لئے انگریزی تعلیم کا بندوبست اپنی صوابدید کے مطابق کرتے، اگر ہوائی جہازوں کے حوادث آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ ریلیں ٹکرا جاتی یا پٹری سے اتر جاتی ہیں یا کشتیاں دریا میں غرق ہوجاتی ہیں تو ان کو دیکھ کر سرے سے ریل۔ ہوائی جہاز اور کشتی کا سفر ہی ترک کردینا اور دوسروں کو بھی اس کا مشورہ دینا یہ وہ فراریت۔ پست ہمتی۔ اور تنگ دلی وتنگ نظری ہے جس کو اسلام الیادین کامل ایک لمحہ کے لئے برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ نقطۂ نظر سراسر راہبانہ اور جوگیانہ ہے اور اسلام مسلمانوں کو میدان کارزار حیات کا بہادر سپاہی بنانا چاہتا ہے۔ نہ کہ ان سب ہنگاموں سے الگ بڈھوں۔ اپاہجوں اور ناکارہ لوگوں کی طرح ایک گوشہ میں بیٹھ کر بقیہ ایام حیات کی تسبیح کے دانوں کو گنتے رہنے والا۔

مولانا عبدالباری ندوی سے اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ حضرت آپ کو یونیورسٹیوں کی کفر

انگریزی اور انگریزی تعلیم کی الحاد پروری کا تجربہ یونیورسٹی کی ملازمت سے پنشن لینے کے بعد ہی ہوا پہلے نہ ہوا تو معلوم نہیں مولانا اس کا جواب کیا دیں گے۔ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ۔ بہرحال مجموعی حیثیت سے کتاب مفید اور لائق مطالعہ ہے۔

قادیانی مذہب و مقدمہ قادیانی مذہب از جناب الیاس برنی کتابت و طباعت بہتر ناشر شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور۔ ہندوستان میں ملنے کا پتہ:۔ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی۔

پروفیسر الیاس برنی کی مشہور و معروف اور نہایت مقبول کتاب قادیانی مذہب جس نے قادیانی تحریک پر ایک ایسی ضرب کاری لگائی ہے جس سے اس کا پنپنا مشکل ہے اس کا پانچواں اڈیشن بارہ سو صفحات پر شائع ہوا تھا نظر ثانی اور بہت کچھ اضافوں کے ساتھ اب اس کتاب کا چھٹا اڈیشن شائع ہوا ہے جو بڑی تقطیع کے ساڑھے نو سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور چونکہ اس کا مقدمہ طویل ہوتے ہوتے خود ایک مستقل تصنیف ہو گیا تھا اس بناء پر اس کو الگ شائع کیا گیا ہے جو چھوٹی تقطیع کے پونے تین سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اب اس مقدمہ کی حیثیت متن کی اور اصل کتاب کی حیثیت تفصیل و شرح کی بن گئی ہے اور بعض اعتبارات سے یہ دونوں الگ الگ دو مستقل تصنیفات بھی ہیں جن کی افادیت بجائے خود اور مستقل ہے امید ہے کہ یہ دونوں کتابیں بھی حسب سابق مقبول و پذیرا ہوں گی اور فاضل مصنف کو ان کی خالصۃً لوجہ اللہ غیر معمولی کاوش و جگر سوزی کا صلہ ملے گا اصل کتاب قادیانی مذہب کی قیمت آٹھ روپیہ اور مقدمہ کی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے۔

فروزاں از جناب جذبی تقطیع کلاں۔ طباعت و کتابت نہایت بہتر اور دیدہ زیب۔ ضخامت ۱۳۵ صفحات قیمت مجلد مع خوبصورت گرد پوش کے تین روپیے پتہ:۔ آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی۔

جناب جذبی اردو کے مشہور نوجوان شاعر ہیں جن کے کلام میں حسن شعر کے فطری اصول کی رعایت کے ساتھ شعر و ادب کے جدید تقاضوں کی ترجمانی بھی پائی جاتی ہے گویا ان کا کلام نغمۂ بزم بھی ہے اور طبل جنگ بھی اس میں درد اور سوز و گداز بھی ہے اور خودداری جرأت اور انقلاب آفرینی بھی ان کو غزل و نظم دونوں پر یکساں قدرت ہے اور اگرچہ وہ پرگو نہیں ہیں لیکن ان کو چند شعروں میں ہی اپنا مطلب بخوبی ظاہر کر دینے کا بہت اچھا سلیقہ ہے موصوف نے

قصص القرآن جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰؑ
اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور
متعلقہ واقعات کا بیان۔ دوسرا ایڈیشن جس میں
ختم نبوت کے اہم اور ضروری باب کا اضافہ کیا گیا ہے۔
قیمت چھ روپے آٹھ آنے ۶؍ مجلد سات روپے آٹھ آنے ۷؍

اسلام کا اقتصادی نظام وقت کی اہم ترین
کتاب جس میں اسلام کے نظام اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش
کیا گیا ہے۔ چوتھا ایڈیشن۔ قیمت ۶؍ مجلد ۷؍

اسلام کا نظام مساجد۔ قیمت ۴؍ مجلد للعہ

مسلمانوں کا عروج و زوال:۔
جدید ایڈیشن۔ قیمت للعہ مجلد صہ

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ
لغت قرآن پر بے مثل کتاب۔ جلد اول۔ طبع دوم
قیمت للعہ مجلد صہ
جلد ثانی قیمت للعہ مجلد صہ
جلد ثالث قیمت للعہ مجلد صہ
جلد رابع (زیر طبع)

مسلمانوں کا نظم مملکت مصر کے مشہور مصنف
ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن کی محققانہ کتاب النظم الاسلامیہ
کا ترجمہ۔ قیمت للعہ مجلد صہ

ہندوستان میں مسلمانوں کا
نظام تعلیم و تربیت
جلد اول:۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب
قیمت چار روپے للعہ مجلد پانچ روپے صہ
جلد ثانی:۔ قیمت چار روپے للعہ مجلد پانچ روپے صہ

قرآن اور تصوف حقیقی اسلامی تصوف پر
محققانہ کتاب۔ قیمت ۶؍ مجلد ۷؍

ترجمان السنہ جلد اول۔ ارشادات نبوی کا
بے مثل ذخیرہ۔ قیمت ۸؍ مجلد ۱۰؍

ترجمان السنہ جلد دوم۔ اس جلد میں چھ سو کے
قریب حدیثیں آگئی ہیں۔ قیمت للعہ مجلد ۱۱؍

تحفۃ النظار یعنی خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ
مع تنقید و تحقیق از مترجم و نقشہائے سفر قیمت ۲؍

قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات
قرون وسطیٰ کے حکمائے اسلام کے شاندار علمی کارنامے
جلد اول۔ قیمت ۳؍ مجلد ۴؍
جلد دوم قیمت ۴؍ مجلد ۵؍

عرب اور اسلام:۔
قیمت تین روپے آٹھ آنے ۳؍ مجلد چار روپے آٹھ آنے للعہ

وحی الٰہی
مسئلہ وحی اور اس کے تمام گوشوں کے بیان پر پہلی
محققانہ کتاب جس میں اس مسئلہ پر ایسے دل پذیر
انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اس کی صداقت
کا ایمان افروز نقشہ آنکھوں کو روشن کرتا ہوا دل کی
گہرائیوں میں سما جاتا ہے۔
جدید ایڈیشن۔ قیمت ۳؍ مجلد چار روپے

منیجر ندوۃ المصنفین۔ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۔ ۶

REGISTERED NO. D. 183

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ محسن خاص جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپیہ یکشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہٴ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ محسنین جو حضرات پچیس روپئے مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے۔ نیز مکتبہٴ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" بلا کسی معاوضہ کے پیش کیا جاتا رہیگا۔

۳۔ معاونین:۔ جو حضرات اٹھارہ روپئے پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقہ معاونین میں ہوگا انکی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپئے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

۴۔ احبا: نو روپئے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احبا میں ہوگا۔ ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات نصف قیمت پر دیجائیں گی یہ حلقہ خاص طور پر علما اور طلبہ کے لئے ہے۔

قواعد رسالہ برُہان

(۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) مذہبی علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲ر آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہیے۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپئے۔ دوسرے ملکوں سے ساڑھے سات روپئے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس پرنٹر پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا